رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فیضی آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں۔ بی، اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۳

بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء

تصویر: - چارلس ڈارون

ناکامیاں

زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو!

وہ زندگی کامیاب نہیں جو نری کامرانی ہو، وہ خوشی خوش نہیں کرسکتی جو دردوالم کی قیمت دے کر حاصل نہ کی گئی ہو! دن کی جلوہ گری رات کی پردہ پوشی سے ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں کو وادیوں کی افتادگی بلند کیئے ہوتے ہے، حسن زشت نمائی کا پروردہ ہے، دید کا لطف غم فراق کا دست نگر ہے اور زندگی کی فتح اُس کی شکستوں سے ہے۔

وہ عیش وعشرت بے لذت ہے جسے کبھی دنیا کی مصیبتوں سے واسطہ نہیں پڑا، وہ آرام غم انجام ہے جس کا کوئی انجام نظر نہ آئے، وہ سکون روح کی موت ہے جس میں بے تابی آکر اپنا خون نہ دوڑا دے!

وہ جو خدا سے ابدی راحت کے طلب گار ہیں وہ خدا کو ایک فارغ حکمران ایک غرق عشرت ہستی تصور کیئے ہوئے ہیں وہ ایک ایسی جنت کے تمنائی ہیں جس میں دیکھنے کے لیئے آنکھ، سننے کے لیئے کان اور کھانے کے لیئے منہ تک بھی کھولنا نہ پڑے! جب تک زندگی زندگی ہے اس میں برکت حرکت ہی سے ہے کہ کامل سکون روح کے لیئے عین موت ہے!

جو کہتے ہیں کہ اس دنیا میں برائی کیوں ہے کمی کیوں ہے رکاوٹ کیوں ہے وہ فی الحقیقت نیکی اور فراوانی اور آزادی کے قدر دان نہیں، وہ ان موتیوں کے لیئے ان کی پوری قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے وہ دوست کے تبسم کے لیئے دل میں آرزو کی کسک کو بھی اک مصیبت جانتے ہیں!

جس قدر ایک عطیہ شاندار ہوگا اُسی قدر کٹھن وہ کوششیں ہونگی جو اس کے حصول کے لیئے درکار ہیں۔ زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو کہ وہ محض تمہاری سعی وقوت کی امید میں سرنگوں ہیں!

باغبان

جہاں نما

دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ

پچھلے مہینے دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی۔ یہ پارلیمنٹ گزشتہ دس صدیوں سے جزیرۂ آیس لینڈ کے دارالحکومت میں اپنے اجلاس منعقد کرتی اور اپنے مندوبین کے ذریعہ سے امورِ سلطنت انجام دیتی آئی ہے، اور اُن قدیم ایام سے لے کر آج سے چند سال پہلے تک اس کے اجلاس کھلے میدان میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ اس کی ابتدا اُس زمانہ میں ہوئی جب ہیرلڈ فیرہیر شاہِ ناروے کے مظالم سے تنگ آکر وہاں کے رؤسا کا ایک گروہ ترکِ وطن کرکے آیس لینڈ میں آن بسا تھا۔ ان دنوں سے لے کر آج تک جمہور کے مندوب منتخب ہوکر اس مجلس میں آتے ہیں اور قوانین وضع کرنے کے علاوہ ضروری مقدمات کے فیصلے کرتے اور قومی مسائل پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔

عالمگیر رسم الخط کی عالمگیر تحریک

کچھ دنوں سے ہندوستان میں بھی عالمگیر رسم الخط کی ترویج کا مسئلہ جاذبِ توجہ ہو رہا ہے۔ حال میں ڈاکٹر الماللطیفی، آئی سی ایس، نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستانی زبانوں کے لئے انگریزی یعنی لاطینی رسم الخط استعمال کیا جائے تاکہ اس طرح ملک بھر میں ایک یکسانیت پیدا ہو جائے اور اردو ہندی وغیرہ کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ مزید براں چند وہ نقائص بھی گناتے ہیں جو مروجہ رسوم خط میں پائے جاتے ہیں۔

اس تجویز کو ہندوستان میں بہت سی وجوہ کی بنا پر ناقابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔ اور اب انگلستان سے بھی یہی آواز بلند ہوئی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے نظریہ کی تائید میں ایک علمی مجلس کے سامنے ایک مضمون پڑھا تو اس کے بعد ایک عام مباحثہ منعقد ہوا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے سر ڈینین راس نے کہا کہ "لاطینی رسم الخط دنیا کے بدترین رسم الخطوں میں سے ہے۔ اس کے برعکس دو رسم الخط اکمل اور بے عیب ہیں، ایک عربی اور دوسرا روسی۔ اگر آپ ہندوستانی زبانوں میں آسانی پیدا کرنی چاہتے ہیں تو رسم الخط کی اصلاح سے شروع کیجیے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کے لئے ناگری حروف کا رواج ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے پاس بہترین رسم الخط موجود ہے۔ لیکن اگر وہ پسند کریں تو وہ دوسری زبان کے طور پر ناگری سیکھ سکتے ہیں تاکہ باقی ہندوستان سے نامہ و پیام کر سکیں، لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تمام ہندوستان میں ایک مصنوعی انگریزی رسم الخط کو رواج دیا جائے۔

مسئلۂ حیاتِ نباتات

نباتات کی زندگی کے متعلق سر جے سی بوس نے جو اہم انکشافات کئے ہیں اگرچہ وہ بہت سی ممتاز علمی مجالس کے سامنے ثابت کئے جا چکے ہیں اور اب عام طور پر دنیائے سائنس میں قبول کر لئے گئے ہیں، لیکن کئی دفعہ ان کے خلاف انفرادی طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکا کے ایک حکیم نے اُن کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

ڈاکٹر پرسن رسالہ "سائنٹیفک امیریکن" میں لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے دارالتجربہ میں سر جگدیش کے تجربات کو دہرایا لیکن مجھے کامل طور پر ناکامی ہوئی؛ اور میں اُن نتائج میں سے ایک بھی حاصل نہ کر سکا جن کا ذکر سر بوس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سر جگدیش کو اپنی زیرِ عمل نباتات میں حرکتِ قلب اس لئے محسوس ہوئی کہ وہ خود اسے محسوس کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سر جگدیش کی تحقیقات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تجربے اس تیقن سے شروع کئے کہ ہمیں پودوں کی حرکتِ نبض کا احساس اور اُن تغیرات کا ادراک ہوگا جو مختلف ادویہ کے داخل کرنے سے اس حرکت میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن باوجود انتہائی کوشش اور احتیاط کے ہم اس قسم کی کیفیت محسوس نہیں کر سکے۔ ہم نے بار بار یہ تجارب کئے اور اُن آلات سے بدرجہا ذکی تر آلات استعمال کئے جن کا ذکر سر جگدیش اپنی کتاب میں کرتے ہیں لیکن کچھ بھی معرضِ ظہور میں نہ آیا۔ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی تحقیقات سے پبلک کو آگاہ کر دیا جائے۔

درحقیقت سر جگدیش زندگی کی وحدانیت پر نہایت پختہ اعتقاد رکھتے ہیں؛ اور یہ اعتقاد ہندو فلسفہ کی بنیاد ہے۔ ممکن ہے کہ اسی اعتقاد نے اُن کی علمی تحقیقات پر ضرورت سے زیادہ اثر کیا ہو۔

چائے بنانے کے عجیب و غریب طریقے

روسی طریقے سے چائے بنانے کا اب پھر رواج ہو رہا ہے اور حقیقت میں اس سے زیادہ فرحت دینے والی اور کیا چیز ہوسکتی ہے کہ سادہ اور صاف چائے کی ایک پیالی ہو اور اس میں لیموں کی ایک قاش تیر رہی ہو۔ اس میں شکر حسب پسند ملائی جاتی ہے اور یہ عموماً مصری کی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سگمنڈ نے اپنے سیاحت روس کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا کہ میں نے اپنی عمر میں بہترین چائے ایک کاسک کے ہاں سے پی تھی جس نے ایک تیلی میں پانی اور چائے ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیا اور جب وہ ابلنے لگی تو اس نے کہا کہ چائے تیار ہے اس میں کوئی اور چیز نہیں ملائی گئی مگر اس قسم کی چائے پہلے ہی سے یاسمین یا دوسرے خوشبودار پھولوں میں بسائی جاتی ہے۔ سیامی چائے کا خسا ندہ تیار کر لیتے ہیں اور مصری کی ایک ڈلی منہ میں رکھ کر پینا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر چینی جو چائے کے صرف اس سے ذرا زیادہ خوشبودار پر دوں کی مہک حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں چائے کے چند پتوں پر گرم پانی انڈیل کر جلد ہی پیالیوں میں ڈال لیتے ہیں۔

لیکن تبت کے لوگ عجیب طریقے کی چائے پیتے ہیں۔ وہ پہلے چند گھنٹوں تک چائے کو ایک برتن میں ابالتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کا رنگ گہرا سیاہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو چائے پانچ پانچ دن تک آگ پر چڑھی رہتی ہے۔ پھر اس میں سے تھوڑا سا سیاہ رس لے کر اس میں تازہ گرم پانی ملاتے ہیں اور شکر کی بجائے اس میں تھوڑا سا سوڈا اور مکھن کی ایک گولی ڈال لیتے ہیں۔ چائے میں ڈالنے کا مکھن عجیب طریقے سے تیار ہوتا ہے اس کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں انتہا درجہ کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ جن گڑھوں میں لائی لاما کے لئے مکھن تیار ہوتا ہے اُن میں پچاس پچاس سال کا بلکہ اس سے بھی پرانا مکھن موجود رہتا ہے۔ چنانچہ جس چائے میں یہ مکھن ملایا جاتا ہے اس کی "مہک" صرف تصور میں آسکتی ہے بیان سے باہر ہے۔

چائے بنانے کے یہ طریقے مغربیوں کو کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہونگے لیکن خود ان کے ہاں اس سے بھی انوکھے طریقے رائج ہیں۔ مثلاً وکٹر ہیوگو نے چائے میں تھوڑی سی رم ڈال لینے کا فیشن نکالا اور لارڈ ولٹن ہمیشہ چائے میں ٹھنڈے پانی کی ایک پیالی ملا کر یکدم چڑھا جایا کرتے تھے۔

ہیزلٹ اپنی چائے ہمیشہ نہایت احتیاط سے تیار کیا کرتا تھا۔ پہلے وہ اپنی چائے دانی کو نہایت قیمتی سیاہ چائے سے آدھی کے قریب بھر لیتا تھا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی ڈالتا تھا اور فوراً پیالی میں الٹ کر اور بہت سی شکر اور بالائی ڈال کر پی جاتا تھا۔

بہترین ورزش

ڈاکٹر لیسٹر ہنکس لکھتے ہیں "میرے خیال میں گانا بہترین صحت افزا ورزش ہے۔ باوجود تلاش کے، بارہ پندرہ سال کے عرصہ میں میں نے ایک بھی پیشہ ور گانے والا ایسا نہیں دیکھا جس کی صحت عام آدمیوں سے بہت اچھی نہ ہو۔

دوسرے، جو لوگ کم سے کم چھ ماہ تک گانے کی مشق جاری رکھتے ہیں، اُن کی صحت بہت اچھی ہوجاتی ہے۔ میں نے خود بھی اس کا تجربہ کیا ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری صحت کبھی ایسی اچھی نہیں ہوئی جیسی تین چار ہفتے کے متواتر گانے سے ہوئی ہے۔

گانے سے طبعی اور نفسیاتی، دونوں قسم کا عمل ہوتا ہے۔ تفریح کو مشقت پر جو فوقیت حاصل ہے وہی گانے کو تمام دوسری ورزشوں پر ہے۔ موسیقی خوشی کی علامت ہے۔ تندرست اور خوش آدمی گاتا ہے سیٹی بجاتا ہے یا کسی اور طرح سے موسیقی پیدا کرتا ہے، اس کلیہ کو مانتے ہوئے کہ دل جسم پر اثر انداز ہوتا ہے کوئی شخص تردید نہیں کرسکتا کہ مسرت صحت کو بڑھاتی ہے۔

ہزاروں آدمی نہایت تن دہی سے تنفس کی ورزش کرتے ہیں لیکن کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ناکامی کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ اسے بے دلی سے انجام دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسے بطور تفریح کے نہیں بلکہ بطور ایک پُرمشقت کام کے کرتے ہیں تنفس کے عمل سے گانے والے کے پردۂ شکم کو خاص طور پر قوت حاصل ہوتی اور یہ وہ عضو ہے جس پر صحت کا بیشتر انحصار ہے علاوہ ازیں وہ رغبت سے اسے انجام دیتا ہے۔

چھاتی کا زیادہ سے زیادہ ناپ صحت اور طاقت کی دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا کیونکہ ناپ کی زیادتی بیرونی مٹاپے پر بھی منحصر ہے۔ گانے والے مردوں کی چھاتی عام طور پر چالیس انچ ہوتی ہے۔ اور یہ بہترین صحت و قوت پر دلالت کرتی ہے، لیکن دوسری طرف اگر ایک پہلوان کی چھاتی اسی قدر ہو تو اس کا تپ دِق سے مرجانا تعجب خیز نہیں دونوں میں فرق یہ ہے کہ گانے والے کی چھاتی اندر سے پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے پھیپھڑوں کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور پہلوان کے ناپ کو اُس کی پیٹھ، چھاتی، سینہ اور بغل کے بیرونی اعصاب بڑھائے رکھتے ہیں ان اعصاب کی موجودگی میں پہلوان اپنی چھاتی کو دس سے بیس انچ تک پھلا سکتا ہے لیکن گانے والا صرف چار یا پانچ انچ۔

لیکن پھیپھڑوں کی پوری پوری وسعت اُس زیادہ سے زیادہ ہوا کے حجم سے معلوم ہوتی ہے جو ان میں سماتی ہے۔ سینڈو اپنی چھاتی کو اٹھارہ یا بیس انچ تک اُبھار سکتا تھا لیکن اس کے پھیپھڑوں کی وسعت صرف ۲۶۰ مکعب انچ تھی جو ایک معمولی آدمی سے بڑھ کر نہ تھی۔ میرے پھیپھڑوں کی وسعت ۳۵۰ مکعب انچ ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض گانے والوں کے پھیپھڑوں کی وسعت چار سو مکعب انچ ہوگی۔

مشرقی لٹریچر مغرب میں کیونکر پہنچا

(سرڈینی سن راس کے ایک مضمون کا ترجمہ)

اس امر کا تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ پندرھویں صدی میں یورپ کا ایک تعلیم یافتہ اور خواندہ آدمی ایشیا کی کیا خیالی تصویر قائم کئے ہوئے ہوگا، اور چین و ہند کے متعلق اس کا مبلغ علم کیا ہوگا۔ ایشیائی جغرافیہ کے متعلق تو اس کے نظریے محض تخمیناً درست ہونگے مگر ایشیائی ممالک کے لوگوں کے متعلق اس کی واقفیت سرے سے صفر ہوگی، اُسے ہندومت اور بدھ مت کا کوئی علم نہیں ہوگا اور اُس نے کنفیوشس یا رامائن کا نام تک نہیں سنا ہوگا، چنانچہ مشرق کے متعلق جو عدمِ واقفیت یورپ پر مسلط تھی اُس کی تائید میں واقعۂ ذیل کا ذکر کیا جاسکتا ہے:۔ جب پرتگیز راس امید کا چکر کاٹ کر ۱۴۹۸ء میں سرزمینِ ہند میں اترے تو اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں واحد غیر عیسائی مذہب صرف اسلام ہے، چنانچہ اپنے ورود پر وہ ایک ہندو معبد میں داخل ہوگئے، اور اپنے مع الخیر پہنچنے پر خدائے برتر کا شکریہ اس خیال کے ماتحت ادا کیا کہ وہ ایک عیسائی گرجا میں ہیں جس کے پادری بظاہر راہِ رشد سے کسی حد تک منحرف ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی اسلام سے واقفیت بالکل طبعی تھی بالخصوص اس لئے کہ سرزمینِ سپین سے آخری مور صرف دس سال پیشتر دیس بدر ہوئے تھے۔ مگر مشرق سے وہ کلیتہً ناآشنا تھے۔ اس کے باوجود مشرق اس وقت سے کہیں پیشتر اپنے افسانوں کا انمول تحفہ مغرب کی نذر کرچکا تھا، جو ہندوستان سے دو بڑی بڑی قسطوں میں وارد ہوئے، ایک تو وہ جو لقمان نے سنہ عیسوی سے پیشتر مرتب کئے، اور دوسرے وہ جو تراجم کی وساطت سے، ازمنۂ وسطیٰ میں عربی سے عبرانی، یونانی، اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ مگر ان زبان زد افسانوں کے ہندی الاصل ہونے کا احساس اُس وقت کیا گیا جب کہ لافان ٹین نے ۱۶۷۸ء کے ایڈیشن میں اس امر کی وضاحت کی کہ اس کی جدید نظموں کی اکثریت بیدپائے ہندی افسانوں پر مبنی ہے۔

تاہم جب ہم مغربی لٹریچر پر مشرق کے تحقیقی اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی دوسری ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو یہودی کتبِ مقدسہ کے اثرات کے مقابلہ پر آسکے، جو زبان و معانی میں بالکل مشرقی ہیں۔ یورپ میں بائیبل سب چیزوں سے بڑھ کر پڑھی جاتی ہے، اور یہ ایک خاص بات ہے کہ انگریزوں کے ہاں کوئی اپنے اساطیر نہیں، کوئی ایسی شے نہیں جو انہیں اوثان و اصنام کی جانب منسوب کرے۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ شاہ آرتھر اور اس کی گول میز کا افسانہ ہے

جس میں یقیناً فوق العادۃ امور داخل ہوگئے ہیں۔ مگر دوسرے شمالی لوگوں مثلاً اہلِ سکنڈے نیویا اور اہلِ جرمنی کے اپنے
باضابطہ اور خصوصی اساطیر ہیں جیسا کہ ان سے بیشتر یونانیوں اور رومنوں کے ہاں موجود تھے۔ ان اساطیر کی نمائش
پہاڑیوں، وادیوں، اور دریاؤں پر ہوتی ہے جن سے کہ یہ لوگ مانوس ہیں، لیکن حکایات جن پر انگریز بچوں کی تربیت
ہوتی ہے تو وہ عہدنامۂ قدیم کی کہانیاں ہیں جن کا تعلق محض تمدنی اور اقلیمی حالات سے ہے اور جو اُن حالات سے
بالکل مختلف ہیں جن سے کہ انگریز اپنے ملک میں مانوس ہیں۔ چنانچہ ہر حکایت کی تشریح بطور واقعۂ دخیل کے کرنی پڑتی ہے،
اور ایسے لوگوں کی تصاویر دکھانی پڑتی ہیں جو غیر مانوس مشرقی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر محض فطرتی ہے کہ بائیبل
نے ان جزائر کی زبان اور لٹریچر کی تشکیل میں خاص طور پر بڑا کام کیا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرق نے مغرب پر اپنے ادب و فنون کا اظہار نہایت تحمل سے کیا، اور یہ بات نہایت تعجب انگیز
ہے کہ ایشیائے مشرقی کی صدہا سالہ تجارت مشرقی تثقیف و تہذیب کا کوئی حصہ اپنے ہمراہ نہیں لائی، اور نہ ہی مشرق و
مغرب کے شخصی اختلاط میں خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا کاروباری، کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس نے مہذب دنیا کے
ان دو نصفوں میں کوئی باہمی تشخص پیدا کیا ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے چین اپنا ریشم تجارتی راہوں سے ایران میں بھیجتا رہا
جہاں سے پھر وہی ریشم یورپ میں جاتا، مگر یورپ کو چین کے متعلق تیرھویں صدی کے وسط تک عملی طور پر کوئی علم نہیں
تھا، سوائے اس کے کہ چین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے ریشم آتا ہے۔

ساتویں صدی میں فتحمند عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اس حملہ کا نتیجہ ایک حیرت انگیز کیفیت تھی جس کی رو سے
یورپ کے اکثر لوگ اسلامی حکومت کے تحت میں آگئے، یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے مشرق و مغرب کے عام مفہوم کے ضمن
میں، اور موجودہ سیاسیاتِ یورپ پر ترکی کے اثرات کی ذیل میں، ہم بیشتر فراموش کر دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ ۶۶۸ء میں واقع ہوا یعنی حضرت محمد کی ہجرت مکہ کے صرف چھیالیس سال بعد۔ آٹھویں
صدی کے وسط سے پیشتر عربوں نے تمام کا تمام سپین اور پرتگال فتح کر لیا، اور یہ صرف چارلس مارٹل کی ذات تھی جس
نے اُن کی پیش قدمی کا سلسلہ ٹورز اور پاٹیرز کے مابین روک دیا۔ سرزمین یورپ میں عربوں کی موجودگی کی اہمیت جو
اپنی مادی اور دماغی طاقتوں کے کمال پر پہنچے ہوئے تھے، ہم ایسے وقت میں قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ یونان و روما
کی تہذیب قریب قریب کالعدم ہو چکی تھی، اور جنوبی یورپ میں اُن کی جگہ نئی اقوام لے رہی تھیں۔ پانچویں صدی کے
خاتمہ سے پیشتر روما کی سات پہاڑیوں پر قائم شدہ سلطنت کی مستحکم تعمیر آخر کار مغربی یورپ کے گوشہ گوشہ میں شمال کی غیر مہذب
اقوام کے ہاتھوں منہدم ہو چکی تھی، جن کی غیر معمولی طاقت اور ان گنت تعداد کا مقابلہ محض محال تھا۔ مذکورہ حملہ آور اپنے

ہمراہ سوائے جسمانی طاقت کے تحفہ کے اور کچھ نہ لائے، اور یہ امر خلاف توقع تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے علم وفن یا درگاہوں کی قدر شناسی کا کوئی ثبوت پیش کرتے، چنانچہ سنہ ۸۰۰ء تک ہمارے سامنے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہیں آتی جس نے ماسبق کی اہمیت کا اندازہ کیا ہو۔ شمالی اقوام کے مابین اشاعت عیسائیت نے جس کا آغاز پانچویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ہوا کلیسائی طبقہ کے علاوہ ان فاتح طبقات پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہیں کیا، اور یہ صرف چارلی مین کی ذات تھی جس نے پہلے پہل اپنے لوگوں کی وحشیانہ عادات اور طبعی بغاوت کو قومی اصلاح کے نظریوں سے مانوس کرنے کی سعی کی۔

بلاشک وشبہ، مشرق کا انگلستان پر اولین براہ راست اثر، اہل انگلستان کا حروب صلیبیہ میں اشتراک تھا، جس نے یورپ کی آنکھیں اُس تہذیب پر وا کر دیں جس کا اہل یورپ کو خیال تک نہیں تھا۔ مشرق ادنیٰ ومتوسط کی وہ تصویر جو عام لوگوں کے ذہن میں بارھویں صدی میں محفوظ تھی غالباً سرے سے غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ لٹریچر کی وساطت سے اسے مصر وایران اور ہندوستان جیسے ممالک کے ناموں سے واقفیت تھی اور بائبل کے ذریعہ سے اُسے فلسطین اور عراق وعرب کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تھا مگر اُن واقعات کے متعلق جو ان ملکوں میں سلطنت روما کے زوال کے بعد رونما ہوئے اُسے غالباً کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس مزعومہ امر کے کہ ساتویں صدی میں ایک جھوٹا (نعوذ باللہ من ذالک) پیغمبر محمد نام کا پیدا ہوا ہے جو ان دنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقامات مقدسہ پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کا گمان اغلبًا یہ تھا کہ محمد کے پیرو کار وحشی عرب ہیں، جن کے ہاں بہت کم یا سرے سے کوئی تہذیب و شائستگی نہیں۔ انہیں یقیناً کسی ایسے دربار کا خیال نہیں تھا جس کا صدر الصدور ایک بہادر اور مہذب حاکم ہے اور جس کے ہاں اکثر ممالک کے اہل علم وفن بکثرت آتے جاتے ہیں چنانچہ اُس حیرت مطلق کا تخیل محض محال ہے جو اولین صلیبی جنگ آزماؤں کو اُس وقت لاحق ہوئی جب کہ انہیں ان برائے نام جاہلوں کی اہلیت کا علم واحساس ہوا۔ اس قسم کے جو جنگ آزما یونان واٹلی کی سرزمین سے گزرے انہوں نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کی پہلی شان وشوکت جا چکی ہے، مگر جب انہوں نے سرزمین شام میں قدم رکھا تو ایک ایسی طاقت کو اپنے جوبن پر پایا جس کا انہیں خواب وخیال تک نہیں تھا۔

درحقیقت یورپ میں مشرق کے متعلق ذخیرۂ معلومات لانے کا ذریعہ صلیبی جنگجو ہی تھے، مگر یہ ذخیرہ محض محدود تھا جو جغرافی حیثیت سے صرف فلسطین، شام اور مصر تک مفید تھا، اور تنقیدی حیثیت سے اُس کی اہمیت یا تو بہت کم تھی، یا سرے سے تھی نہیں صلیبی جنگ آزماؤں کو بادیہ نشینوں سے تعلم کی کوئی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ صرف انہیں یروشلم سے خارج کرنا چاہتے تھے، اور حتی الامکان انہیں ملیامیٹ کر دینے کے متمنی تھے۔

سرزمین سپین پر متمکن ہونے کے بعد باقی یورپ پر عربوں کا فوری اثر مقابلتہً خفیف تھا، چنانچہ نویں اور دسویں صدی میں ہمیں ایسی بہت کم شخصیتوں کا علم ہے جن کا علمی مشغلہ عربی زبان کی تحصیل ہو اولین مثالوں میں سے نہایت مشہور مثال پوپ سلوسٹر ثانی (گربرٹ، ریمس کے اسقف اعظم) کی ہے، جس نے دسویں صدی کے خاتمے اور گیارھویں صدی کے آغاز میں بحیثیت ایک عالم و فاضل کے خاصی شہرت حاصل کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے عربی اور عبرانی زبانوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ پوپ سلوسٹر کے بعد فریڈرک ثانی کا نام ہے جو ۱۲۵۰ء میں فوت ہوا۔ فریڈرک ثانی باربروسا اعظم کا پوتا تھا، اور اسے ازابلا دختر شاہ جان کا خاوند ہونے کی حیثیت سے انگلستان سے گہرا تعلق تھا۔ فریڈرک نے عربی تصانیف کے مطالعہ اور ترجمہ کی ترویج کے لئے بہت سا کام کیا۔ وہ میکائیل سکاٹ کا مربی تھا، جس نے بوعلی سینا کی "نیچرل ہسٹری" کا ترجمہ کیا۔ یہ امر تو ظاہر نہیں ہوتا کہ قرطبہ یونیورسٹی کے بہت سے فضلا نے باقی یورپ کا سفر کیا ہو، مگر اس قدر یقینی ہے کہ بہت سے یورپین فضلا، بالخصوص ڈینٹے کے استاد برونیٹو لیٹنی جیسے مورش سپین کے عربوں اور یہودیوں کے زیر نگرانی تعلم کے لئے گئے۔ مگر ان تمام امور کے باوجود یہ صرف صلیبی جنگ آزماؤں کی ذات تھی جس نے پہلے پہل یورپ کو اسلام سے حقیقی طور پر روشناس کرایا۔ جب پیٹر راہب نے ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کی تبلیغ کی تو وہ ثقیف جو براہ راست عیسائیت سے منسوب ہوسکتی ہے اُس وقت تک صرف کلیسا تک محدود تھی۔ اور عیسائی یورپ ابھی بچپن کے ابتدائی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا، بحالیکہ اسلام جو ۶۰۰ برس پیشتر منصۂ شہود پر آیا، اس وقت سے قبل اپنے سیاسی عروج پر پہنچ چکا تھا، اور لٹریچر کا ادبی دور گزار چکا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی دس صدیوں میں خلافتِ عربیہ کے ارتقا کی سرعت اور ترقی عیسائیت کی سست عنصری کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس مقابلے سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ کیونکر ہزار سالہ عیسائی ملوکیت کی نمایندہ امارت نے، ایسی شان تہذیب سے محیط امارتِ اسلام کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انہیں اپنے گھروں میں نہیں ملتی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ آزما جو انگلستان واپس آئے کس قسم کے اثرات اپنے ہمراہ لائے اولاً تو ہم یہ امر تسلیم کرسکتے ہیں کہ اُن کی ذہنی کیفیت بہت حد تک وسعت پذیر ہوچکی تھی، اور وہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ بادیہ نشین گو منکر عیسائیت ہیں لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ایسے ہی اچھے انسان ہیں جیسے کہ وہ خود۔ بہادری میں اُن کے برابر، اسلحہ میں ان کے ہم پلہ اور عشرت و امارت پسندی میں اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ صلیبی لڑائیاں جو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہیں، بطورِ خود ملک گیری کے کسی مزید اقدام کا موجب نہ بنیں اس لئے کہ اہلِ انگلستان نے مشرق میں اٹھارہویں صدی کے وسط سے پیشتر کسی قسم کی فوجی پیش قدمی شروع

نہیں کی۔ یہاں تک کہ مذہبی مقاصد کی جگہ تجارتی اغراض نے لے لی۔ علاوہ ازیں راس امید کی مشرقی راہ کے انکشاف کے وقت تک بحیرۂ متوسط سے باہر تجارت کا کوئی عندیہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم اس امر کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کے مشرق سے تعلق کا نتیجہ محض عیش وعشرت، نمایش اور امارت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس دور میں انگلستان پر کسی تشقیفی اثر کا نشان نہیں ملتا کیونکہ چند ابتدائی تراجم کے قطع نظر (مثلاً میکائیل سکاٹ کی بوعلی سینا کی نیچرل ہسٹری)، یہ صرف علوم وفنون کی عام تجدید کے بعد تھا کہ عربوں کا سائنس اور فلسفہ لاطینی زبان کی وساطت سے اہل تدریس کے علم میں آیا۔ تاہم یہ امر طبعی ہے کہ مسلمانوں کے تشقیفی پہلو نے صلیبیوں پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ ان کے ہاں مذہبی اشتعال سے قطع نظر سوائے جنگ آزمائی کے اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بارھویں صدی کے وسط میں یورپ میں افواہ اڑی کہ کہیں اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر ایک عیسائی شہر آزما مسمی پیرسٹر جان رہتا ہے جس نے بادیہ نشینوں کو تباہ کن شکست دی ہے۔ اس افواہ نے اس امر کی امید دلائی کہ صلیبیوں کو ایک ایسا اتحادی مل گیا ہے جو مخالفین پر دوسری جانب سے حملہ کرے گا مگر اس امید نے عملی جامہ کبھی نہ پہنا اس لئے کہ یہ افواہ مغالطہ پر مبنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۱۴۱ء میں سلجوق حکمران کو ایک ترکی شہزادہ کے ہاتھوں جس کی فوج میں بہت سے عیسائی ترک تھے شکست ہوئی، مگر ان ترکوں کو صلیبی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جن کے متعلق بہت ممکن ہے کہ انہیں کبھی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہو۔

یہ صرف تیرھویں صدی کے وسط میں مغلوں کا مشرقی یورپ پر حملہ تھا، اور اپنے وسط ایشیا کے گھروں میں اُن کی فوری واپسی تھی جس کا نتیجہ مشرق ادنیٰ سے اتر کر ایشیا کا حقیقی انکشاف ہوا، اور جس نے چین کا خشکی کا راستہ کھول دیا۔ اُس وقت مشنری پادری لوگوں اور تاجروں نے اس امر کے انکشاف کی خاطر سفر کرنا شروع کیا کہ یہ عجیب و غریب اور ناقابل شمار مغل حملہ آور کہاں سے آتے درآنحالیکہ ساتھ ہی انہیں پیرسٹر جان سے ملنے کی امید بھی تھی۔ چنانچہ جو بیانات یہ لوگ اپنے ہمراہ لائے، نہایت اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے، اور ان میں سے سب سے زیادہ مطلع نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ مشہور ومعروف مارکوپولو کا بیان ہے۔

مارکوپولو وینس کا شہری تھا جو قبلا خاں کے عہد میں شہر پیکنگ میں پہنچا اور کئی سال تک چین میں اقامت پذیر رہا اور اسی دوران میں مغل شہنشاہ کے زیر حکومت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر وہ ایران کی راہ اپنے اصلی وطن کو مراجعت کر گیا جہاں وہ سمندر کے راستے ۱۲۹۵ء میں پہنچا۔

وینس پہنچنے پر مغل لباس میں ملبوس نووارد کو اُس کے ہم وطن پہچان نہ سکے، یہاں تک کہ اُسے خود اپنے مکان

میں بدقت داخلہ نصیب ہوا۔ مارکوپولو کے "اسفار" ہمیشہ غیر معمولی ہردلعزیزی کا باعث بنے رہے ہیں، اور چین کے متعلق یورپین استعجاب کی ابتدا بمقابلہ کسی دوسری کتاب کے صرف اسی سفرنامہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

گر مشرقی "اسفار" کے متعلق کوئی تصنیف ہردلعزیزی میں اُس کہانی کا مقابلہ نہیں کرسکی جو سرجان منڈیول نے تالیف کی ہے اور جو مارکوپولو کے تقریباً پچاس سال بعد معرضِ ظہور میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون صرف مشرقِ ادنیٰ تک محدود ہے مگر بوجہ اپنے انتہائی غلو کے اُسے مطالعہ کرنے والے پسند کرتے تھے اور صدیوں تک اُسے حالات کا حقیقی مرقع خیال کیا جاتا تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا منڈیول فلسطین سے آگے بڑھا بھی یا نہیں، اور یہ محض اسی نوعیت کی کتابوں کی وجہ سے کہ قدیم نقشہ کاروں کو اس بات کی ترغیب ہوئی کہ وہ ممالکِ غیر منکشفہ کے نقشوں میں خیالی باشندے دکھائیں ـــــ ایسے باشندے جن کے دو سر ہوں یا تین ٹانگیں اور علیٰ ہذا القیاس، یا اژدہاؤں کے سے خوفناک درندے۔ غلط افواہ کے برقی خرگوشوں پر حقیقت کے سگہائے صید افگن کا غلبہ شاذونادر ہی ہوتا ہے، اور اگر ایسے خرگوش گرفت میں آ بھی جائیں تو خرگوش و سگ ہر دو کو حرمان و یاس اور رنج والم کا سامنا ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت سے آگے مشرقی "اسفار" کی کتابیں پڑھی جانے لگیں اور پرتگیزوں کی ہندوستان اور ابی سینیا میں ابتدائی پیش قدمیاں بے شمار نفیس و غریب بیانات کا موجب بنیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کی پہلی شائع شدہ کتاب اب پولو کے اسفارِ ابی سینیا کا ترجمہ تھا جس پر بعد میں سیلاز کی کہانی کی تعمیر ہوئی۔

لیکن مشرق کے حقیقی حکایت نامہ کا انکشاف یورپ پر "الف لیلیٰ" کے ترجمہ کی وساطت سے ہوا۔ یہ ترجمہ جس کا اظہار پہلے پہل فرانسیسی میں اور عین بعد انگریزی میں ہوا بعض کو اتفہ میں یورپ کے لٹریچر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ تھا۔ ہمارے لئے جو بچپن سے "دریش نیلگوں" "علی بابا اور چالیس چور" کی حکایات سے مانوس ہیں اُس استعجاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے یورپ والوں نے ان مسرت آمیز کہانیوں کا استقبال کیا۔ انہیں کہانیوں نے ان لوگوں کا خلفا، شیوخ، جنات اور عفاریت کی ایک نئی دنیا اور اس قسم کے محلات اور ضیافتوں سے تعارف کرایا جن کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ ان حکایات نے بغداد و مصر کو محبت و نفاق اور عجائبات کے کرشموں سے از سرِ نو زندہ کر دکھایا۔

ان حکایات کی عربی اصل کو اول اول ایک فرانسیسی مسمی گیلنڈ نے جو محکمۂ سیاسیات کا ملازم تھا دمشق میں پایا، اور بعد میں اُن کا ترجمہ بھی شائع کیا جو متعدد اقساط میں ۱۷۰۴ء اور ۱۷۱۷ء کے مابین اشاعت پذیر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد لندن میں ایک گمنام انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ان حکایات کو فوری کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ سر جیمس سٹیورٹ، سکاٹ لینڈ

کے لارڈ ایڈووکیٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ہفتہ کی شام کو اپنی لڑکیوں کو "الف لیلیٰ" پڑھتے دیکھا سرجیمس نے اُن سے کتاب چھین لی، مگر دوسری صبح خود لارڈ ایڈووکیٹ اپنی لائبریری میں اس حالت میں سوتے پائے گئے کہ کتاب اُن کی بغل میں تھی، یعنی یہ کہ وہ اس کتاب کو سبت کے دن طویل عرصہ تک پڑھتے رہے تھے۔

تاہم اُس زمانہ تک جب وارن ہیسٹنگز ہندوستان کے گورنر جنرل بنے اس سرزمین کی قدیم زبان اور لٹریچر نے مغربی اہل علم کی خاص توجہ حاصل نہ کی۔ وارن ہیسٹنگز کا یہ خیال صحیح تھا کہ ہندوستانیوں پر انصاف وہمدردی سے حکومت کرنے کے لئے ان کے اپنے قوانین اور رسوم سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ سنسکرت لٹریچر کی تشریح کے بلند پایہ کام کے ضمن میں دو ممتاز نام سرولیم جونز اور کول برک ہیں۔ سرولیم جونز تو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا بانی ہے، اور کول برک نے سنسکرت کے کئی متون شائع کئے۔ ان انگریز فضلا نے جس کام کی ابتدا کی فرانس اور جرمنی کے فضلا انہماک سے اُس کے درپے ہوگئے، اور علم الالسنہ (فلالوجی) کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاہم یہ صرف ایف ڈبلیو میکس ملر کتب شرقیہ کا ایڈیٹر تھا جس نے عہد وکٹوریا میں سنسکرت لٹریچر اور فلالوجی کی ترویج کی خاطر ہر دوسرے فاضل سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

جونہی کہ لوگوں نے سنسکرت زبان میں ضبط شدہ لٹریچر کی فراہمی اور مطالعہ کا کام شروع کیا، انکشافات کے وسیع اور جدید میدان کھل گئے، اور مذہب وفلسفہ کے علوم میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ ہمارے لئے یہ امر مشکل ہے کہ ہم اُس اثر کی تشخیص کریں جو یورپ کے فضلا پر ایک قدیم تثقیف وتہذیب کے انکشاف سے مترتب ہوا —— ایسی تثقیف وتہذیب جس کے وجود کا انہیں علم تک نہیں تھا، جو بلند پایہ ادبی اور فلسفیانہ نوعیت کی بے شمار تصانیف پر مشتمل تھی اور جو اعلیٰ صنف کی شاعری اور ڈراما کے علاوہ، دماغی اور اخلاقی علوم اور فنون وقانون سے متعلقہ وسیع تصانیف پر حاوی تھی، چنانچہ بعض پہلوؤں میں اُس کی کامیابی یونانیوں کی کامرانی سے حقیقتہً پیش پیش تھی۔

متقابل فلالوجی کا باقاعدہ مطالعہ جس کا حصول سنسکرت کے انکشاف سے ممکن ہوگیا اُن تمام مروج نظریوں کے مکمل اعادہ کا موجب بنا، جو بنی نوع انسان کی اصل سے متعلق تھے یعنی ایسے نظریے جو اس وقت تک شہر بابل میں اختلاف السنہ کے افسانہ پر مبنی تھے۔ اس طرح پر مشرق نے جس نے خود کو مغرب پر اس تمہل سے منکشف کیا، آخرالامر اپنے سب سے گراں مایہ راز یعنی ہندوستان کو عیاں کیا۔

فیض احمد

نشاطِ رُوح

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

ہوں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا

یُوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یُوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں — کچھ جم کے رہ گیا اُسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن — آج اُس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی — جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے — ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اِس طرح کی جنوں میں یہاں زندگی بسر
خود زندگی کو میں نے پشیماں بنا دیا

اصغر گونڈوی

مبادیٔ سیاسیات

باب ۷

حکومت کا دائرۂ عمل[1]

پچھلے باب کے عنوان موسومہ "ملکیت" کے تحت بتایا گیا تھا کہ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حقِ مالکانہ اور اُن کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیداوار دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائگاں جاتے ہیں، لہٰذا عاملینِ پیداوار پر حکومت کا پورا قابو ہونا چاہیئے، اور سرمایہ وزمین دونوں مملکت ہی کی مملوکہ ہونی چاہئیں یہ اصول محض ضمنی طور پر بیان کیا گیا تھا اور اُس وقت بحث وتحیص کو نظر انداز کردیا گیا تھا۔ موجودہ باب میں اس اہم مبحث پر غور کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ آج کل دنیا کی فضا جن طبقہ داری نزاعات کی وجہ سے مکدر ہو رہی ہے اُن پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ کیا جائے۔

مملکت اور حکومت کی مداخلت۔ اشتراکیت اور اس کے جوابی اصول انفرادیت کا مسئلہ دراصل افراد و مملکت کے باہمی تعلقات، اور افراد کے کاموں میں مملکت کی مداخلت کا مسئلہ ہے۔ اس میں توشبہ کی گنجائش نہیں کہ مملکت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور چونکہ ملک کی تمام منظم قوت اُس کی پشت پناہی کے لئے حاضر ہوسکتی ہے اس لئے بظاہر وہ ایسی مطلق العنان فرمانروا ہے جس کا حکم گویا قانون ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی کن کن مصروفیات اور امور میں عمالِ حکومت کو معمولی طور پر مداخلت کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ ممالکِ متحدۂ امریکہ کی ریاست یوٹا میں ہر شخص جتنی عورتوں سے چاہے نکاح کرسکتا ہے، لیکن شرعِ اسلامی کی رو سے کسی مرد کو چار سے زیادہ

---

[1] اس باب میں بہت سی معاشی اصطلاحات کو استعمال کرنا پڑا ہے۔ سیاسیات اور معاشیات دونوں علوم عمرانی ہیں، اور اُن میں جو باہمی رشتہ ہے اُسے باب ا (ہمایوں فروری ۱۹۲۸ء) میں واضح کردیا گیا ہے۔ زمانۂ حال میں ان دونوں علوم کا تعلق پہلے سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ باب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان معاشی اصطلاحات سے گریز کیا جائے لیکن بعض مرتبہ اس سے مفر نہیں ہوسکا۔ "دولت"، "اصل"، "زمین"، "عاملینِ پیداوار"، "اجارہ" اور دوسری معاشی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے دیکھو الیاس برنی کی کتاب "علم المعیشت"۔

نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی جب وہ اپنی ہر ایک بیوی کے ساتھ مکمل مساوات کا سلوک کرسکے؛ پھر اکثر ممالکِ یورپ میں کسی فرد کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کرے تو وہ گرفتنی تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عمالِ حکومت اکثر ممالکِ یورپ میں افراد کے حقِ مناکحت میں نسبتہً زیادہ مداخلت کرسکتے ہیں، اسلامی شرع کی رو سے اس سے ذرا کم، اور یوٹا جیسی ریاست میں انہیں اس نوع کی مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے انگلستان میں جہاں جبری تعلیم کا قانون رائج ہے، اگر کوئی شخص اپنے بچے کو جس کی عمر ایک خاص حد سے تجاوز کرچکی ہو، مدرسہ نہ بھیجے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں حکومت کسی شخص کو جبرًا اپنے بچے کو مدرسہ بھیجنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

انفرادیت اور اشتراکیت۔ اگر انفرادیت اور اشتراکیت کو اجمالی طور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کی مداخلت کو فرد کے حق میں برا تصور کرتے ہیں اور اُن کا یہ خیال ہے کہ اُس کی غیر ضروری دست اندازی سے انسان کی آزادی میں رخنہ پڑتا ہے؛ تاہم اُن کے نزدیک چونکہ معاشرۂ انسانی ہنوز اُس پایۂ کمال کو نہیں پہنچا کہ بغیر بیرونی دباؤ کے انسان کی زندگی، حقوق اور مملوکات مامون و محفوظ رہ سکیں اس لئے حکومت کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ بدیں سبب اس کی ضرورت ہے کہ جس وقت ان عناصرِ حیات میں سے کوئی بھی معرضِ خطر میں آئے تو حکومت مداخلت کرکے نقصان رساں کو کیفرِ کردار کو پہنچائے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بھی دست اندازی کرے جو صریحًا خود فرد کے حیطۂ اقتدار میں ہوں، جیسے تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ، اس لئے کہ انفرادیوں کی دانست میں ہر شخص کو ان کے طے کرنے کا کلیتہً حق حاصل ہے، چنانچہ ایسی حالت میں بیرونی مداخلت بے کار بلکہ شاید نقصان رساں ثابت ہوگی۔

اس کے برعکس اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ انسان ہرگز اپنے مفاد سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا اور اس کے اور مملکت کے اغراض میں بعض مرتبہ جو تضاد پایا جاتا ہے اُس کے نتائجِ بد کے انسداد کے لئے مملکت کی مداخلت لازمی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے باعث انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہوجاتا ہے، اور چونکہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں اس لئے کوئی بات بھی خاطرخواہ انجام کو نہیں پہنچتی۔ اُن کی دانست میں بہترین مملکت وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا سوال باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں مملکت ہی کی سمجھی جائیں اور "محنت" پر اُسی کی کلیتہً دسترس ہو۔ مکمل اشتراکی مملکت میں نہ خانگی زمینداریاں ہونگی نہ خانگی گرنیاں اور ملیں، نہ خانگی مدارس و کارخانجات، بلکہ جس قدر بھی عاملینِ پیداوار ہیں سب کے سب حکومت ہی کے

دست نگر ہونگے، ہر ایک فرد گویا مملکت ہی کی طرف سے کام کرے گا اور حکومت ہی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اُس کی قوت بسری ہوگی۔

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ انسانی معاشرہ میں نہ تو مکمل اشتراکیت کا راج ہو سکتا ہے نہ مکمل انفرادیت کا، چنانچہ جس اصول پر آج کل عام طور سے اکثر ممالک میں عمل کیا جاتا ہے وہ خذ ما صفیٰ ودع ما کدر کا اصول ہے[۵۲] محض عقیدہ پرستی سے علومِ عمرانی میں کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ مختلف ممالک دراصل افراد ہی کے مجموعے ہیں اور افراد میں بے حد تنوع پایا جاتا ہے اور ملک کی معاشی، جغرافی و سیاسی کیفیات بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کسی ملک میں فرد کی باگ بالکل چھوڑ دی جائے نہ یہ کہ فرد کے ہر ایک معاملے میں حکومت مستقل طور پر مداخلت کرتی رہے[۵۳]۔ انفرادی ممالک میں آسانی اسی میں تصور کی گئی ہے کہ تار، ڈاک اور ایک بڑی حد تک تعلیم و حفظانِ صحت کا کام حکومت اپنے ذمہ لے لے اور کارخانوں وغیرہ کی نگرانی کرتی رہے، اُدھر روس جیسے اشتراکیت پسند ملک میں یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ بلا شرکتِ غیرے حکومت ہی براہِ راست زمیندار، سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنی رہے۔ گویا فی الجملہ آج کل کے زمانے میں اکثر ممالک کا مطمحِ نظر یہی ہو گیا ہے کہ محض عقیدہ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ایک طرف تو افراد کی ذاتی و خانگی آزادی کے دائرہ کو حتی الامکان وسیع تر کیا جائے لیکن ساتھ ہی حسبِ ضرورت ملک کی بہبود و مفاد کی خاطر حکومت مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔

انفرادیت ۔ اب ان اصول پر ذرا غائر نظر ڈالیئے۔ انفرادیت کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب قدیم تجاریت کے ساتھ ساتھ حکومت کی مداخلت و نگرانی کے خیالات زائل ہو رہے تھے۔ آدم سمتھ[۵۴]، فون ہمبولٹ[۵۵] اور ہربرٹ سپنسر[۵۶] نے اس اصول کو پیش کر کے اس سے مختلف النوع استدلال کئے۔ انفرادیت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر ایک فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اُس وقت تک پوری آزادی ہونی چاہئے جب تک یہ عیاں نہ ہو جائے کہ اس کی آزادی سے کسی دوسرے کو گزند پہنچتا ہے۔ معاشرۂ انسانی کی بنیاد خود غرضی پر ہے، اور ہر ایک شخص اپنی غرض کو دوسروں کی بہ نسبت بہتر پہچان سکتا ہے، چنانچہ جس قدر بیرونی اور مصنوعی روکاوٹیں کم ہونگی اتنا ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب

---

۵۲ "جو اچھا ہو اسے رکھ اور جو برا ہو اُسے چھوڑ"

۵۳ دیکھو باب ۵، رسالہ ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء

۵۴ آدم سمتھ "دولت اقوام" Adam Smith: Wealth of the Nations

۵۵ فون ہمبولٹ خیالات متعلق تحدید دائرہ حکومت Humbold: Greunzer der Wirksamkeit des Staats

۵۶ ہربرٹ سپنسر "فرد بمقابلہ مملکت" Herbert Spenser: Man versus the State

ہوگا یہی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حصولِ مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی بہبود مدِ نظر ہوتی ہے اس لئے کہ آخر افراد ہی سے
تو معاشرہ ترکیب پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبود کے لئے کوشش کرے گا تو مختلف افراد کے مابین مقابلے
کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کی اعلیٰ ترین قابلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور اس میں اپنی مدد آپ
کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز اس مقابلے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جو افراد فطرتاً ناقابل ہیں یا ماحول کے باعث
ان کی فطری اہلیت زائل ہو چکی ہے وہ یا تو پس پشت چلے جائیں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے جس کی وجہ سے معاشرہ
کو بقائے اصلح سے فائدہ پہنچے گا۔ الغرض انفرادیوں کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ افراد کے کاموں میں حکومت بے ضرورت
مداخلت کرنے سے باز رہے اور صرف انہیں کاموں کی نگرانی رکھے جو افراد کی جان، مال اور آزادی کے لئے
ضروری ہیں۔

اگر نظریۂ انفرادیت پر تنقیدی نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں بہت جلد اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت مل جائیگا۔
سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی گویا بنیاد ہے یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک فرد کو اپنی بہبود مدِ نظر ہوتی ہے اور وہ اس کے
لئے کما حقہٗ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس کا اہل بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادیوں کا یہ خیال بالکل خام ہے۔ ہم
جانتے ہیں کہ عقل انسانی مکمل نہیں[۵۷]، اور روزمرہ اس قسم کے سینکڑوں واقعات پیش آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہو کہ انسان کیلئے
اپنے پاؤں میں جان بوجھ کر کلہاڑی مارلینا بالکل معمولی بات ہے۔ اگر وہ اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہوتا
اور اس کے حصول کے ذرائع سے بھی واقف ہوتا تو پھر ہم کسی کو ناکامی یا عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نہ دیکھتے
پھر یہ بات غلط ہے کہ افراد اور مملکت کے اغراض ایک ہی ہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض مرتبہ جس چیز میں بظاہر فرد
کا مفاد نظر آتا ہے اُس میں ان کی اجتماعی کیفیت یا مملکت کا مفاد مضمر نہیں ہوتا[۵۸]۔ اگر یہ اجتماعی کیفیت قائم رکھنی ہے
(اور اس سے مفر بھی نہیں[۵۹]) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھنا پڑے گا۔ اور مملکت کو
بھی اس کے ارتقا اور اس کے اغراض کے حصول کے لئے اسی طرح سے آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچانی پڑیں گی
جیسے خود افراد کو۔ نظریۂ انفرادیت پر تیسری تنقید یہ کی جاسکتی ہے کہ انفرادی جس "آزادی" کو ملحوظ رکھنے کی کوشش
کرتے ہیں اُس کا تعین مملکت کی اثباتی مداخلت کے بدوں ناممکن ہے اور فطری آزادی و حقوق کیسے ہی دل خوش کن

---

۵۷ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم (قرآن مجید، سورۂ بقرہ رکوع ۱۰)

۵۸ باب ۱۰ (ہمایوں، فروری ۱۹۲۸ء)

۵۹ باب ۱۳ (ہمایوں، اپریل ۱۹۲۸ء)

خیالات کیوں نہ ہوں، بغیر اس اثباتی مداخلت کے اُن کی بنیاد محض ہوا پر ہے[10]۔ آخری دلیل جو انفرادیت کے موافق پیش کی جاتی ہے وہ بقائے اصلح کی ہے، اور اس کا سب سے بڑا موید ہربرٹ سپنسر ہے[11]۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرۂ انسانی کی حقیقی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلے کے ذریعے سے پیش پیش ہو جائیں اور بدترین فنا ہو جائیں۔ بظاہر یہ خیال بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے کار فرد باقی نہ رہے جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دوسروں کا گویا پیٹ کاٹ کر کھاتا ہو، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ نظریہ بالکل بے اصل معلوم ہونے لگتا ہے۔ اول تو سپنسر کا یہ خیال ایسے جانوروں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں اپنی اصلاح کی اہلیت نہیں، درآنحالیکہ انسان ان جانوروں سے ممتاز ہے۔ اور وہ ہر آن اپنی حالت کو بہتر کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی بہرے، اندھے، گونگے، لولے اور اپاہج، جنہیں شاید سپنسر دریا برد کرا دیتا، معاشرہ کے مفید عناصر بن گئے ہیں، اور وہ جنہیں فطرت کی طرف سے جملہ قوائے جسمانی عطا ہوئے ہیں ہر لحظہ اپنی اور اپنے ماحول کی حالت کو سدھارنے میں مشغول ہیں۔ جب واقعی صورتِ حال یہ ہے تو پھر جانوروں کی عادات و خصائل سے استدلال کرنا اور بنی نوع انسان کو گردن زدنی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مقابلے کی ترویج سے بد فنا ہو جاتے ہیں اور نیک باقی رہتے ہیں، درآنحالیکہ حقیقتاً اس سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو صریح معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر جو شخص مقابلے کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ انسانی اعتبار سے قابل ترین ہو، لازماً بہترین نہیں ہوتا؛ اس کے وسائل اور اس کا دائرۂ نظر نسبتاً تنگ ہوتا ہے درآنحالیکہ اجتماعی انتظامات کی شکل میں یہ دائرہ وسائل کی فراوانی، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کے باعث وسیع تر ہو جائے گا۔

انفرادیتِ جدیدہ - حال کے زمانے میں دوسرے سیاسی نظریوں کی طرح انفرادی نظریہ نے بھی چولا بدلا ہے اور بالخصوص پچھلی جنگِ عظیم کے بعد اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلی ظہور میں آئی ہے۔ دورانِ جنگ میں اور اس کے بعد تقریباً ہر ملک میں دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت اور دوسرے حکومت کے علاوہ دیگر ادارات کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش آئی کہ مرکز گریز قوتوں کا یا تو خاتمہ کر دیا جائے ورنہ حکومت کسی نہ کسی طرح سے ان پر حاوی ہو جائے، چنانچہ نئے نئے محاصل جاری ہوئے، قوانین

---

[10] باب ۶، ہمایوں، فروری ۱۹۲۹ء (۶)

[11] ہربرٹ سپنسر حسبِ بالا۔

تحفظِ قومی نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ممالک میں ہر ایسے شخص کو جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھا، بھرتی ہونے پر مجبور کیا گیا، خانگی کارخانوں اور گرنیوں میں، جن میں پہلے روزانہ استعمال کی اشیا بنائی جاتی تھیں، سامانِ جنگ اور گولا بارود بننے لگا۔ الغرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور حکومت کے عمال ہر موقع محل پر نظر آنے لگے۔ اس صورتِ حال کے خلاف ردِعمل ہونا لازمی تھا، چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی دست برد اور مداخلت سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہوگئی اور بڑی بڑی قومی انجمنوں اور ادارات نے خود اپنے ضابطوں اور قاعدوں کا نفاذ کرکے یہ دکھا دیا کہ ترتیب اور تنظیم محض حکومت کے جبر ہی سے برقرار نہیں رہتی بلکہ اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں معاشی کیفیات سے انفرادیت جدیدہ جنم لیتی ہے[۱۱۵]۔ اول تو اکثر ملکوں کے باشندوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ عقیدہ پرستی اور عملی سیاسیات دو مختلف النوع باتیں ہیں، اور انہیں یہ یقین ہوگیا کہ انفرادی اور اشتراکی عقیدہ پرست کچھ ہی کہتے ہیں، ہر ملک کا سیاسی ارتقا اس ملک کی سیاسی کیفیات کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ایک مسلک یہ بھی قائم ہوگیا کہ مملکت کو محض افراد کی بجائے ان کے مجموعوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور جس طرح ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وقت آنے پر ہم اپنے ملک (یعنی اپنے مخصوص جغرافی رقبے) پر اپنی جان تک قربان کردیں، اسی طرح دوسرے ایسے ادارات بھی ہیں جن کے واسطے ممکن ہے کہ ہمیں قربانی کرنی پڑے؛ وہ ادارات ہمارا مذہب، ہمارا مدرسہ، ہمارا "دائرہ"، ہمارا اتحادِ تجارتی وغیرہ ہیں[۱۱۶]۔ جدید انفرادیوں کا یہ قول ہے کہ اگر مملکت اور ان قومی یا مذہبی عالمگیر ادارات کے مابین تصادم ہوجائے تو استقرائی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ مملکت ہی کو فوقیت حاصل ہو، اور موجودہ صورتِ حال میں ان ادارات کو نظر انداز کردینا کسی طرح سے مناسب نہیں ہے۔ جدید انفرادیوں کے نزدیک مملکت کی بابت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جملہ مجموعہ جاتِ انسانی کی ایک عہدیت یا وفاقیت ہے جس کے ذریعے سے ان ادارات کے مابین ایک قسم کی ترتیب وتنظیم پیدا ہوجاتی ہے؛ لیکن ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کو فی نفسہٖ کسی قسم کا ایسا تفوق حاصل ہے جس کے باعث اسے ان ادارات کو فنا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

---

[۱۱۵] جدید نظریوں کے متعلق جوڈ کی کتاب "زمانۂ حالیہ کے نظریاتِ سیاسی" Joad: Modern Political Theory نہایت بسیط اور پُر معلومات ہے۔

[۱۱۶] اس خیال اور اس کا نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ سے جو تعلق ہے اس کے لئے دیکھو لاسکی: "مسئلۂ اقتدارِ اعلیٰ" Laski: The Problem of Sovereignty، باب ۱۔

نراج ۔ اب انفرادیت کی انتہائی شکل یعنی نراج کے اصول پر نظر ڈالیئے ۔ عام طور پر "نراج" کے معنی اعدامیت کے لئے جاتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں سے شہنشاہیت پسندوں نے اپنا جو کام نکالا ہے ۔ اس کے باعث ہم انہیں بالالتزام انقلابی سمجھنے لگے ہیں ۔ جہاں کہیں کسی بدبخت نے کوئی بم پھینکا، جہاں کسی سیاسی جرم کا ارتکاب کیا گیا، بس "نراج" "نراج" کی صدائیں ہوا میں چکر لگانے لگیں، اور چونکہ عام طور پر اس قسم کے حالات سے کام نکالنا مقصود ہوتا ہے ۔ اس لئے کسی کو یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی کہ آخر نراج کے معنی کیا ہیں اور یہ بم واقعی کسی نراجی نے پھینکا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے ۔ "نراج" کے معنی عدمِ حکومت کے ہیں، اور اس کے موید یہ چاہتے ہیں کہ انسانی قوائے ذہنیہ وجسمانیہ میں کچھ اس قسم کا ارتقا ہو جائے کہ جبر واکراہ بالکل غیر ضروری ہو جائے اور افراد و مجموعہ جاتِ افراد بدون کسی بیرونی دباؤ کے جملہ کاروبارِ زندگی انجام دے سکیں ۔ ان کے نزدیک نیابتی حکومت ایک بڑے بھاری مغالطے پر مبنی ہے، وہ یہ کہ سیاسیات میں اصولِ نیابت کا انطباق ممکن ہے، یا کوئی شخص کسی مصنوعی رقبے کی آبادی کا نائب بن سکتا ہے ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی دانا و بینا کیوں نہ ہو، ہر ایک امر میں رائے دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، نہ یہ ممکن ہے کہ "مختار" اپنے "اصل" سے ہر ایک معاملے میں استفسار کیا کرے ۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ حکومت بےکار بھی ہے، اس لئے کہ تعلیم اور حفظانِ صحت ہی نہیں، بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں اور مجموعوں کے ذریعے سے کی جا سکتی ہے؛ مثلاً ان کا یہ قول ہے کہ تاریخ دنیا پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملہ آور اکثر ملک کی منظّم فوجوں کے مقابلے میں ان پر سبقت لے جاتے ہیں، اور انہیں آخر کار شہریوں کے ایسے اختیاری مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر ان پر گولے برساتے ہیں ۔ بہرحال نراجیوں کے نزدیک اگر مملکت اور حکومت کا ہاتھ اٹھا لیا جائے تو کاروبارِ مختلف امور کی کارفرمائی بالکل موجودہ زمانے کی طرح سے ہوتی رہے گی ۔ صرف فرق یہ ہوگا کہ ملک میں بجائے مقابلہ، عناد اور دشمنی کے محبت اور اتحاد و اتفاق کا راج ہو جائے گا ۔ ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم باقی رہے گی لیکن جبر کا عنصر بالکل اٹھ جائے گا ۔ ان کا سب سے بڑا گرو کروپوٹکن کہتا ہے[۲] کہ تم اگر مجریط سے موسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ملکوں اور شرکتوں کی ریلوں میں سفر کرنا پڑے گا جنہیں لاکھوں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، لیکن جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسرِ اقتدار واحد قوت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی ان کے نزدیک فرد صرف اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے جب بساطِ سیاسی سے مملکت اور حکومت دونوں

---

[۲] کروپوٹکن: "نراج کا فلسفہ اور اس کا مطمعِ نظر" Kropotkin: Anarchism its Philosophy & Ideal
(ترجمہ انگریزی)

ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں فرد کو مملکت اور سرمایہ دار دونوں کے جوئے سے آزادی حاصل ہو جائے گی اور امور ملکی ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ سے انجام پایا کریں گے۔

اتحادیت۔ اشتراکیت کی طرف رجوع ہونے سے پیشتر ہمیں ایک اور تحریک کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے اور وہ اتحادیت ہے۔ اتحادیت کی ابتدا فرانس میں ہوئی، اس کا بانی میبانی پرودھوں تھا جس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دنیا کی جملہ حکومتوں میں دراصل طبقۂ اوسط یا طبقۂ اعلیٰ برسرِ اقتدار ہے، اور یہی دو طبقے ملک کی افزائش دولت میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں[۱۵]۔ اس کے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو پیداوارِ دولت کے لئے اپنا عزیز وقت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے (یعنی مزدور) سیاسی حقوق سے ایک بڑی حد تک محروم ہے۔ اتحادی کہتے ہیں کہ حکومت کے تخیل کو بالکل غائب کر دیا جائے اور اُس کی جگہ تمام سیاسی قوت اتحاداتِ تجارتی کے ساتھ وابستہ ہو تاکہ مزدور ہی معاشرۂ سیاسی کے رہبر اور روح رواں ہو جائیں۔ معاشی اعتبار سے اتحادیت اشتراکیت کا عکس ہے، اس لئے کہ جہاں اشتراکیت میں صارف کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے وہاں اتحادیت "آجر" کو معاشرہ کا اہم ترین عنصر قرار دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مرکزی روایات کے باعث ضرورت سے زیادہ یکسانی، روزمرہ کا بے جان چکر، جدت کا فقدان اور بے اعتباری کے احساسات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو صریح نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں پارلیمنٹیں قائم ہیں وہاں مزدور فریق کے ارکان دراصل اپنے ہم خیالوں کے قائم مقام نہیں بلکہ اپنے اپنے حلقہ جاتِ انتخابات کے قائم مقام ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بالکل دست و پا بستہ ہوتے ہیں اور مزدوروں اور آجروں کی بہبود کے لئے چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے اتحادی جانتے ہیں کہ کسی ملک میں نسبتاً کم ایسے لوگ ہونگے جو اتحادیوں کے ہم خیال ہوں، لیکن اتحادی کہتے ہیں کہ عہدِ ارتقا میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو راہِ راست پر لایا جائے جس کے لئے کسی کثرتِ رائے کی ضرورت نہیں بلکہ حکومت اور اصل داروں کو بالجبر "عمل براہ راست" یعنی ہڑتال، مقاطعہ، غیر ضروری تعویق کا وغیرہ کے ذریعے سے دباؤ ڈال کر اپنا کہا منوایا جائے۔

تراج کے نظریہ کو کسی نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، اور اس کا سب سے بڑا سقم یہ معلوم ہوتا ہے کہ (جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے) بلاشبہ انسان خود غرض ہے، افراد اور مجموعوں کے باہمی اغراض میں یقیناً تصادم ہوتا رہتا ہے، اور اس تصادم کو روکنے کے لئے محض اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات ہرگز موثر نہیں ہو سکتے

---

[۱۵] دیکھو لیوین: "فرانس میں اتحادیت" Levine: Syndicalism in France

اگر چوری کے انسداد کے لئے ایک انجمن، قاتل کو سزا دینے کے لئے دوسری انجمن، اور قرضہ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے تیسری انجمن قائم کی گئی تو پھر جس انجمن کی قوت دوسری انجمنوں سے بڑھی ہوئی ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لے گی اور دوسری "اختیاری انجمنوں اور اداروں" کو اپنا مطیع کرلے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حاکمیت و محکومیت کے اصول بھرے ہوئے ہیں اور کسی نظریہ ساز کی تحریر یا محض عقیدہ پرستی کی وجہ سے اُس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی کیفیت اتحادیت کی بھی ہے۔ اتحادی چاہتے ہیں کہ تمام "اتحاداتِ تجارتی" باہم متفق ہوجائیں اور یہ جدید "وفاقیت" حکومت کی جگہ حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ جب اس وفاقیت کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوجائیں گے اور وہ شہریوں سے اپنے احکام جبراً منوانے لگے گی تو پھر موجودہ حکومت میں اور اس میں کونسا ایسا بڑا فرق رہ جائے گا جس کی وجہ سے موجودہ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش ضروری سمجھی گئی ہے۔

اشتراکیت۔ انفرادیت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اشتراکیت کی طرف آئیے اور سب سے پہلے اشتراکیت کے ابتدائی نظریہ کو لیجئے۔ اشتراکیوں کا سب سے بڑا گرو اور اشتراکی نظریے کا موجد کارل مارکس ہے جس نے اپنی کتاب موسومہ "راس المال"[۱۶] کو ۱۸۴۷ء میں جرمنی میں شائع کرایا۔ صنعتی و میکانیکی انقلاب کی وجہ سے ایک طرف تو دولت روز بروز نسبتاً کم تعداد لوگوں کے قبضے میں چلی جارہی تھی اور بڑی بڑی شرکتوں اور عظیم الشان کارخانوں کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا، اور دوسری جانب اسی دولت کی وجہ سے راس المال داروں کی پیٹھ بھاری اور بیچارے مزدوروں کی کم مائیگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارل مارکس نے انہیں اثرات کے تحت اپنی کتاب لکھی جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و نقائص کا انسداد صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ کی ابتدائی بنیاد (یعنی خانگی ملکیت) کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی بجائے مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ بلاشبہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے راس المال کی ضرورت ہے لیکن راس المال کی ملکیت افراد کی بجائے مملکت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیئے، جو افراد کی اجتماعی کیفیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مملکت کا مقصدِ اعظم یہ ہونا چاہیئے کہ راس المال کو محض کسی چھوٹی سی جماعت کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ تمام معاشرہ کی فلاح کی غرض سے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ مملکت کے قبضے میں آجائے گا تو مملکت ہی اُسے کام میں لائے گی، جس کی وجہ سے مقابلہ جیسے نقصان رساں عنصر کا سدِ باب ہوجائے گا، اور بجائے چند چنے ہوئے لوگوں کے تمام معاشرۂ ملکی کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہونگے۔ نہ صرف یہ بلکہ اشتراکیت کے رواج سے خود افراد

---

[۱۶] کارل مارکس "راس المال" Karl Marks: Kapital (انگریزی ترجمہ)

کی عام اخلاقی حالت بھی سدھر جائے گی اس لئے کہ وہ محض اپنی ذاتی اغراض کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ملک کے معاشری مفاد کے حصول میں کوشاں ہونگے۔ ان تمام انتظامات کے واسطے مملکت کی دست اندازی لازمی ہے، اس لئے کہ وہ افراد کی فلاح و بہبود سے خود ان سے کہیں زیادہ واقف ہوتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے حکومت کو جملہ عاملینِ پیداوار پر خاص نگرانی رکھنی پڑے گی، کارخانوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور ہر شخص کے واسطے اس کے کام کے مطابق آرام و آسائش کا انتظام کرنا پڑے گا۔

اجتماعیت۔ یہ تو ابتدائی اشتراکی نظریہ ہوا۔ لیکن پچھلے اسّی برس میں (بالخصوص جنگِ عظیم کے بعد) اس میں بہت کچھ تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں گو اب بھی ان سب کا دار و مدار کارل مارکس کے خیالات ہی پر ہے جس خیال کا سب سے زیادہ تعلق ابتدائی اصول کے ساتھ ہے وہ اجتماعیت ہے، اور اُس کے مؤید صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر ہر ملک میں بتدریج پیدا کیا جائے تا آنکہ حکومت کی کل اشتراکیوں کے قبضے میں آجائے۔ اس کے لئے مغربی یورپ کے ہر ملک میں باضابطہ اجتماعی سیاسی گروہوں کو منظم کیا گیا جن میں سے شاید سب سے پہلا گروہ جرمنی کی "انجمنِ مزدوراں" کی شکل میں نمودار ہوا جسے فرڈیننڈ لاسال نے چند سال پیشتر قائم کیا تھا، اور ۱۸۷۵ء میں آخر کار جرمانی دستوری اشتراکی گروہ کی بنیاد پڑی جس نے سولہ سال بعد یعنی ۱۸۹۱ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کیا۔[۱۴] اس پیش نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریق انقلاب پسند نہیں بلکہ حکومت میں اُس وقت تک ارتقا کا خواہاں ہے جب تک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں۔ اسی طرح انگلستان میں اشتراکی خیالات کی رہبری جارج برنارڈ شا اور فےبین سوسائٹی نے کی جس کے روح رواں مسٹر اور مسز سڈنی ویب ہیں[۱۵]۔ ان کا مطمحِ نظر یہی رہا ہے کہ ایک طرف توحتی الامکان لامرکزیت کے اصول کی ترویج کریں اور دوسری جانب جبری بیمہ، وظائفِ معمرین، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچائت اور نگرانیِ کارخانہ جات کے اصول کے ذریعے سے مداخلتِ حکومت کے دائرے کو وسیع کریں۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے اجتماعیوں کو مختلف ممالک میں لاثانی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں جمہوری جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا رہبر فریڈرش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے دوسری جانب ۱۹۲۴ء میں انگلستان کے مزدور فریق کا صدر ریمزے میکڈونلڈ

---

[۱۴] دیکھو کرکپ "تاریخ اشتراکیت" Kircup: A History of Socialism

[۱۵] ۱۹۲۹ء کے وسط میں مزدور جماعت کی جو وزارت ترتیب دی گئی اس میں سڈنی ویب کو وزیر نو آبادیات بنایا گیا اور ملکِ معظم نے انہیں بیرنی کا رتبہ اور لارڈ پاس فیلڈ کا خطاب مرحمت کیا۔

خود شاہ جارج پنجم کے ہاتھ سے قلمدانِ وزارت حاصل کرتا ہے[۵۱]۔

اشتمالیت۔ اشتراکیت کا آخری اور سب سے اہم پیرایہ وہ ہے جسے اشتمالیت کا لقب دیا جاتا ہے، اور جس نے روس میں بولشویت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بولشویت پر اس وقت بحث نہیں کی جائے گی بلکہ اس مخصوص طرزِ حکومت پر سیاسی فریق بندی کے سلسلے میں آئندہ غور کیا جائے گا؛ اس وقت صرف اس کے بنیادی اصول یعنی اشتمالیت کو بنظرِ غائر دیکھنا ہے۔ اجتماعیت کی طرح اشتمالیت کے پیرو بھی ایک مخصوص طرزِ کار کے ذریعہ سے اپنے مقصد کے حصول کے خواہاں ہیں۔ جس طرح اجتماعیت پسند محض ارتقا کے ذریعے سے اشتراکی کیفیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکی مقاصد کا حصول انقلاب اور طبقہ واری جنگ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے آج دنیا کے اصل واروں اور سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد کو اس درجہ مضبوط کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں ملائمت سے راہِ راست پر نہیں آ سکتے۔ ابتدائی اشتمالیوں میں جرمانی سیاسی فلسفی اینگلس کا نام نہایت ممتاز ہے، لیکن جتنے بھی اشتمالی گزرے ہیں ان سب میں ممتاز ترین شخص جس نے اصول اشتمالیت کی عملی ترویج[۵۲]

---

۵۱ انگلستان کی مزدور جماعت کی حیرت انگیز سیاسی کامیابی کا اندازہ مفصلہ ذیل جدول سے ہو جائے گا۔

انتخاباتِ پارلیمنٹ سنہ وار	دار العلوم میں مزدور فریق کے ارکان	دار العوام کے انتخاب میں مزدور فریق کے رائے دہندوں کی جملہ تعداد
سنہ ۱۹۰۰ء	۲	۶۲،۷۰۰
سنہ ۱۹۰۶ء	۲۹	۳،۲۳،۲۰۰
جنوری سنہ ۱۹۱۰ء	۴۰	۵،۰۵،۷۰۰
دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء	۴۲	۳،۷۰،۸۰۰
سنہ ۱۹۱۸ء	۵۷	۲۲،۴۵،۰۰۰
سنہ ۱۹۲۲ء	۱۴۲ (وزارتِ مزدوراں)	۴۲،۳۶،۸۰۰
سنہ ۱۹۲۳ء	۱۹۱	۴۳،۴۸،۴۰۰
سنہ ۱۹۲۹ء	۲۸۸ (وزارتِ مزدوراں)	۸۳،۷۴،۲۰۰

۵۲ دیکھو مارکس و اینگلس: "اعلانِ اشتمالیین" Marks and Engels: The Communist Manifesto (Eng. Transl., Ch. Kerr, N.Y.)

ہر کے اُس کی تاریخ میں گویا چار چاند لگا دیئے ہیں۔ لینن تھا، جو ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک مسلسل روس کا آمر اعظم رہا اور جو زمانہ جدیدہ کے عظیم ترین انسانی قائدوں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ لینن کہتا ہے کہ یہ خیال محض خام ہے کہ جس طبقے کے قبضے میں صدیوں سے قوت و اقتدار رہا ہو وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے ہو سکے مزدور اور ملک کا محنتی طبقہ، جو اس وقت تک نہایت کس مپرسی کے عالم میں رہا ہے، جبراً و قہراً موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضے میں کر لے اور انہیں خود اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے کام میں لائے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ حکومت بلا شبہ محض ایک طبقہ داری جماعت پر مشتمل ہوگی اور صحیح معنی میں ملک کی قائم مقام نہیں ہوگی لیکن یہ طریقہ صرف اس لئے استعمال کیا جانا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اصل داروں کا سیاسی و معاشی اجارہ منسوخ کر دیا جائے۔ زمانہ موجودہ میں جتنی بھی بے اعتباری اور نقصِ امن نظر آتا ہے وہ سب عدمِ مساوات کی وجہ سے ہے، چنانچہ جب مکمل مساوات ہو جائے گی اور "حق بحق دار رسید" کے اصول کے تحت محنتیوں اور مزدوروں کو، جو اپنے پسینے کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، جملہ گم شدہ حقوق مل جائیں گے، تو پھر ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ ہوگی اور اس طرح گویا بنی نوعِ انسان کو سیاسی نجات حاصل ہو جائے گی۔ جبر و اکراہ کے فقدان کے ساتھ ہی معاشرہ سیاسی یعنی مملکت کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کہ اس کا اصلِ اصول اقتدارِ اعلیٰ ہے اور اُس کی ضرورت صرف اس لئے داعی ہوتی ہے کہ مختلف طبقاتِ آبادی کے مابین توازن پیدا کیا جائے؛ جب طبقہ جاتِ آبادی ہی کا خاتمہ ہو گیا تو پھر مملکت یا معاشرہ سیاسی کی کیا ضرورت باقی رہی۔ الغرض گو اشتراکیت اور انفرادیت کے مابین بعد المشرقین معلوم ہوتا ہے لیکن ان دونوں کا انتہائی نصب العین یہی ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی حاصل ہو اور کسی قسم کی بیرونی قوت یا اقتدار کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اصولِ اشتمالیت کا تعین اور ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے اس میں تغیر و تبدل ایک بین الاقوامی اشتمالی کانگریس کے ذریعے سے ہوتا رہا ہے جسے اصطلاح میں "بین الاقوامیہ" کہتے ہیں۔ اس بین الاقوامیہ نے اس وقت تک تین جوڑے بدلے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا جلسہ سوئیزرستان کے شہر بازل میں ۱۸۶۹ء میں ہوا جس میں اشتمالیوں نے باکونن اور اُس کے نراجی پیروؤں کو اپنی جماعت سے نکال دیا اور اس طرح گویا یہ اعلان کر دیا کہ مداخلت حکومت کے متعلق ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک اصولی فرق ہے، وہ یہ کہ جہاں نراجی گروہ حکومت کے وجود ہی کا مخالف ہے، وہاں دوسرا یعنی اشتمالیوں کا فریق حکومت کی مشین کو اپنے قبضے میں لا کر اس کے ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بین الاقوامیہ

۵۲؎ لینن: "انقلاب طبقہ محنتی" Lenin: The Proletarian Revolution.

کا انعقاد بلجیم کے شہر اینٹ ورپ میں ۱۸۸۹ء میں ہوا، اور اس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب بھی کارل مارکس کے اصول کی لفظی و معنوی پابندی پہلے ہی کی طرح ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس بین الاقوامیہ کا مسلک بالکلیہ ارتقائی تھا۔ اور اس میں انقلاب کو بہت ہی کم دخل تھا، لیکن اس کے انعقاد کی وجہ سے اشتراکی گروہ میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا اور مزدوروں کی انجمنوں میں تنظیم کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ برابر جنگِ عظیم تک جاری رہی۔ اس تنظیم کی وجہ سے اصل داروں اور سرمایہ داروں سے طرح طرح کی مراعات حاصل کی گئیں اور جنگِ عظیم کی ابتدا پر یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید کارل مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہو گی اور اشتراکیوں کے مقاصد محض ارتقائی اور آئینی طریقوں سے حاصل ہو جائیں گے لیکن جنگ نے اشتمالیوں میں ایک خاص تہیج پیدا کر دیا اور اس کے بعد ہی ارتقائی اور انقلابی اشتراکیوں کے مابین گویا دیوارِ آہنی حائل ہو گئی: ارتقائی گروہ تو قومی حکومتوں کے ساتھ مل گیا اور انقلابی گروہ کے افراد مختلف ممالک کے مزدوروں اور محنتیوں کو اپنا بھائی بند سمجھ کر فی نفسہٖ جنگ اور اصولِ جنگ سے متنفر ہو گئے۔ ان کے اس میلان کے باعث، ایک طرف تو ہر ملک میں ان پر تشدد ہونے لگا۔ اور دوسری جانب انہوں نے قومی حکومتوں کا ساتھ دینے سے منہ موڑ لیا۔ انہی اثرات کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں (یعنی روس کے بولشوی انقلاب کے بعد) روس کے مرکز موسکو میں تیسری بین الاقوامیہ کا انعقاد ہوا، اور اس نے وہ اعلان شائع کیا جو تمام اشتمالیوں کا نصب العین ہے، یعنی مارکس اور اینگلس کے اصول کے ساتھ ہی ساتھ اس نے آخر کار اپنے قطعی طور پر انقلاب پسند ہونے کی قرارداد منظور کر لی۔

اگر اشتراکیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ تمام دوسری غالی تحریکات کی طرح یہ بھی مغالطوں سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں تین عاملینِ پیداوار (یعنی "زمین" "محنت" اور "اصل") میں سے ایک یعنی "محنت" پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انفرادی حالات میں تو قیمت، نوعیت و مقدارِ پیداوار تقسیمِ دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کی بنا پر ہوتا ہے لیکن جب مقابلہ ہی غائب ہو جائے گا تو پھر ان کا تعین بغایت دشوار ہو جائے گا تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہو گا وہاں رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم رہے گا وہاں حب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہے گا تو افراد بے پروا ہو جائیں گے۔ ارسطاطالیس اپنے استاد حکیم افلاطون کی نظریۂ اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو اس میں وہ شرکت اور ساجھے کے کام سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتا ہے[۲۲]۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زمانۂ حال کے اشتراکی اصول

۲۲ ارسطاطالیس "سیاسیات"، ۲۲، ۳، ۲، (ترجمہ انگریزی جوئٹ) Aristotle's Politics, Transl. by Jowett

کے پیرو طبقہ داری حکومت کو محض ایک منزلِ ارتقا تصور کرتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ اچھی طرح یا بری طرح کسی طرز پر ناہمواری اور عدمِ مساوات کو مٹا کر ایسا مکمل آزاد معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مملکت یا حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو؛ اس میں اور نراج میں مطلق کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نراجی آج ہی سے مملکت اور حکومت کے خاتمے کے درپے ہیں اور اشتمالی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ روس میں اشتمالیت کی ترویج کو اب دس سال سے زیادہ گذر گئے، لیکن بجائے اس کے کہ فرد کو مملکت کے خلاف آزادی حاصل ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ مملکت کا پنجہ تقریباً اتنا ہی بلکہ شاید اس سے زیادہ مضبوط اور دور رس ہے جتنا زاریت کے عہد میں تھا اور اشتمالیت کے مقصدِ اعلیٰ کا حصول پہلے سے بھی بعید تر ہوتا جاتا ہے۔

اعتدال پسندی۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی اصول محض مجرد شکل اختیار کئے رہتا ہے اس وقت تک اس میں غالیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ عمل میں لایا جاتا ہے تو ایک قسم کے اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت انفرادیت اور اشتراکیت کی ہے۔ کاغذی دلیل و استدلال اور بحث و تمحیص کے لئے ایک طرف ہربرٹ سپنسر اور کروپوٹکن اور دوسری جانب کارل مارکس اور اینگلس کے نظریے نہایت دل خوش کن ہیں، لیکن واقعات و حالات پر انطباق کرتے ہی ان کے پیروؤں کی غالیت کا کانٹا نکال کر پھینک دینا پڑتا ہے۔ جن ممالک میں انفرادی حکومت رائج ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہبودِ عامہ و ضروریاتِ زمانہ کی خاطر مختلف شعبہ جاتِ حکومت میں اشتراکی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے اور روز بروز حکومت کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے؛ دوسری جانب روس میں، جہاں ۱۹۱۷ء سے اشتمالیت کا دور دورہ ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل اشتمالیت کے ذریعے سے ارتقا کی "موجودہ منزل" بھی اُس وقت تک طے نہیں کی جا سکتی جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دے دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی ہو یا اشتراکی، دونوں کے مابین جو فرق ہے وہ محض طرزِ کار کا ہے، اور اگر وہ اپنے وطن کی بہبود چاہتے ہیں تو موقع و محل کے اعتبار سے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی غرض سے انہیں اپنے اصول میں کمی بیشی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد متمدن ممالک کی حکومتوں نے اپنے سر یہ فرض لے لیا ہے کہ نہ صرف اسی قسم کے کاموں کو اپنے ذمہ رکھیں جیسے ڈاک اور تار، بلکہ اُن میں سے اکثر میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے، ورنہ اگر وہ خانگی شرکتوں کے ماتحت ہیں تو ان پر نگرانی رکھتی ہے۔ پھر ملک کی معاشی بہبود بھی

نظر انداز نہیں کی جا سکتی جس کے لئے بیرونی مال پر طرح طرح سے محصول لگا کر ملکی صنعت و حرفت کو مامون کیا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعے سے دنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی "انفرادی" حکومت کی دلچسپی یہیں نہیں رکتی، بلکہ خانگی امور اور خاندان تک کے معاملات میں وہ مداخلت کرتی ہے، مثلاً بعض ممالک میں لوگوں کو جبراً اپنی زندگی کا بیمہ کرانے پر مجبور کرتی ہے، غربا کو ایک خاص عمر سے تجاوز کرنے پر افلاس سے بچانے کی غرض سے ان کا وظیفہ مقرر کرتی ہے، اور مختلف کارخانوں میں ایک خاص مقدار سے زیادہ کسی کو کام نہیں کرنے دیتی۔ محنت اور مزدوری کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا اصول اس قدر مسلمہ ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام کی ابتدا ہوئی تو اُس کے عہدنامے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ "جہاں کہیں روزانہ آٹھ گھنٹے یا ہفتہ وار ۴۸ گھنٹے کی محنت کا قاعدہ مقرر نہیں ہے وہاں کی حکومت کو اس قسم کے طرزِ کار کو رواج دینا چاہئے"[۲۳]، اور اسی طرح بعض جدید دساتیر (مثلاً جرمانیہ کے دستور) میں مزدوروں کی بہبود کا خیال بہت کچھ پیش پیش نظر آتا ہے[۲۴]۔

اُدھر روس کے بولشویوں کو بھی محض مطمحی اشتمالیت کی سطح سے اترنا پڑا ہے، اور جدید معاشی طرزِ عمل کی ترویج کے بعد بہت سے انفرادی اصول کو روس میں رائج کیا گیا ہے[۲۵]۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لینن کی حیات ہی میں یہ ثابت ہوگیا تھا کہ مجرد اشتراکیت میں جو نقائص ہیں ان کے باعث روز بروز ابتری پیدا ہونا لازمی اور لابدی ہے، چنانچہ اوائل ۱۹۲۱ء ہی میں کاشتکاروں سے غلہ کی بجائے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اور مئی ۱۹۲۱ء میں لینن نے یہ اعلان کردیا کہ ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے مملکتی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔ دو ماہ بعد کارخانے اور گرینیاں کرایہ پر دی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ باضابطہ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ انفرادی اصول نے بالآخر اس قدر ترقی کی کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اراضی باضابطہ بارہ سال کے لئے پٹے پر دی جانے لگی اور بعض سونے کی کانیں بھی قدیم شرکتوں کو پٹے پر دے دی گئیں۔

الغرض اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی ملک میں وہی حکومت کامیاب ہوسکتی ہے جو اس کے حسبِ حال ہو، اور محض عقیدہ پرستی اور عملی سیاسیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ آیندہ باب میں انفرادی حکومتوں کے معمولی فرائض و اختیارات پر تبصرہ کیا جائے گا۔

ہارون خاں شروانی

---

۲۳ عہدنامۂ انجمن اقوام میں محنت کے متعلق دفعہ ۲۳ ملاحظہ کی جائے ۲۴ دستورِ جرمنی ۱۹۱۹ء باب ۱۵۷۔

۲۵ دیکھو "سالانہ رجسٹر" ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء Vide Annual Register 1920 & 1921

اصطلاحات وغیرہ

Wealth	دولت
Czarism	زاریت
Land	زمین
Switzerlad	سوئیزرستان
Political Equilibrium	سیاسی توازن
Political Party	سیاسی فریق
Company	شرکت
Consumer	صارف
Class	طبقہ
Proletariat	طبقہ اسفل
Class War	طبقہ واری جنگ
Agents of Production	عاملینِ پیداوار
Dogmatism	عقیدہ پرستی
Direct Action	عمل براہِ راست
Confederation	عہدیت
Madrid	مجریط
Group	مجموعہ
Labour	محنت
Agent	مختار
Human Society	معاشرۂ انسانی
Economic	معاشی
Competition	مقابلہ
Boycott	مقاطعہ
Anarchism	نراج
Old Age Pensions	وظائفِ معمرین
Strike	ہڑتال
Producer	آجر
Director	آمر
Trade Unions.	اتحاداتِ تجارتی
Syndicalist	اتحادی
Syndicalism	اتحادیت
Monopoly	اجارہ
Collectivism	اجتماعیت
Voluntary	اختیاری
Institutions	ادارات
Inductive	استقرائی
Socialism	اشتراکیت
Communism	اشتمالیت
Capital	اصل
Capitalist	اصل دار
Relative	اضافی
League of Nations.	انجمنِ اقوام
Individualist	انفرادی
Individualism	انفرادیت
Bolshevism	بولشویت
"The Internationale"	بین الاقوامیہ
Mercantilism	تجاریت
Distribution of Wealth	تقسیمِ دولت
Conscription	جبری بھرتی
Compulsary Insurance	جبری بیمہ
Electoral Districts	حلقہ جاتِ انتخاب
Private Property	خانگی ملکیت
Club	دائرہ

نواہائے راز

تم مونس و غمخوارِ دل و جانِ حزیں ہو — ہوتا ہے فلک مجھ سے اگر بر سرِ کیں، ہو

اُس رُخ کے تصوّر سے فراغت نہیں اک دم — تم دُور ہو آنکھوں سے مگر دل کے قریں ہو

ہر چند نہیں ربط مرے جسم کو جاں سے — تم ہی ہو مری جان، مری جان تمہیں ہو

بستے ہو مرے دل میں کم آمیز ہو پھر بھی — رہتے ہو مری آنکھ میں اور پردہ نشیں ہو

الفت ہے مرا دیں، وفا ہے مرا ایماں — تم ہی ہو مرا دیں، مرا ایمان تمہیں ہو

تم زینتِ گیتی ہو، تم آرائشِ جنّت — بے شبہ تمہیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہو

گھر گھر میں ہے چرچا مری وارفتہ دلی کا
اے کاش تمہیں بھی مری الفت کا یقیں ہو

حامد علی خاں

ڈارون

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم | ہیچ نہ معلوم شد آہ! کہ من چیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت | ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

یوں تو جس کے بدن میں روح ہے زندہ کہلاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ اگر کالبدِ خاکی اور روح کی عارضی مصاحبت ہی کا نام زندگی ہو، تو ایسی زندگی کو دور سے ہمارا اسلام! عمل ہی کی جاودانی ضیا پاشی ہے جس نے صدہا ہستیوں کو موت کی "تاریکی غفیر" میں بھی روشن سے روشن تر بنا دیا ہے! اور آج ہم نہایت احترام کے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں اور اُن کے کارناموں پہ فخر کرتے ہیں۔ جو لوگ مستقل مزاجی سے جادۂ جد وجہد پر گامزن رہتے ہیں، یقیناً کامیابی و فتح انہیں کا حق ہے "من جد وجد" پر دل سے یقین رکھنے والے ہمیشہ شادمانی و کامرانی سے دوچار ہوتے ہیں اور اپنی مساعیِ پیہم سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ عمل ہی کے خوشگوار نتائج ہیں کہ نپولین، شیکسپیر، فردوسی، غزالی، فاروق، نیوٹن، سرسید، کالیداس وغیرہ ہزاروں ہستیاں حیاتِ جاوید حاصل کر چکی ہیں۔ فی الواقع کوشش، گو اس کے نتیجے تیر بہدف نہ ہوں، ایک مستحسن شغلہ ہے۔ ڈارون نے اپنی تمام عمر علمی تحقیقات میں صرف کر دی، اپنے جدید نظریہ سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور گو سائنس کے ماہرین اس کے نظریۂ "ارتقا" کو غلط ثابت کر رہے ہیں تاہم وہ قابلِ وقعت ہے کہ اُس نے اپنی ان تھک کوششوں کی ایک درخشاں مثال قائم کر دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ عمل کے ذریعہ سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے

انگریزی مدارس کے طلبہ ڈارون اور اس کے نظریۂ ارتقا سے ضرور آشنا ہونگے آج ہم بر سبیلِ اختصار ڈارون کے حالاتِ زندگی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ڈارون ۱۲۔ فروری ۱۸۰۹ء کو بمقام شروزبری پیدا ہوا تھا۔ اس حساب سے ڈارون کو پیدا ہوئے ایک سو بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا باپ مقامِ مذکور میں طبابت کیا کرتا تھا۔ ڈارون میں جو قابلِ توصیف ذہانت اور اشتیاقِ تحصیل تھا، وہ دراصل اسے میراث میں ملا تھا۔ والد کی جانب سے وہ شہرۂ آفاق عالم اریزمس ڈارون کی اولاد میں سے تھا اور والدہ کی طرف سے اُسے جوشیا وجوڈ کی ذریات میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یوں تو علم وفن کے ہر شیدائی کو صدقِ شوق کی وجہ سے مقصد برآری میں سہولت بہم پہنچ جاتی ہے مگر قلیل وقت میں بہت کچھ

چارلس ڈارون

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

حاصل کر لینا بسا اوقات گرد و پیش کے ماحول کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے۔ اسی شاندار ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُسے اپنے علمی کارناموں کے اظہار کے لئے اور تحقیق و تفتیش کے شوق کو پروان چڑھانے کے لئے کافی مواقع بہم پہنچ گئے تھے۔ پس اس کے فطری شوق نے فطری ماحول کے زیرِ اثر دہ کر دکھایا کہ باید و شاید۔

اُس نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی قصبے میں حاصل کی۔ خوش نصیبی سے ڈارون کو قابل مصنف و لائق عالم بشپ بٹلر کا سایہ نصیب ہو گیا، بدیں سبب وہ اپنی جوانی کے تشویشناک و تغیر خیز زمانہ میں بھی جادۂ اخلاق سے نہ ہٹا۔ اس کے علاوہ بری صحبت کے زہریلے اثر سے بھی وہ مامون رہا۔ ۱۸۲۵ء میں ڈارون مزید تعلیم کے حصول کی خاطر جامعۂ ایڈنبرا میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں اس کے فاضل دادا اریزمس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈارون یہاں ۱۸۲۶ء کے آخر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں ڈارون نے اپنے فطری کمالات کا بدرجۂ اتم اظہار کر کے بہت بڑی ناموری حاصل کر لی، ۱۸۳۱ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۳۷ء میں ایم اے کا ڈپلوما نہایت سرفرازی کے ساتھ حاصل کر لیا۔ بی اے اور ایم اے کے درمیان جو مدت مدید حائل نظر آتی ہے، اسے ڈارون نے رائگاں نہیں جانے دیا، بلکہ اسی عرصہ میں اُس نے وہ اہلیت و مہارتِ تامہ بہم پہنچائی جس پر اس کی آیندہ کی حیرت انگیز و انقلاب زا شہرت و ناموری کی مستحکم عمارت بشان و جلال قائم ہوئی۔ اسی زرّیں وقت میں اُس نے علمی تحقیقات میں ایسی نمایاں جدوجہد کی کہ علمی مسائل کے عقدہائے لاینحل اس کے سامنے کھل گئے اور وہ مسرت آگین و امید افزا کوششوں کے ساتھ اپنے علمی کارناموں کی جلا میں منہمک ہو گیا۔

ڈارون کو لومڑی کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ بعض کا قول ہے کہ انہیں شکارگاہوں نے اس کی قوتِ مشاہدہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ پیش آیا: اس سال آنجہانی ملکہ وکٹوریا کا جہاز "بیگل" کپتان فٹنر رائے کی زیرِ نگرانی ساری دنیا کی سیاحت کے لئے تیار ہوا۔ کپتان موصوف نے جہاز کا ایک کمرہ اس شخص کے لئے مقرر کر دیا تھا جو ماہرِ فطرت ہو۔ بھلا ایسے موقع پر ڈارون کے سوا کون سی ہستی میدانِ مقابلہ میں آ سکتی تھی؟ جہاز مذکور ۲۷ دسمبر ۱۸۳۱ء کو انگلستان سے روانہ ہوا اور ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۶ء میں واپس آ پہنچا۔ اس عرصہ میں ڈارون نے تحقیقِ فطرت و مشاہدۂ قدرت کے شعبوں میں جو جو حیرت خیز کارنامے انجام دیئے وہی درحقیقت اسے حیاتِ جاوید بخشنے کے ذمہ دار ہوئے۔ ڈارون سے پہلے اسی غرض کی تکمیل کے لئے بہت سی سیاحتیں ہوئیں، مگر ڈارون کی انفرادی مساعی سب پر سبقت لے گئیں۔

اتنے گرانبہا تجربات حاصل کرنے کے بعد ڈارون نے ایک نہایت مفید کتاب Nationalist's Voyage Round the World لکھ کر سائنس کی دنیا میں ایک زبردست گہماگہمی پیدا کردی۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے کتاب مذکور کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں سائنس جیسے یابس مضمون کو ایسا دلکش و دلچسپ جامہ پہنایا ہے کہ ایک شوقین طالب علم ڈارون کے کمالات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں سائنس کی اصطلاحات سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے اور یہی خوبی اس کی دوسری کتابوں میں جلوہ گر ہے۔

مذکورالصدر سفر کے اہم ترین نتائج میں اول نمبر اس کے نظریۂ ارتقا کا ہے۔ پہلے پہل یہ نظریہ ڈارون کے دادا کے حاشیۂ دماغ میں رونما ہوا تھا، مگر یہ ڈارون ہی تھا جس نے اسے حدِ کمال پر پہنچا کر سائنس کے کیمپ میں ہلچل ڈال دی۔

۱۸۳۹ء میں اُس نے اپنی ماموں زاد بہن ایما ودجوڈ سے شادی کرلی اور ۱۸۴۲ء میں کینٹ میں بود و باش اختیار کی اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

اس کے اخلاق و عادات نہایت معصومانہ سادگی پر مشتمل تھے۔ ان میں ایسا جادو بھرا تھا کہ ہر کس و ناکس اس کا گرویدہ نظر آتا تھا۔ اس کی رفتار، خیالات اور گفتگو میں لطافت، نفاست، حیا اور پاکیزگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ باوجودیکہ وہ عالمِ متبحر تھا، اسے اپنے فضل و کمال کا ذرہ برابر بھی گھمنڈ نہ تھا اور در اصل انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس نے ہر شخص کا دل موہ لیا تھا۔ ڈارون ہر ایک کی بات بخندہ پیشانی سنتا اور ہر ایک کی امداد کے لئے تیار ہوجاتا تھا۔

باوجودیکہ ڈارون کا نظریہ غلط ثابت کیا جا رہا ہے، اس کے نظریہ نے تحقیقات و تفتیشات کا راستہ صاف کردیا ہے اور سائنس کے متعدد اہم اور دقیق مسائل کو حل کرکے صدہا عوائق کا سدباب کردیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس پر ڈارون کی تحقیقات کا اثر نہ پڑا ہو: مذہب، اخلاق، تعلیم، قانون وغیرہ۔ ڈارون کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا ہے، جہاں اس کے نام لیواؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ڈارون آج دنیا میں نہیں ہے، مگر اس کے کارنامے زندہ ہیں اور ایک رعب پاش صدا کے ساتھ نغمہ سرا ہیں کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

وحید
اکبرآبادی

تم میرے دل میں ہو

وہ پہاڑوں پر زعفران کے مہکتے ہوئے کھیتوں کے پاس رہا کرتی تھی ——— اُس کی جھونپڑی کے نزدیک ایک چھوٹی سی ندی متبسم نغمہ پیدا کرتی، ——— اور قدیم درختوں کے سایہ میں سے گذر کر بہتی تھی۔ عورتیں وہاں اپنے مٹکے پانی سے بھرنے آتیں، اور مسافر وہاں بیٹھ کر سستاتے۔ وہ ندی کے نغموں کے ساتھ سُر ملاتی، اور اس کی ہم آہنگی میں محوِ خواب ہو جاتی،

ایک شام اجنبی برف آلود چوٹیوں میں سے گزر کر آیا۔ اس کے لمبے لمبے بال مست سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوتے تھے ——— ہم نے تعجب سے پوچھا "تم کون ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا ——— وہ پُرشور ندی کے کنارے بیٹھ گیا اور خاموشی سے اُس کی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے دل خوف و ہراس سے کانپ اُٹھے ——— اور جب رات کی تاریکی نے چمکدار برف کے تودوں کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا، تو ہم اپنے اپنے گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن جب علی الصباح عورتیں دیودار کے درختوں میں سے بہنے والی ندی پر پانی بھرنے آئیں، تو اس کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا ——— مگر اس کی قمری کی مانند شیریں آواز جا چکی تھی اور اس کا روشن چہرہ کہیں بھی نہ تھا۔ اُس کی خالی بالٹی ایک کونے میں رکھی تھی، اور اس کا چراغ ایک طاق میں پڑا دم توڑ رہا تھا ——— کوئی نہیں جانتا کہ صبح ہونے سے قبل وہ اجنبی کے ساتھ کہاں چلی گئی تھی۔

جیٹھ کا مہینہ آ گیا ——— سورج تیز ہو گیا اور برف پگھلنے لگی۔ ہم چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور روتے رہے، ہم نے کہا "آہ! کیا کوئی ایسا ہی چشمہ اُس سرزمین میں بھی ہے جہاں وہ چلی گئی ہے اور جہاں وہ اپنے خالی برتن سرد اور پاک پانی سے بھر سکتی ہے؟" ہم نے ایک دوسرے سے مایوسی کے لہجہ میں پوچھا "کیا ان پہاڑوں سے پرے بھی کوئی دنیا ہے؟"

گرمی کی رات تھی، ٹھنڈی ہوا جنوب کی طرف سے آ رہی تھی؛ میں اس کی کٹیا میں بیٹھا اس کے بے جلے چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک میرے سامنے سے پہاڑ کپڑے کے پردوں کی طرح اٹھ گئے ——— آہ یہ تو وہی چلی آ رہی ہے ——— "میری بچی تم اچھی تو ہو؟ ——— مگر تم اس کھلے ہوئے آسمان کے نیچے سوتی کہاں ہو گی؟ اور آہ! ہماری ندی اب تمہاری پیاس نہیں بجھا سکتی"

"یہاں وہی آسمان ہے" اُس نے کہا "صرف یہاں اس کو محبوس کرنے کے لئے پہاڑوں کے سلسلے نہیں ہیں۔ یہاں وہی ندی ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بڑھ کر دریا بن گئی ہے۔ زمین بھی وہی ہے صرف پھیل کر میدان ہو گئی ہے"

"وہاں سب کچھ ہے بس ہم نہیں ہیں" میں نے آہ بھر کر کہا۔ وہ ایک غمزدہ طرز سے مسکرائی "تم میرے دل میں ہو" ——— میں چونک کر جاگ اٹھا ندی کی آواز اور دیودار کے درختوں کی سرسراہٹ میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

(ترجمہ)

معین الحق حقی

زیتا

زندگی کی ناقابلِ ملامت جفاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ چاء پیو، کیک کھاؤ اور ہاں میں ہاں ملاؤ۔ یہ ایک مذہب ہے اور اس کی نماز یہ ہے کہ چار گول کمرے میں (چاہے وہ چوکھونٹا ہی کیوں نہ ہو) پی جائے اور اُس وقت کا بے تابی سے انتظار کیا جائے جب اس نماز کی امام مسکرا کر پوچھے کہ مصری کی ڈلیاں ایک کہ دو؟

جو لوگ اس مذہب کے پکے نمازی ہیں انہیں شاید ایک جماعت کی سوانح عمری کے ایک جزو میں کچھ دلچسپی ہو۔ وہ سوانح عمری یہ ہے۔

ایک کمرے میں چاء تھی، میزیں تھیں، سامانِ آرائش بہتر سے بہتر، چند لیڈیز، ایک پرکالۂ لیاقت زیتا اور کچھ غیر ضروری بھتنے۔ بھتنوں کو معاشرتی اصطلاح میں جنٹلمین کہا جاتا ہے مگر ایک کی نکٹائی گریزاں تھی (آپ امان اللہ کے مداحوں میں سے تھے) ایک حضرت کے استرے اور ٹھوڑی میں روزانہ ناتمام محبت کے آثار نمایاں تھے۔ ایک نوخیز شباب کے نشے سے لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک کاہل الوجود کو سفید بالوں کے لئے سیاہ بوٹ پالش میسر نہ ہوا تھا۔ غرض یہ کہ ان بھتنوں کو جنٹلمین کہنا اس لفظ کی آبرو کھونا ہے مگر چونکہ جنٹلمینوں کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی یہ تھے اور ضرور تھے۔ یہ تھا وہ مجمع یا جماعت جس میں ایک شخص نے زیتا کی لیاقت سے تنگ آکر اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ "کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا"

زیتا نے اُس وقت تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص کیا لکھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میری زبان ماسکو کو سبق آموز ہے یا یہ کہ میرے جذبات میرے ماحول سے ایک صدی مستقبلانہ ہیں یا یہ کہ میں اسی کم سنی میں زندگی کے بہترین انعاموں کو پرکھ کر رد کر چکی ہوں! لکھ دے، ایک دفعہ نہیں بلا سے سو دفعہ لکھ دے۔ اول تو کوئی شائع نہیں کرے گا اور کرے گا تو پڑھنے والے کیا خاک سمجھیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے زیتا نے اس گفتگو کو دل سے محو کر دیا۔

(۲)

جس شخص نے زیتا کو مذاق مذاق میں یوں دھمکایا تھا اُس کا اس وقت تک تو خیال صرف یہ تھا کہ گول کمرے کی چلتی چلاتی باتوں میں زیتا کے علمی تیر و تفنگ بے محل ہیں۔ اس لیاقت کی پتلی کو چاہیئے کہ اپنے ہم پلہ

کسی پروفیسر سے بحث کرے۔ خواہ مخواہ ہم واجبی واجبی پڑھے لکھوں سے سر پل پڑا کرے مگر بعد میں جب اُس نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ معجزہ جس کا نام زینیا ہے تنقید سے بالاتر ہے۔ اگر ہندوستان کے نصیب نیک ہیں تو یہ کراماتی شعلہ بھبھوکا ہزاروں دقیانوسی اوہام کو خاک سیاہ کردے گا۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر یہ شخص بھی اس گفتگو کو بھول گیا۔

(۳)

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے بھی یہ دھمکی سنی۔ اس کا لطف بھی اٹھایا مگر عمیق ندیوں میں زمانہ کی ہوائیں شور نہیں پیدا کرسکتیں۔

اوروں کو زینیا سے صرف محبت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو زینیا سے عشق ہے اور ان کی دنیا بھر کی اچھی خواہشیں زینیا کے لئے وقف ہیں۔ وہ زینیا کی لیاقت پر نازاں بھی ہیں اور اس سے ترساں بھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں کہ کاش زینیا کی لیاقت بجائے شعلہ بن کر بھڑکنے کے پھول بن کر کھلے۔ یہ دعا مانگ کر وہ بھی اس بات کو بھول گئیں۔

(۴)

گول کمرے میں (جیسا گول کمروں کی زندگی کا تقاضا ہے) دھیمی دھیمی سے آوازیں سنائی دیں کہ آؤ تاش کھیلیں میز کھسکنے لگے، کرسیاں وقار سے جمنے لگیں، بکس میں سے تاش نکلے۔ اِدھر اُدھر سے پتے تراشنے کے لئے ہاتھ بڑھے اور جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ کون کس کا آڑی ہو تو پتوں کی تقسیم کی طیاری ہوئی۔

(۵)

پتوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر تین فرشتے (وہ سماوی مہمان جو مسلمان گھروں میں اب تک آتے جاتے رہتے ہیں) گول کمرے سے نکل کر باہر چمن میں گلگشت کرنے لگے (مسلمان فرشتوں کو اب تک تاش کے پتوں سے نفرت ہے) اور یوں باتیں کرنے لگے۔

ایک فرشتہ۔ تم نے زینیا کی بے نیازی ملاحظہ کی؟ یوں سمجھتی ہے گویا زندگی کی تمام طاقتوں پر حکمران ہونا اور رہنا اس کے اپنے بس کی بات ہے۔

دوسرا فرشتہ۔ ہاں اور ۔ ۔ ۔ کی زیر لب دعا سنی؟ بچاری یہ تصور کئے بیٹھی ہیں کہ نیک ہونا، ہمدرد خدمت گذار ہونا گویا قسمت کو خرید لینا ہے۔

تیسرا۔ اور اس خود پرست کو نہ دیکھا ؟ عجب انسان ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بات کی ماہیت کو سمجھ لینا گویا افعال پر حاوی ہونا ہے۔

دوسرا۔ سچ پوچھو تو وہ بچارا سب سے زیادہ قابل رحم ہے سمجھ اس میں ہے مگر قدرت نہیں۔ اس کے سارے جسم میں صرف آنکھیں تعلیم یافتہ ہیں اور جدھر وہ چل نکلیں وہیں حضرت کا دل و دماغ بھی حاضر ہے۔ ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ماہر حسن ہوں۔

پہلا۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم زینا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیا ہمیں مدد کرنی چاہئے؟

دوسرا۔ ہاں ضرور کرنی چاہئے۔

تیسرا۔ اچھا میں یہ کروں گا کہ وہ سو رہی ہو گی تو میں چپکے سے اس کی روح کو شفق کی ندی میں دھولاؤں گا بہتر سے بہتر گلرنگ روح میں اُسے لپیٹ دوں گا۔

پہلا۔ شاباش، مگر دوست کیا تمہیں بنی آدم کی اس حماقت پر ہنسی نہیں آتی کہ سب کے سب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ روح انسان کے اندر ہوتی ہے عجب الو ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسم روح کا جامہ نہیں بلکہ روح جسم کا جامہ ہے میلے ہاتھوں، ناپاک نگاہوں سے اس لباس کو چاک کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ روح تو اندر ہے اور مامون ہے۔

دوسرا۔ پھر تم نے وہی انسانوں پر تنقید شروع کی، یہ کہو کہ زینا کے لئے تم کیا کرو گے؟

پہلا۔ دوست کچھ سمجھ میں نہیں آتا کسی انسان کی مدد کرنا عذاب خریدنا ہے۔ انسان کو تو اگر خدائی دے دو تو اسے بھی خوار کر دے گا۔

تیسرا۔ اب تم باتیں نہ بناؤ۔ یا تو ہمارے ساتھ نہ آنا تھا یا آئے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ خود ہی تو تم نے مدد کا سوال نکالا تھا۔

پہلا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری زینا کی نسبت اتنی بلند رائے ہے کہ میں اسے لیاقت اور نیکی کے زہر سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ میں اسے شک دے دوں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خوشی کے موقع پر بھی وہ شک سے آزاد نہ ہو۔ کبھی کبھی خود اپنے آپ پر شک کرنے لگے۔ اپنے شک پر شک کرنے لگے۔ اس قسم کے اضطراب اور کشمکش میں گرفتار رہے کہ یہی کشاکش اُس کا نغمہ ہو۔ موسیقی زندگی کا بہترین عکس ہے دیکھے بعد دیگرے سروں کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرنا اس فوری زیست و موت کے سلسلۂ متلاطم کا نام راگ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زینا کے شکوک کا ایک دوسرے کو قتل کر کے پھر پیدا ہوتے رہنا اس انداز سے ہو کہ میرا دیا ہوا شک وہ گز ہو جو زینا کی دلربا سے ناز کے سُر پیدا کرتا ہے۔

دوسرا۔ تم اسے شک دو گے تو میں اسے امید کی توسِ قزح دوں گا۔ اس میں جھول جھول کر وہ تمہارے تمام شکوک کو پھینک دے گی۔

(ایک افسر فرشتہ آتا ہے اور گہری آواز میں کہتا ہے کیا تم لونڈوں کا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا؟ کچھ کام بھی کرو گے یا یونہی دن عید رات شب برات! سب فرشتے چلنے لگتے ہیں)

(۶)

گول کمرے میں تاش کا کھیل ختم ہوا۔ وہ شخص جس نے زیبا کو دھمکایا تھا کہ کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا عین اس وقت باہر نکلا جب کہ فرشتے چلنے پر تیار تھے۔ پھولوں میں عجب طرح کی خوشبو تھی۔ ان کا رنگ بھی کچھ نرالا تھا۔ یہ شخص کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا مگر ایک بڑے سے پھول کے پاس جا کر انتہائے آرزو سے کہنے لگا، "زیبا کے لئے یہ کچھ، اور میرے لئے؟" پھول نے مسکرا سا دیا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ مانگنے کے قابل تو بنو۔

فلک پیما

یادگار

نغمہ ــــ جب مدہم سُر ختم ہو جاتے ہیں،
حافظہ کی گود میں جھولتا رہتا ہے۔
خوشبوئیں ــــ جب کہ خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں،
حسیات میں پنہاں زندہ رہتی ہیں۔

گلاب کی پنکھڑیاں ــــ جب کہ گلاب کملا جاتا ہے،
محبوب کی آرام گاہ پر برسا دی جاتی ہیں۔
اسی طرح ــــ تیرے تصور میں جب کہ تو یہاں سے چلی جائے گی،
میری محبت ہمیشہ سوتی رہے گی۔

(شیلی)

محسن عبداللہ

یعنی میں؟

ساون میں ایک دن باہر جانے لگا تو ترشح ہو رہا تھا۔ کہا چھتری لیتا چلوں۔ ساون کا کیا اعتبار نہ جانے یہ تقاطر کب موسلا دھار بارش بن جائے۔ لپک کر گیا، تو کھونٹی سے ایک چھوڑ پانچ لٹک رہی تھیں مگر سب کی سب مرمت کے قابل۔ میں نے کہا لیے چلوں گلے ہاتھوں مرمت ہو جائے۔ چنانچہ پانچوں کو بغل میں داب چل پڑا۔ ایک قدم ڈیوڑھی کے اندر اور ایک باہر تھا۔ آواز آئی، اور میں انہیں قدموں پر ٹھیر گیا +

"اچھی! یہ نگوڑی چھتریاں کہاں جا رہی ہیں آج"

"یونہی خیال آیا ذرا مرمت ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ نہیں تو"

"خیر یہ تم جانو۔ مجھے شام کو چھتری چاہیئے۔ یہ دھیان رہے"

اس گفتگو نے چھتریوں کے مضمون کو میرے دل پر نقش کر دیا۔ اس لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں انہیں مشترکاً یا منفرداً حسبِ معمول کہیں بھول جاتا یا انہیں لوہار کی دوکان سے لانا کسی اور دن پر اٹھا رکھتا۔ میں نے لوہار سے صاف کہہ دیا کہ شام کو لوٹتے وقت میں چھتریاں ضرور لے جاؤں گا۔ اور جو اس میں تساہل ہوا تو جو مجھ سے ہو گا اس سے زیادہ کر گزروں گا +

پھرتے گھومتے دوپہر ہو گئی مگر بارش کا تار نہ ٹوٹا۔ ویسی ہی رم جھم برس رہی تھی۔ اور پھر مجھے چھتریوں کا خیال آیا۔ نزدیک ہی ایک قہوہ خانہ تھا وہاں گیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔ یوں ہی سی دیر ہوئی تھی کہ ایک دوشیزہ آئی اور میرے بالمقابل اسی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ ہنوز کھا رہی تھی کہ میں بل ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں ٹھیر گیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ جو چھتری میرے ہاتھ میں ہے وہ اُس کی ہے۔ ندامت سی ندامت۔ پسینہ چھوٹ گیا۔ باچھیں کھلانا، دانت نکالنا۔ آئیں بائیں شائیں کرنا، غرض خفت آمیز معذرت کے جملہ لوازم بجا لا کر میں ہوٹل سے نکلا +

اس حادثہ نے چھتریوں کے بارے میں اُن کی تاکید کو تازہ کر دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا، مگر چھتری شام سے پہلے پہنچانے کا کچھ ایسا دھڑکا لگا تھا کہ باقی سب کام چھوڑ کر لوہار کی دوکان پر جا بیٹھا۔ اور اٹھا تو

چھتریاں لے کر اٹھا۔ ایک اخبار خریدا اور ٹریم میں بیٹھ کر ایسا محو ہوا کہ گرد و پیش کی خبر نہ رہی۔ مگر پھر بھی میرا ایک ہاتھ چھتریوں کے گٹھے پر پڑا تھا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اخبار سے اپنا سر نکال کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہوٹل والی نیک بخت میرے سامنے والی نشست پر "حاضر و ناظر" تھی۔ اس کے چہرے کے عرض و طول پر ایک لبسیط تبسم رقص کر رہا تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رازدارانہ انداز سے کہا "آج کس کا منہ دیکھ کر نکلے تھے، خوب مال مارا ہے" سوا اس کے کہ ایک آنکھ سے چھتریوں کو دیکھتا اور دوسری سے اس کافرہ کو اور فرمائیے میں کیا کر سکتا تھا۔ کتنا جان کش خیال ہے۔ توبہ توبہ۔

یعنی میں ....؟

ڈرامی

نغمۂ محبت

(۱)

اور میں نے کہا ——— میرے اعضا ضعیف تھے
اور میں نے کہا ——— میرا خون سرد تھا
اور میں نے کہا ——— میرا دل افسردہ تھا
اور میں نے کہا ——— میرے جذبات خفتہ تھے
اور میں نغمۂ محبت نہ چھیڑ سکتا تھا۔ اور میں محبت کا نام بھی نہ لے سکتا تھا
اور میں اپنے بربط کے تاروں میں محبت کے راگ نہ بجا سکتا تھا۔

(۲)

امن و صلح کے وقت محبت چرواہے کی بانسری میں سمائی رہتی ہے
جنگ کے وقت محبت دلیر اور بہادر سردار کے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے
خوشیوں کے وقت محبت بیش بہا ملبوسات اور زیورات میں آراستہ باغوں اور محلوں میں نظر آتی ہے
محبت عدالت، فوج اور قبرستان پر حکومت کرتی ہے
محبت نیچے انسانوں پر حکمران ہے اور اوپر اولیا اور انبیا پر
کیونکہ محبت فردوس ہے اور فردوس محبت۔

(ترجمہ)

محشر عابدی

تجلّیات

طبعِ نازک کسی کی ہو نہ ملول ۔۔۔ شکوۂ غم کو دے نہ اے دلِ طول

حُسن ہے اور تغافلِ بسیار ۔۔۔ عشق ہے اور جنونِ حُسنِ قبول

جانے لے جا کے کس جگہ مارے ۔۔۔ مجھ کو گم کردہ راہ شوقِ فضول

ہر دو عالم ہیں ہیچ میرے لئے ۔۔۔ ہوں محبت میں اس قدر مشغول

ہے متاعِ وفا مری ناقص ۔۔۔ پھر بھی کرلے جو تیرا لُطف قبول

واعظوں کی یہ ہرزہ گفتاری ۔۔۔ ناصحوں کی یہ پندِ نامعقول

ق

مجھ پہ کوئی اثر نہیں کرتی ۔۔۔ کہ محبّت ہے میرا اصلِ اصول

نغمۂ گل طرازِ اکبرؔ سے

ہیں بساطِ سخن پہ پھول ہی پھول

اکبرؔ
سروری لکھنوی

دمِ واپسیں

یک جا اُن دونوں کی عمر ایک سو پچاس برس تھی۔ اُن کی الگ الگ عمریں؟ اُن میں سے ایک کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مدت ہوئی انہوں نے اپنی عمروں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اب وہ بلا تکلف ہر سال اپنی مشترکہ عمر میں دو برس بڑھا دیا کرتے تھے۔

اُس پست سے دیہاتی مکان میں جس کی چھت کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلتی ہوئی دیواروں سے آگے بڑھ گئی تھی انہیں رہتے ہوئے کتنے ہی دن، کتنے ہی موسم اور کتنے ہی سال ہو گئے تھے۔ اگر آج ان سے کوئی کہتا کہ تم ہمیشہ سے میاں بیوی نہیں تھے تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ جاتے۔ اُن کے چہروں پر ایامِ گذشتہ کی ایک ہلکی سی جھلک باقی تھی اور اُن کی شکلوں میں بہن بھائیوں سے بڑھ کر مشابہت تھی۔ جب گاؤں کے لوگ اُن کے اس درجہ ضعف کے باوجود اُن کی اس قدر شدید والہیت کو دیکھتے تھے تو وہ یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ عنقریب جب اُن میں سے ایک اس دنیا سے چل بسا تو دوسرے کے لئے یہاں کی تنہائی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔

دونوں بوڑھی جانوں کے لئے موسمِ سرما نامہربان ثابت ہوا۔ اُس نے اُن کے حلقوم پر ذرا درشتی سے ہاتھ ڈالا، اُن کی کمر کو کسی قدر توڑ دیا اور اُن کے گالوں میں گڑھے ڈال دیئے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا پردہ دیکھنے لگا اور وہ غنودگی کے حملوں کا شکار ہونے لگی۔ جب بہار آئی تو چھاؤں کی فرحت انہیں کم محسوس ہونے لگی اور دھوپ کی شگفتگی انہیں بے کیف نظر آنے لگی۔ زندگی اُن کے لئے ایک بارِ گراں ہو گئی۔ صبح سے شام کرنا ایک جاں کاہ مشقت سے کم نہ رہا۔

ایک دن جب وہ روزِ گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ مضمحل ہو کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اُس کی بیوی خرگوشوں کے لئے گھاس لانے کے لئے باہر نکلی۔ جونہی کہ اُس نے جنگلے کے پھاٹک کو طے کیا اُس کے سانس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی پھر وہ آگے بڑھی۔ اُس مقام سے جہاں وہ ایک شریف بچے کی طرح بیٹھا تھا بڈھے کی دھندلی آنکھیں اپنی بیوی کو نہ دیکھ سکیں مگر اُس نے اُس کے قدموں کی آواز سن لی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ اپنے تصور میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ لے۔

جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اُس نے اپنی آنکھیں ایک دفعہ زور سے کھولیں اور پھر یک لخت گر پڑی اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ایک راہرو آکر وہاں ٹھہر گیا، ایک لڑکی اچھلتی کودتی پاس آ کھڑی ہوئی۔ پہلے ایک اور پھر ایک اور عورت آئی لوگ اُٹھا کر اُسے ایک

ن میں لے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہ مر چکی ہے۔
گھر خالی ہو گئے۔ دوکان اور اُس کے اطراف پر سوادِ ہجوم چھا گیا تین کرسیاں جوڑ کر بڑھیا کو ان پر لٹا دیا گیا۔ اُس کا زرد اور
ے بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر آ رہا تھا۔
کسی نے کہا "بڈھے کو ضرور بتا دینا چاہئے۔"
ایک اور آواز آئی "نہیں! اُسے نہیں، پہلے اُس کی بہو کو بتانا چاہئے۔ وہ سامنے کھڑی ہے۔ او مارگیرٹ!"
وہ آگئی، بدصورت اور باولی سی۔ اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے اُس کا ڈھیلا لباس لٹک رہا تھا اور اس کے رخسار
ر زرد کھمبی وٹی کی طرح بے رونق تھے۔ وہ دھوبن تھی اور پانی کے اثر سے اُس کے اُبھرے ہوئے ہاتھ دو بنفچوں کی طرح لٹک رہے تھے۔
جب اُس نے اپنے اُس شوہر کی ماں کی نعش کو دیکھا جسے مرے اب ایک زمانہ گزر چکا تھا اور جسے اب وہ تقریباً بھول چکی تھی تو وہ سر
، پاؤں تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو گئے اور اُس کے چوڑے چکلے چہرے میں اُس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں اُس
ناک کو سکوڑتے ہوئے اپنی آستین سے اُسے پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ! اس کا بیچارہ خاوند!"
کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہجوم کی طرف مڑی اور کہنے لگی "بڑھیا کی موت کی خبر اُسے کوئی نہ سنائے
اُسے خود بتاؤں گی۔" اور اُس نے اپنے چہرے کو ایک ملتجیانہ انداز سے حرکت دی۔
اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگوں نے جانا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سارا مجمع منتشر ہو گیا۔
مارگیرٹ نعش کو اٹھوا کر اپنے بستر پر لے گئی۔ پھر جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے بڈھے کے پاس پہنچی۔ اپنے گھر کے سامنے
ت کی اُسی پرنما افزائش کے نیچے وہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔
لکڑی کا پھاٹک کھلا تو اُس کی آواز سے چونک کر اُس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔
مارگیرٹ نے کہا "میں ہوں بابا!" وہ پھر ایک بت کی طرح بے حرکت ہو گیا "آؤ اب گھر چلنے کا وقت ہے۔"
اُس نے ایک آہ کی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک آہ کی۔ اُس نے ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلا کر ہلانا شروع کیا۔ اُس کے
رے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔
مارگیرٹ نے کہا۔ "کیوں کیا ہے بابا؟"
اُس نے جواب دیا "مجھے نظر نہیں آتا، مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی!"
"آہ!" مارگیرٹ نے کہا۔ اور بلاشبہ یہ اُس کی روح کی سادگی تھی جس نے اُسے اتنے بڑے بڑے حادثوں کے لئے تیار کر دیا، کہ اس
کی زبان سے اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا جس کی آنکھیں اپنے ازلی رفیق کے چھپ جانے
کے بعد اب دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔

اپنے پاؤں کو گھسیٹتا ہوا وہ نعمت خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک کرسی کی پشت کو چھوا اور اس پر بیٹھ گیا، مگر اس کی سانس سختی سے چل رہی تھی۔ وہ آہیں بھرتا کراہتا اور جونہی وہ اُسے بتانے کے لئے منہ کھولتی وہ چلّانے لگتا۔

"یہ اب بس ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں! آہ ابھی یہ دکھ باقی تھا!"

گھنٹوں تک وہ غم والم میں ڈوبا رہا۔

ایک لمحہ کے لئے جب اسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا "وہ کہاں گئی؛ خدا کے لئے، وہ کیا کر رہی ہے؟" تالم کے دوا دورعلول کے درمیان مارگیرٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ شکایتیں کرنے لگا۔ اتنے میں پھر ایک حملہ ہوا۔

بہت سے لوگ آئے بعض اندر پہنچے اور بعض کھڑکیوں ہی میں سے دیکھ کر چلے گئے مگر کسی کو اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سارا دن یوں ہی گزر گیا اور یہ جاں کاہ خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اب کسی کو اُس کے قریب آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

وقتاً فوقتاً مارگیرٹ اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کو صاف کرتی ہوئی اُٹھ دوڑتی۔ وہ بار بار بڑھیا کو دیکھنے کے لئے جاتی تھی جو باوجود دو شمعوں کی روشنی کے رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر وہ تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئی۔ ہر طرف اُس کا خیال تھا۔ وہ تھک کر چُور ہو رہی تھی مگر برابر بھاگ دوڑ میں مصروف تھی۔ وہ دلیرانہ مصیبت کا مقابلہ کر رہی تھی اور اُس کی شدت سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جو مجسم سوگ تھی۔ وہ جسے پس ماندگی کی اب عادت ہو چکی تھی!

شام اور رات کے درمیان وہ ایک مرتبہ پھر اُس کے پاس پہنچی۔ اب اُس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ مارگیرٹ نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلا کر انگیٹھی پر رکھا اور دل میں سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے بتا دیا جائے کہ وہ جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتی تھی آج تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ نحیف و ناتواں کانپتی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سر اس طرح جھک رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی جرم پر نادم ہو۔ اُس نے اپنی ساری قوت کو یوں مجتمع کیا جیسے وہ چلّانے لگی ہے مگر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی اور اُس نے کہا "وہ اب کبھی ——— واپس نہ آئے گی ——— کبھی نہیں ——— وہ چلی گئی"

بڈھا خاموش رہا۔ مارگیرٹ نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا ——— اور سو رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی اور نہایت احتیاط سے کمرے کی اشیا کو درست کرنے لگی۔ یکایک بڈھے نے حرکت کی اور اُس کو بلایا۔ وہ اُس کے اس قدر قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

سنو میری بیٹی" اُس نے کہا "یہاں آؤ اور سنو۔ وہ واپس آگئی ہے۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے اُسے ابھی وہاں دیکھا ہے جہاں اس وقت تم کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا اور یکایک مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہیں ہے۔ اُس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب دیا اور پھر چلی گئی۔ میں جان بوجھ کر بے حرکت اور خاموش ہو رہا۔ سنو، میں نہیں چاہتا اُسے معلوم ہو کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں نہیں چاہتا —— اس سے اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ اُسے اُس وقت تک مجھ سے دور رکھو جب تک میں پھر اچھا نہ ہو جاؤں۔ کسی تدبیر سے، میری بیٹی"۔

اُس نے ذرا پہلو بدلا تو پرانی کرسی میں سے کراہنے کی سی آواز اٹھی۔

"اُسے لے جاؤ۔ ایک یا اگر ضرورت ہو تو ایک سے زیادہ دنوں کے لئے اسے کہیں لے جاؤ اُس سے کہو —— اُسے لے جاؤ"

"اچھا بابا، میں اُسے لے جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں اُسے تمہاری بیماری کا علم نہ ہوگا —— میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں اُسے علم نہ ہوگا"

بڈھے آدمی پر قسم کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے کہا "تو بہت اچھی لڑکی ہے"۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن مارگیرٹ نے ایک جھوٹی کہانی بنا کر سنا دی کہ بڑھیا کو اُس کے رشتہ دار اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں پہلے وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس نے بات ختم کرلی تو وہ کہنے لگا "مگر وہ پھر واپس آگئی ہے۔ گزشتہ شب میں نے سوتے میں اُس کی آواز سنی تھی"۔

مارگیرٹ نے نرمی سے کہا "ہاں ہاں وہ آگئی تھی"۔

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے بعد دوسرے دن جب ڈاکٹر بوڑھے وکٹر کو دیکھنے آیا تو اُس نے خلافِ توقع کہا کہ "حالت بہت اچھی ہے۔ بخار تقریباً اتر چکا ہے اور گرمی کم ہو رہی ہے۔ کل وہ دیکھنے لگے گا"۔

وہ مخبوط الحواس ہو کر ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ کل —— کل ——"

اپنی تاریک روح کی گہرائی میں مارگیرٹ نے بھی ایک مرتبہ اس لفظ کو دہرایا "کل"!

کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، اور پھر آنکھوں کے ہوتے ہوتے بھی وہ اُسے نہ دیکھ سکے گا! کل مارگیرٹ کے دل میں اپنی خاموشی پر اُس کے اُس بوڑھے رشتے کو بھی ایک جھٹکا لگے گا جو شاید اُس کے بول اُٹھنے پر بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔ یہی زندگی کا قانون ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک کل ایسی آتی ہے جس کا انجام بخیر نہیں ہوتا، اور امن اور امید کی وہ صبح جو کبھی کسی ایک کو حاصل ہوتی ہے ہمیشہ کسی دوسرے کے لئے شام کا پیغام لاتی ہے۔

منصور احمد

(ترجمہ)

غزل

مجھ سے حالِ دلِ فگار نہ پوچھ
سختیٔ جورِ روزگار نہ پوچھ

غرق ہے کیف میں جہانِ وفا
بیخودی ہائے انتظار نہ پوچھ

کیا ستم ڈھا رہی ہی رندوں پر
مستیٔ ابرِ نو بہار نہ پوچھ

رنگِ ناکامیٔ مراد نہ دیکھ
بے کسی ہائے بے شمار نہ پوچھ

دل میں اک حشرِ آرزو ہے بپا
شوخیٔ حسنِ فتنہ کار نہ پوچھ

کیوں کسی کو کسی کی باتوں پر
آہی جاتا ہے اعتبار نہ پوچھ

جی بھر آتا ہے حالِ دل کہتے
مجھ سے مضطرؔ تو بار بار نہ پوچھ

رام رتن مضطرؔ

پُراسرار قیدی

(۱)

قیدی جس وقت کٹہرے کے پیچھے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تو تمام عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اُس نے مقدمہ کی پیروی شروع کر دی۔

وہ ایک نحیف الجثہ آدمی تھا، جس کی بے رونق آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور زرد چہرہ اس کے جذباتِ غم کی پوری ترجمانی کر رہا تھا، مقدمہ کی سماعت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص کبھی صوفیوں کے مقدس گروہ میں شامل تھا مگر ایک سخت جرم کے ارتکاب کی وجہ سے اسے یہ زندگی ترک کرنی پڑی۔ قیدی پانچ دن سے اپنے مقدمہ کی پیروی کر رہا تھا اور اس دوران میں اُس نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تعلیم کا کافی ثبوت دیا تھا۔

اُس کے لئے یہ معاملہ موت اور زیست کا معاملہ تھا مگر اس کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے خلاف ثبوت دے رہا تھا، اور عام عدالت میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جسے اُس کا خوفناک انجام نظر نہ آ رہا ہو، اُس نے ہر قسم کی قانونی امداد حاصل کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا، اور خود ہی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ جج، جیوری، سرکاری وکیل، تماشائی، عدالت کے ملازمین غرض سب اطمینان کے ساتھ قیدی کی تقریر سُن رہے تھے، مگر ہر شخص نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ قیدی کو بے عزتی اور بدنامی کی تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور وہ اپنے تحفظ کے متعلق کتنا بھی کہے وہ بالکل بے وقعت سمجھا جائے گا۔

"مائی لارڈ اور حضراتِ جیوری ـــــــ"

جونہی کہ یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچے، تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی، اور تماشائیوں کی نگاہیں کٹہرے کے پیچھے قیدی کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس کی صورت سے ناامیدی اور ہراس کے آثار نظر آ رہے تھے۔

قطع نظر اس سے کہ اس کا جرم کس قدر خوفناک تھا یا یہ کہ اس نے مقدمہ کی کارروائی کے دوران میں کتنی سنگدلی کا ثبوت دیا تھا، انسانوں کے اس انبوہ کثیر میں قیدی کے ساتھ عام ہمدردی اظہار کیا جا رہا تھا۔

اب شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور لنچ کے ایک قلیل وقفہ کے علاوہ عدالت کا اجلاس صبح سے اس وقت تک برابر ہو رہا تھا۔

خود قیدی کے چہرے سے تکان کے آثار نمایاں تھے، مگر اُس نے تمام ناامیدیوں اور بے چینیوں کو نظر انداز کر کے اپنا سر اونچا کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا، پھر کامل عزم و استقلال کے ساتھ تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک قابلِ بیان واقعے کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کر رہا تھا۔ وہ تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکا بلکہ مسلسل فراٹے بھرتا چلا گیا۔

شروع شروع میں جج رحم آمیز حیرت کے ساتھ قیدی کی تقریر سنتا رہا۔ وہ افسوس کر رہا تھا کہ کتنا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی ایک خوفناک جرم کے ارتکاب کی وجہ سے انسانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں گر پڑا ہے اور اب ———

اب سات بج چکے تھے مگر قیدی بغیر کسی تکان یا دماغی اضمحلال کے برابر بول رہا تھا اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں کہیں سے نئی طاقت برابر چلی آ رہی ہے۔

"نہیں حضراتِ جیوری، اس کا کوئی علاج نہیں ہے، قیدی کو اپنی صفائی کے لئے بہت سے معاملات پر روشنی ڈالنی ہے، اُن پر زور دینا ہے، اور جب تک اُس کی تقریر معقول اور متعلق باتوں پر مشتمل ہے اُس کو دنیا کا کوئی قانون بند نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔ ———"

عدالت دوسرے دن صبح گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کر دی گئی، اور جیوری کے آدمی اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف چل دیئے۔ قیدی کے دبلے پتلے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بھی اپنی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

صبح ہوئی مگر ناخوشگوار اور افسردہ۔ جج کے داخل ہونے سے پہلے ہی اجلاس کا کمرہ تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ قیدی کو اندر لایا گیا جس نے گھستے ہی جیوری اور جج کی طرف جھک کر مودبانہ سلام کیا اور لوگوں کی قطار پر ایک حیرت آمیز نظر ڈالی، مجمع کی بے قراری پر مسکرایا اور کل شب کی بقیہ تقریر پھر شروع کر دی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ایک قلیل وقفہ ہوا جس میں قیدی نے نیچے جا کر کچھ شربت وغیرہ پیا اور جب عدالت کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو وہ بالکل تازہ دم اور مستعد نظر آ رہا تھا۔

جیوری کے ارکان اونگھ رہے تھے، اور ہل ہل کر اور بار بار جمائیاں لے لے کر گھنٹے کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ جج بھی مضمحل ہو چکا تھا، اور اس لئے اُس کے چہرہ سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا، جونہی کہ پانچ بجے

یوں

ج طیش میں آکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا کر کہنے لگا "خاموش"!

قیدی نے تقریر بند کر دی۔

جج نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "مجھے تمہارے مقدمہ سے کوئی تعصّب یا بغض نہیں ہے مگر عدالت کا وقت بھی بے کار ضائع نہ کرنا چاہئے"

"مائی لارڈ ———"

جج نے ہاتھ ہلا کر اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

اُس نے پھر کہا "میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں"

جج نے گھنٹے کی طرف دیکھ کر کہا "بہت اچھا اب عدالت کا اجلاس اُس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک تمہاری تقریر ختم نہ ہو جائے۔ اس میں خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ لگ جائے"

جیوری کی طرف سے اس فقرہ پر عجیب عجیب چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مگر قیدی کے چہرے پر مسرت کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی۔

قیدی نے جھک کر مودبانہ عرض کیا "مائی لارڈ! آپ جیسا بھی مناسب خیال فرمائیں"

دس بجے کے قریب جج نے دوستانہ لہجے میں قیدی سے شکایت کی کہ وقت حد سے زیادہ گزر گیا ہے اور اب اسے اپنی تقریر بند کرنی چاہئے مگر قیدی نے کہا "مائی لارڈ! مجھے ان لوگوں کی تکلیفوں کا خوب احساس ہے اور حد درجہ افسوس بھی مگر کیا کروں یہ معاملہ میری موت و حیات کا سوال ہے" جیوری کے ارکان کی طرف مخاطب ہو کر کہا "حضرات آپ کو جو زحمت اٹھانی پڑی اُس کا مجھے حد درجہ افسوس ہے مگر میرا یہ بھی ایک فرض ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کروں اور آپ جانتے ہیں جان سب چیزوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ چنانچہ میں آپ لوگوں کی اجازت سے پھر تقریر شروع کرتا ہوں ———"

جج نے غصہ میں کھڑے ہو کر کہا "عدالت کا اجلاس کل گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔"

(۳)

ساتویں دن کی صبح کو جیوری کی طرف سے ایک شکایت نامہ موصول ہوا جس میں مذکور تھا کہ وہ لوگ جنہیں اپنے کاروبار اور اپنے بال بچوں کی فکر ہے چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس لامتناہی تقریر کی مصیبت سے انہیں نجات دلائی جائے۔

عرضی کا خلاصہ یہ تھا کہ قیدی کو پھانسی دے دو۔ بہت ممکن تھا کہ جج اس پر برضا وخوشی عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتا مگر اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور کہا کہ انہیں ابھی قدرے توقف کرنا چاہیئے۔

قیدی پہلے سے زیادہ تازہ دم اور مستعد کٹہرے میں داخل ہوا، اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنی سابقہ تقریر کے بقیہ حصے کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس حرکت پر تمام عدالت میں ایک قہقہہ پڑا۔

جج نے کہا "خاموش" ملازموں نے بھی یک زبان ہو کر کہا "خاموش" (تمام مجمع اور چند بیرسٹروں کو اس خاموش" پر بڑی ہنسی آئی)۔

لنچ کے بعد جج نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں اپنا بیان مختصر کر دینا چاہیئے کیونکہ تم دو دن سے برابر بول رہے ہو، اور میں اپنی ذمہ داری کو کافی طور پر محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ معاملہ کو بد سے بدتر بنا رہا ہے۔"

قیدی نے گردن جھکالی اور کہا "مائی لارڈ! میں آپ کی اس تکلیف کے لئے جو آپ نے میری تقریر اطمینان قلب کے ساتھ سننے میں اٹھائی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ اب تک میں نے اپنی صفائی کے اصل معاملہ کو بالکل نہیں چھیڑا اور صرف چند تمہیدی باتوں پر زور دیا ہے اس لئے ـــــــ"

آخرکار جج بھی مجبور ہو کر کرسی میں لیٹ گیا۔

قیدی نے پھر کہنا شروع کیا "مجھے پھانسی کیوں دینی چاہیئے اس کے لئے صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے مگر پھانسی کیوں نہیں دینی چاہیئے اس کے لئے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں، چنانچہ میں ان دلیلوں کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اور معزز حضراتِ جیوری کا قیمتی وقت صرف ہوگا مگر خیر، اب میں شروع کرتا ہوں ـــــــ"

جج نے چلا کر کہا "میں ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ عدالت کا قیمتی وقت اس طرح بے کار ضائع کیا جائے۔"

"مائی لارڈ"

قیدی کی آواز بہت دردانگیز اور شکستہ معلوم ہو رہی تھی، وہ آزردہ خاطر ہو کر اپنے کٹہرے میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا "آپ مجھے پھانسی دے دیں یہ اور بات ہے مگر یہ یاد رہنا چاہیئے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا کافی موقع نہیں دیا گیا۔"

تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی جو بالآخر کتابوں اور کاغذوں وغیرہ کے اٹھانے، رکھنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ جج اور وکلا حکامِ اعلیٰ سے مشورہ کر رہے تھے۔

بالآخر جج نے کھڑے ہو کر کہا " عدالت کل صبح تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے"

یہ کہہ کر وہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ جو ایسے وقت مناسب تھی، کمرۂ عدالت سے باہر چلا گیا۔ جیوری کے بکس کی طرف سے غصہ میں بھری ہوئی لعنت ملامت کی آوازیں آ رہی تھیں مگر قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت اور لبوں پر تبسم تھا۔

(۴)

جب جج آٹھویں دن عدالت میں آیا تو بیٹھتے ہی بولا "میں نے سرکاری افسرانِ قانون سے مشورہ کر لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کافی موقع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اُسے انہیں واقعات سے سروکار رکھنا چاہئے جن کا مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہو وہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر خواہ مخواہ طوالت نہ پیدا کرے"

قیدی نے پھر اپنی لاانتہاہی تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر اب اُس نے اپنے طریقے میں کسی قدر تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ روئے سخن میں بھی ایک خاص فرق نظر آ رہا تھا، ــــ اب وہ نہایت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کی تقریر پہلے کی طرح غیظ آلود نہ تھی بلکہ اس سے نہایت متانت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ بہت ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک بات پر زور ڈال رہا تھا، اور برابر مستند آدمیوں کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چرب زبانی کے ساتھ مختلف کتابوں، مقدمات کی کارروائیوں، شہادتوں کے قانون اور صحتِ واقعہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق سینکڑوں کتابوں کے حوالے دے دے کر اپنے مافی الضمیر کو واضح کر رہا تھا۔

متعدد مرتبہ اسے خاموش ہونے اور جوش کو قابو میں رکھنے کے لئے کہا گیا مگر ایسی تنبیہوں کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک بالکل غیر متعلق اور طویل بحث چھڑ جاتی تھی اور پھر افسروں کو بار بار مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ آج جج نے بھی تمام دن مقدمہ کی کارروائی اونگھ اونگھ کر سنی۔ جیوری کے لوگ مسکرا مسکرا کر قیدی کی طرف کسی قدر ترش روئی کے ساتھ گھورتے تھے۔ تماشائیوں کے مجمع میں بھی اس لاانتہاہی اور تکلیف دہ تقریر کے سننے کی تاب نہ رہی تھی اور اب اس کی طرف بے التفاتی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہر حال اس طرح یہ دن بھی گزر گیا۔ اور سات بجے عدالت کا قدرتی التوا یقینی امر تھا

(۵)

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا، مگر قیدی برابر بول رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں ایک دفعہ جج نے کچھ مداخلت کی

تو اس کے جواب میں قیدی نے کہا "جناب عالی، یہاں تک میں نے صرف اُس معاملہ پر زور دیا ہے جو جسم کے قریب چاقو پڑا پانے کے متعلق ہے، حالانکہ ابھی مجھے بہت سی باتیں (اس پر تمام عدالت میں کامل خاموشی چھا گئی اور تمام لوگوں نے ایک تھرتھری سی محسوس کی) خود جسم کے متعلق عرض کرنی ہیں پھر اس کے بعد ٹوٹا ہوا گلاس، سفید سفوف، ماہرین کیمیا کے تجزیے، ارتکاب جرم کا وقت، موسم، اس رات کو چاند کی خاص ہیئت، پولیس اور ہوم آفس کی شہادتیں، اُن کی صحت و عدم صحت اور پھر سب سے بڑھ کر خودکشی کا مسئلہ، غرض ابھی تو سینکڑوں مسائل تشنۂ تکمیل ہیں۔ مثلاً وقوعہ کی شب کو میں ایک نیم سرکاری جلسہ میں مدعو تھا، اور اب اس جلسے کے حاضرین کی فہرست مجھے مل گئی ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ آٹھ سو سات گواہوں کو جو میری عدم موجودگی کا ثبوت دیں گے یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کروں، جن کے متعلق میں چند تعارفی الفاظ بھی کہتا جاؤں گا، اور پھر ————"

جج نے اس جملۂ معترضہ کو روکتے ہوئے کہا "اچھا حضرت آگے بیان کیجئے، خدا کے لئے کہو! آگے کیا کہنا چاہتے ہو"

قیدی نے وہ دن بھی اعتراضات کے جوابات میں گزار دیا جو چاقو کے متعلق کئے گئے تھے، اور آخر میں اس نے کہا کہ "حضرات جیوری میں کل اُن اعتراضات کے جواب دوں گا جو پولیس کی اُس رپورٹ کے متعلق ہیں جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ میرا جسم بے حس پڑا ہوا پایا گیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بات ————"

جج نے قطع کلام کر کے غصہ میں بھری ہوئی آواز سے کہا "اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے۔"

(۶)

نویں ہفتہ کی صبح کو جب کہ قیدی نے کامل دو گھنٹے اپنے آٹھ سو سات گواہوں میں سے چند کو پیش کرتے ہیں گزار دیے تھے ارکانِ جیوری نے جج سے چند منٹ کے لئے رخصت چاہی تاکہ اُس سوال کے متعلق جو جج نے اُن سے کیا تھا غور و فکر کر سکیں۔

چنانچہ انہیں تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کی اجازت فوراً مل گئی، اور اس اثنا میں جج نے شاہی مشیر سے ایک مختصر مشورہ کرنا شروع کر دیا۔

مشیر نے پوچھا "تو کیا مائی لارڈ! اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا؟"

جج نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "کچھ نہیں"

مشیر نے دریافت کیا "کیا اُسے جب تک وہ چاہے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے گی اور اس کے سو

کوئی مفر نہیں ہے"

ارکانِ جیوری عدالت کے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوئے۔ جج نے پوچھا "کیا آپ حضرات اپنے فیصلہ پر متفق ہو گئے ہیں؟"

جو شخص سب سے آگے تھا اُس نے کہا "ہاں، بیشک، جنابِ والا، ہم نے اس قیدی کو بالکل بے گناہ پایا"

کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت میں سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

جج نے کہا "مسٹر جان تمہارے ملک کی جیوری نے تمہیں اُس الزام سے جو تم پر لگایا گیا تھا بالکل بری پایا ہے اور تمہیں آزاد کر دینے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تم نے اپنی صفائی کی تقریر میں (یہاں تک پہنچ کر اُس کی آواز رک گئی) غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ دماغی جوہر کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے میں نہایت زوردار الفاظ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی خداداد قابلیتوں کو کارآمد کاموں میں صرف کرو، نہ یہ کہ ایک قابلِ نفرت جرم کے ارتکاب کی تردید میں مشغول رہو۔ جان اب تم آزاد ہو اور جا سکتے ہو"

"مائی لارڈ مجھے ابھی چند الفاظ اور کہنے ہیں ———"

فقرہ ختم ہونے سے پہلے ایوانِ عدالت میں سے مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد کمرے میں سوائے قیدی کے اور کوئی نہ رہا۔

قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت نمایاں تھی۔

"میرے "چند الفاظ" اُن کے تمام اعتراضات کا ایسا مسکت جواب ہوتے کہ اُن کے دانت کھٹے ہو جاتے۔ مگر خیر، ———"

یہ کہہ کر وہ بھی کاروبار میں مصروف بازار میں ایک طرف کو چل دیا۔

ظفر قریشی دہلوی

بچپن کی یاد

بچپن کا راز کیا ہے اے دل ذرا بتا دے
بچھڑے ہوئے دنوں سے اک بار پھر ملا دے

جس سے دلِ حزیں کو بچپن کی یاد آئے
تُو اے ربابِ ہستی وہ راگ پھر سُنا دے

آئے نئے نئے تھے جس وقت ہم جہاں میں
وہ عافیت کا منظر اک بار پھر دکھا دے

دنیا کی کلفتوں سے دل تنگ آگیا ہے
گودی میں عاطفت کی تُو پھر مجھے لِٹا دے

کیا بات ہے جو ایسا خاموش ہو گیا ہے
اک بار پھر پرانے نغموں سے دل ہلا دے

شورِ جہاں ہے مجھ کو مانندِ شورِ محشر
پیاری سی دُھن سُنا کر تُو مست پھر بنا دے

ہستی کی راہ میں ہے ہر ہر قدم پہ ٹھوکر
مہرِ پدر کی انگلی پھر راہبر بنا دے

محفوظ ہُوں سدا میں آشوب سے جہاں کے
آغوشِ مادری میں تو پھر مجھے سُلا دے

اے سازِ زندگانی مدت سے منتظر ہوں
تُو زخمۂ ازل سے تاروں کو پھر بجا دے

آواز جن کی اب تک کانوں میں گونجتی ہے
وہ بے خودی کی تانیں ناشادؔ پھر سنا دے

رام پرشاد کھوسلا
ناشادؔ

چیتوا

افراد

چیتووں[1] کا ایک گروہ جس میں ایک بڈھا، اُس کا جوان بیٹا، بیٹے کی بیوی، سات برس کا ایک بچہ، ایک بے باپ کی بچی، اُس کی ماں اور دو اور نوجوان ہیں۔

دو پڑھے لکھے مالدار نوجوان، ایک سرکاری اہل کار، اُس کی بیوی اور گاڑی بان۔

پہلا سین

سنسان راستہ۔ موسم سرما کی ایک شام۔ عورتیں اور مرد بیٹھے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی سردی سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ بڈھے کے پاس صرف ایک چادر ہے۔ جوانوں کے ہاتھ میں پوٹلیاں ہیں۔ لڑکا ننگے سر ننگے پیر ہے اور آدھی باہوں کی کرتی پہنے ہے۔ لڑکی کے بدن پر ہاتھ بھر کا ایک کپڑا ہے۔ عورتوں کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں۔

نوجوان (اپنے باپ سے) بابا یہاں کیوں بیٹھ رہے ہو، آگے چلو۔

بڈھا۔ آگے کہاں چلیں؟

نوجوان۔ کہیں چلو۔

بڈھا۔ چلتے چلتے دن بھر تو ہوگیا۔ اب پاؤں کام نہیں کرتے۔

نوجوان۔ کہیں ٹھکانا ملے تو اچھا ہے۔ یہاں نہ کنواں ہے، نہ کوئی بستی ہے۔

بڈھا۔ یہاں بستی کہاں رکھی ہے ہم نے تو کہا تھا کہ اسی گاؤں میں ٹھہر جائیں، مگر تو نے نہ مانا۔ یہاں سے دوسرا گاؤں نہ جانے کتنی دور ہوگا۔

---

[1] چیت کی فصل کاٹنے والے مزدور۔ فصل کے مہینے میں ان کے گروہ کے گروہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

دوسرا نوجوان۔ مگر بابا یہاں تو سردی سے ٹھٹھر جائیں گے۔ کہیں گھام میں چلو۔

بڈھا۔ چلو، گھام میں چلو۔ اس سے تو ٹھٹھر جائیں سو اچھا۔ اس جنجال سے تو پران بچیں گے۔

(دو نوجوان گھوم کر واپس آ رہے ہیں۔ دونوں اوورکوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ آپس میں باتیں کر رہے ہیں)

بڈھا۔ بھیّا، یہاں سے گاؤں کتنی دور ہوگا؟

(دونوں رک جاتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ یہاں سے دو کوس ہے۔

بڈھا۔ تب تو بڑی دور ہے۔

نوجوان۔ تم لوگ کہاں جاؤ گے؟

بڈھا۔ کہاں بتائیں، جہاں جگہ ملے۔

کسان نوجوان۔ مہاراج، ہم چپتوا ہیں۔ سنا تھا کہ اپنے یہاں چیت کٹنے لگا ہے مگر ابھی تو یہاں لگا بھی نہیں لگا۔

نوجوان۔ تم لوگ چیتوا ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو؟

بڈھا۔ مہاراج سیاوری سے آ رہے ہیں۔ کل دوپہر کو چلے تھے۔ ساتھ میں جو کچھ تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب کیا کھائیں؟ کہاں جائیں؟

نوجوان۔ سیاوری تو بہت دور ہے۔ یہاں سے ساٹھ میل ہوگی۔ تم لوگ برابر چلتے آئے ہو؟

بڈھا۔ اور کرتے کیا مہاراج!

نوجوان۔ مگر تم لوگوں نے بڑی بھول کی۔ پیچھے جو بستی تھی وہاں کیوں نہ ٹھہر گئے؟

بڈھا۔ ٹھہر کر کیا کرتے؟ جتنا آگے نکل جائیں سو اچھا۔ یہی سوچ کر چل پڑے۔ ابھی ایک آدمی ملا تھا۔ کہتا تھا سیمری میں چیت کٹنے لگا ہے۔ لیکن مہاراج فصل تو ستیاناس ہوگئی، ہم لوگ کاٹیں گے کیا۔ اس آدمی کے پاس ایک گٹھری تھی۔ کہتا تھا، آدھ سیر دانے نہیں نکلے۔ پھر ہم سیمری جا کر کیا کریں گے؟ (رک کر) مہاراج، سیمری کتنی دور ہوگی؟

نوجوان سیمری یہاں سے آٹھ میل ہے۔ تم ایسی سردی میں اب آگے کہاں جاؤ گے۔

بڈھا۔ مہاراج، کھانے کے لئے تو کچھ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ سویرے ایک مٹھی چنوں سے پانی پی کر چلے تھے۔ دن بھر پانی کے سہارے ہی یہاں تک چلے آئے۔ مگر اب تو بھوک سے پیٹ جل رہا ہے۔ آنکھیں مندی جا

رہی ہیں۔اپنی کچھ نہیں۔پیٹ باندھ کر سو رہیں گے۔مگر یہ لڑکا ہے، چھوٹی لڑکی ہے، بھگوان کی دیا سے اُن کے لئے کچھ مل جاتے تو اچھا ہے۔

دوسرا نوجوان (اوورکوٹ میں سردی سے کانپتے ہوئے) کیوں جی، تمہارے اور کپڑے کہاں ہیں؟

پہلا نوجوان۔ دیکھتے نہیں۔بیچاروں کے پاس اور کپڑے کہاں رکھے ہیں؟ جو کچھ ہیں سو یہی ہیں۔

بڈھا۔ مہاراج آپ دیکھ تو رہے ہیں۔انہیں کپڑوں سے کسی طرح رات کٹ جائے گی۔بھگوان سب کا مالک ہے۔

نوجوان (اوورکوٹ کی جیب ٹٹول کر اپنے ساتھی سے) انہیں کچھ پیسے دے دیں۔

دوسرا نوجوان ۔ اچھی بات ہے۔

پہلا نوجوان (پریشان ہوکر) میری جیب تو خالی ہے۔

دوسرا۔ پھر چلو۔

پہلا۔ چلتے ہیں۔ذرا اپنی جیب دیکھ لو۔کچھ ہو تو ان بیچاروں کو دے دیں۔

دوسرا۔ میری جیب میں سگریٹ کی ڈبیا ہے۔

پہلا۔ تو کیا وہ سگریٹ کھائیں گے؟

دوسرا۔ کیا ہوا، پی تو سکتے ہیں۔

پہلا۔ چُپ رہو۔(پھر پریشان ہوکر بڈھے سے) بھائی اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں۔نہیں تو تمہاری کچھ مدد کر دیتے۔

بڈھا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں، مہاراج۔نہیں ہیں تو جانے دو۔

(دونوں نوجوان آگے بڑھتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ تمہیں ان لوگوں پر ترس نہیں آتا؟

دوسرا۔ آتا کیوں نہیں۔مگر جیسی حالت ہماری ہو ویسی ان کی۔ہم اور وہ ایک سے ہیں۔

پہلا۔ تم تو وحشی ہو۔

دوسرا سین

(وہی جھونپڑوں کا گروہ۔لڑکا ماں کی گود میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔بڈھا چپ چاپ ہے۔)

پہلا نوجوان - بابا، اب تو بھوک سے بُرا حال ہے - پانی پی پی کر کہاں تک پیٹ بھریں، منہ سوکھ رہا ہے آنکھوں کے سامنے تکلے چھوٹ رہے ہیں - ہم سب تو سہہ لیں گے، مگر ننّھے ننّھے بچوں نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا۔ وہی چنے کھاتے تھے۔

بڈھا - نہیں کھایا تو کیا کریں - کسی نے کچھ نہیں کھایا، بتاؤ کیا کریں، مر جائیں؟ تو ہی سب کو گھیر کر یہاں لے آیا ہے - کہتا تھا چیت کٹنے لگا - اب بتا، یہاں چیت کہاں ہے - گیہوں میں جان نہیں رہی چنا اوپر سے دیکھو تو پیلا ہے، اندر سے اینٹھ کر کالا پڑ گیا ہے - پھر آدمیوں کا کیا ہو؟ بھس کھا کر جئیں گے -

(ساتھ کے دو نوجوان الگ باتیں کر رہے ہیں)

پہلا نوجوان - جی چاہتا ہے یہ کالی مٹی کھا جائیں -

دوسرا نوجوان - لگتی تو بڑی اچھی ہے - تم نے کبھی کھائی ہے؟

پہلا (تھوڑی سی مٹی اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے) ارے یہ تو بڑی اچھی لگتی ہے - سوندھی سوندھی باس آتی ہے -

دوسرا - تو پھر چلو اسی مٹی سے پیٹ بھر لیں اور سو جائیں - سویرے دیکھا جائے گا -

پہلا - پاگل اس طرح نیند آ جائے تو سب جھگڑا ابھی نہ چک جائے - بھوک سے آنتیں سکڑ رہی ہیں نیند کہاں آئے گی!

دوسرا - یہاں بیری کے پیڑ بھی نہیں - کسی پیڑ کی جڑ ہوتی تو اسی کو کھاتے -

پہلا - جڑیں تو بہت سی ہیں - کھاؤ نا -

دوسرا - تم تو ہنسی کرتے ہو - آج دوپہر کو میں نے سچ مچ ہی پیپل کی جڑ توڑ کر کھائی تھی - بڑی مزے دار تھی -

پہلا - چلو، اسی کو کھودیں -

(دونوں جاتے ہیں)

(ایک طرف لڑکی اپنی ماں کی گود میں اوں اوں کر رہی ہے)

ماں - ٹھنکی تو منہ توڑ دوں گی -

لڑکی - اُوں اُوں، ابھی دے دے -

ماں - کیا دے دوں؟

لڑکی - وہی کھونٹ میں جو چنے بندھے ہیں -

ماں - (ایک گھونسا مار کر) ٹھکرتی ہے - کہہ دیا چپ بیٹھی رہ - تھوڑی دیر میں کھا لینا - ابھی دیکھ ——— (کان میں کچھ کہتی ہے) ——— سمجھی!

بڈھا (لڑکی کو روتے دیکھ کر) ارے اسے مار کیوں دیا۔ آ بیٹی میرے پاس بھاگ آ، پٹن کے ساتھ کھیل۔
لڑکی (اونچی آواز سے غوغا کرتے ہوئے) مجھے — مجھے بھوک لگی ہے۔ بائی چنے نہیں دیتی۔
بڈھا۔ بیٹی اب اُس کے پاس چنے کہاں ہیں۔ سویرے سب نے اپنے اپنے حصے کے کھائے تھے۔
لڑکی۔ رکھے تو ہیں۔ بائی نے کون کھائے تھے۔ کھونٹ میں بندھے ہیں۔
ماں (اُسے پیٹتے ہوئے) بندھے ہیں تیرے لئے۔ کیوں اور میں کیا کھاؤں گی! بڑی لاڈلی آئی کہیں کی۔
بڈھا۔ ارے، کیوں مارتی ہے! ہیں تو دے دے رکھیا، میرے پاس کیوں نہیں آجاتی؟
(لڑکی بڈھے کے پاس جاتی ہے۔ وہ اسے پچکار کر گود میں بٹھا لیتا ہے)
بڈھا۔ (اپنی بہو کو سردی سے ٹھٹھرتا دیکھ کر) ہردسا کہاں چلا گیا؟ (اپنے بیٹے سے) اور تو بھی بیٹھا بیٹھا کیا کرتا ہے اجا
کر لکڑیاں چن لا اور تھوڑی سی آگ ہی بنا۔ سردی سے بڈیاں کانپ رہی ہیں۔
نوجوان۔ میں کہاں سے چُن لاؤں۔ ان کو سلگانے کے لئے آگ بھی ہے؟
(بڈھا چپ ہو جاتا ہے۔ بہو تھوڑی دور آگے سڑک پر آگ جلتی دیکھتی ہے)
بہو۔ (دھیمی آواز میں) وہ دیکھو آگ جل رہی ہے تھوڑی سی لے آؤ۔
(سب اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں ایک کھلی ہوئی گاڑی اور تین آدمی بیٹھے دکھائی دیتے ہیں)
نوجوان۔ بابا چلو، وہیں چل کر بیٹھیں۔ گاڑی کھڑی ہے۔ تمباکو پینے کو مل جائے گا آگ بھی جل رہی ہے۔
(سب اُٹھتے ہیں)
بڈھا (ادھر اُدھر دیکھ کر) ارے ہردسا چل، ہم لوگ گاڑی کے پاس جاتے ہیں۔
(ہرداس اور اُس کا ساتھی کچھ چباتے ہوئے آتے ہیں)
(سب کا جانا)

تیسرا سین

(گاڑی کھڑی ہے سڑک کے کنارے گھاس کا ڈھیر جل رہا ہے۔ ایک سرکاری اہلکار بیوی کو لے کر اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے وہاں ٹھہرا ہے۔ آگ کے سامنے اہلکار، اس کی بیوی اور گاڑی والا بیٹھے ہیں)
گاڑی والا۔ آج تو بڑی سردی ہے۔

اہلکار۔ ہے تو مگر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ گاڑی پر پال تنا ہے۔ یہاں سے چار کوس جگہ اور ہوگی۔ دس گیارہ بجے گھر پہنچ جائیں گے۔ نہیں تو رات بھر یہیں رہنا پڑے گا۔

(بیوی نعمت خانہ میں سے کھانا نکال کر شوہر کے سامنے رکھتی ہے، گاڑی والے کو دیتی ہے اور خود بھی لیتی ہے سب کھانے لگتے ہیں)

(چینوا آتے ہیں)

بڈھا (آگے بڑھ کر) مہاراج، ذرا ہم لوگ تاپ لیں؟ بیٹھ جائیں؟

اہلکار۔ (ذرا ہٹ کر) ہاں ہاں بیٹھ جاؤ۔

(سب چکر باندھ کر بیٹھتے ہیں)

اہلکار۔ (کھاتے ہوئے) تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟

بڈھا۔ کہیں نہیں۔ ہم لوگ چینوا ہیں۔

اہلکار۔ ابھی سے نکل پڑے ابھی تو فصل آئی بھی نہیں۔

بڈھا۔ گھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے؟ باہر تو کچھ کام بھی مل جاتا ہے۔ سنتے تھے ادھر کہیں چیت کٹنے لگا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا؟

اہلکار۔ ادھر تو ابھی دیر ہے۔ مگر کونچ کی طرف فصل کٹنے لگی ہے۔

بڈھا۔ (خوش ہو کر) آپ کو کیسے معلوم ہے؟

اہلکار۔ معلوم ہے۔ اُدھر تو بازار میں نیا اناج بھی آگیا۔

بڈھا۔ کونچ یہاں سے کتنی دور ہوگا، مہاراج۔

اہلکار۔ پندرہ کوس ہوگا۔

بڈھا۔ تب تو بہت دور ہے۔

اہلکار۔ کوئی دور نہیں۔ ابھی سے چلو گے تو دوپہر تک پہنچ ہی جاؤ گے۔

بڈھا۔ (مایوسانہ لہجے میں) دیکھو۔

اہلکار (آگ بجھتی دیکھ کر، گاڑی والے سے) ارے کھلبل تھوڑی سی گھاس اور لا۔ آگ بجھ رہی ہے۔

(کھلبل اٹھتا ہے)

بڈھا۔ اے مہاراج گھاس کاہے کو جلاتے ہو۔ بیلوں کو تو ملتی نہیں۔ ہم تھوڑا سا ایندھن اکٹھا کر لاتے ہیں۔

اہلکار۔ نہیں، نہیں، ضرورت نہیں۔ ہم لوگ ابھی چلے جائیں گے۔
بڈھا۔ ایسی ٹھنڈ میں!
اہلکار۔ کچھ ٹھنڈ نہیں۔ گاڑی پر پال تنا ہے۔ کپڑے بھی کافی ہیں۔ چلے جائیں گے۔
بڈھا۔ لیکن مہاراج، بیلوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔
اہلکار۔ ٹھنڈ کیا لگے گی، کون ساری رات بھر چلنا ہے۔ ابھی دس بجے پہنچ جائیں گے۔

(اہلکار کی پوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بیوی اُس کے سامنے دو پوریاں اور رکھ دیتی ہے۔ چار گاڑی والے کو دیتی ہے۔ کسان لڑکا اور لڑکی اب تک برابر اہلکار کا منہ تک رہے تھے۔

لڑکا۔ (بے صبر ہو کر اور ماں کے اوپر گر کر) بائی، لچئی، اُوں، اوں لچئی۔
ماں (اسے دھکیل کر) بڑا اُلو کھا ہے۔ لچئی کہاں سے لاؤں!
لڑکا۔ (اہلکار کی طرف دیکھ کر) وہ ہے۔
ماں۔ (خفا ہو کر) تو کھا لے۔

(لڑکا رونے لگتا ہے)

بڈھا۔ (اہلکار سے) مہاراج، ایک لچئی ہو تو اس لڑکے کو دے دو، بھوکا ہے۔
اہلکار۔ اب تو کچھ نہیں بچا۔
بیوی۔ ہے تو۔ ایک پوری بچی ہے۔ تم تو نہیں لوگے؟
اہلکار۔ نہیں۔

(بیوی پوری لڑکے کے سامنے پھینکتی ہے۔ اُسے کھانے کے لئے لڑکے کے ساتھ لڑکی بھی جھپٹتی ہے۔ پوری لڑکے کے ہاتھ میں پڑتی ہے۔ یہ اُسے جلدی سے منہ میں ٹھونس لیتا ہے۔ اہلکار ہنستا ہے)

(لڑکی پل بھر تک کھڑی رہتی ہے۔ پھر جھپٹ کر پوری پر منہ مارتی ہے۔ تب تک لڑکا اُسے صاف کر چکتا ہے۔)

لڑکی۔ (اپنی ماں کے پاس جا کر) لچئی اُوں اُوں (روتی ہے)
ماں (اہلکار کی طرف دیکھ کر) مہاراج، ذرا سا ٹکڑا ہو تو اور دے دو۔

(اہلکار کھانا ختم کر کے چلنے کی تیاری کر رہا ہے)

اہلکار۔ اب تو ہم لوگ کھا چکے۔

(عورت چپ ہوکر لڑکی کو گود میں چھپا لیتی ہے۔ لڑکا اب بھی اہلکار کی طرف دیکھ رہا ہے)

لڑکی۔ (ماں سے چمٹ کر) بائی، لچھی۔

ماں۔ مجھے کھالے۔ لچھی کہاں سے لاؤں۔

چوتھا سین

(وہی جگہ۔ اندھیری رات۔ آگ بجھی پڑی ہے۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ بڈھا راکھ کے پاس لیٹا ہے۔ اس کے پاس اور لوگ لیٹے ہیں۔ دو نوجوانوں کے سوا سب سوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے)

نوجوان۔ (کانپ کر) اُف!

دوسرا نوجوان۔ بڑی سردی ہے۔

بڈھا۔ میری ہڈیاں تک کانپ رہی ہیں۔

(بغل میں لیٹے ہوئے لڑکے کو اپنے اور قریب کر لیتا ہے)

نوجوان۔ بابا ایسی سردی تو آج تک نہیں دیکھی۔ انگلیوں میں جھنجھنی چھوٹ رہی ہے۔ منہ کا خون جم رہا ہے۔

بڈھا۔ اس سے اچھا تو یہی تھا کہ اس گاڑی کے ساتھ ہی چلے چلتے۔

نوجوان۔ نہیں بیٹھے رہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ چلو۔

بڈھا۔ آگ کے آسرے سے بیٹھا رہا۔ اب وہ بھی بجھ گئی۔ چلو کچھ ایندھن اکٹھا کر لائیں۔

نوجوان۔ رات بھر ایندھن ہی اکٹھا کرتے رہیں گے۔ کچھ سوجھتا تو ہے نہیں۔ ایندھن سسرا کہاں ملے گا۔

(اُٹھ کر گھاس پھوس اکٹھا کرتا ہے۔ اُسے آگ پر رکھ کر پھونکتا ہے۔ دھواں)

بڈھا۔ سویرا جانے کب ہوگا۔

نوجوان۔ ابھی تو دیر ہے۔

(اتنے میں لڑکی روتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے چمٹی پڑی ہے۔ ماں کا ایک آنچل اُس کے بدن پر ہے اور اُس کے بدن کا آدھا حصہ کھلا ہے)

ماں (لڑکی کو پچکار کر، نیند بھری آواز میں) سو جا بیٹی!

(لڑکی پھر روتی ہے)

ماں (اس پر ہاتھ رکھکر) لے تو کہاں چلی گئی، ادھر کھسک آ۔ (اُسے اپنی چھاتی سے لگاکر آنچل سے اچھی طرح ڈھکتی ہے)
لڑکی (اچانک چونک کر) ہائی، لچھی۔
ماں (اُسے تھپکی دے کر) سوجا، سوجا۔ سویرا ہونے پر تجھے لچھی اور جلیبی دوں گی۔
لڑکی (اُٹھ کر چلاتے ہوئے) اوں اوں، ابھی دے دے ـــــ ابھی۔
(سب کی آنکھ کھل جاتی ہے)

ایک نوجوان یہ کیا آفت ہے؟
بڈھا۔ سکھیا کی ماں، کیا ہے؟
سکھیا کی ماں۔ کچھ نہیں بابا لچھی کے لئے روتی ہے۔ بتاؤ لچھی کہاں سے لاؤں! (رونے لگتی ہے)
بڈھا۔ ارے روتی کاہے کو ہو؟
لڑکی۔ (روتے روتے اچانک سردی سے کانپ کر) اُوہُو، اُوہُو، اُوہُو، جاڑا لگتا ہے۔
ماں۔ یہاں آجا بیٹی یہاں، جاڑا لگتا ہے تو کیا کروں۔
(اُٹھ کر آگ کے پاس جاتی ہے)

لڑکی۔ اُوہُو، اُوہُو، جاڑا، جاڑا۔
ماں۔ (بڈھے کی طرف دیکھ کر) ذرا اپنی چادر دے دو۔
(بڈھا چادر دیتا ہے۔ ماں لڑکی کو اُس میں لپیٹ کر سلانے کی کوشش کرتی ہے۔ ادھر دونوں نوجوان ایندھن اکٹھا کرتے ہیں)
لڑکی۔ (ایک لخت اُٹھ کر) ماں!
ماں۔ کیا ہے بیٹی؟
لڑکی۔ اُوہ!

ماں۔ (پریشان ہوکر) کیا ہے؟
لڑکی۔ (کانپتے ہوئے) ڈر لگتا ہے۔
ماں۔ ڈر کاہے کا بیٹی! دیکھو سب بیٹھے ہیں۔
لڑکی۔ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچھی ـــــ لچھی چھین رہا ہے۔

نوجوان (جو پاس ہی بیٹھا ہے) اسے کیا ہوگیا ہے؟ یہ تو مرنے والوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کررہی ہے۔

ماں۔ جانے بھیا! دیکھو تو کیسی صورت بنارہی ہے۔ (آنسو پونچھتی ہے)

نوجوان (لڑکی کو گود میں سے کر اور اس کا بدن ٹٹول کر) ارے، اس کا بدن تو بڑا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔

بڈھا۔ تاپ تو نہیں چڑھی؟

نوجوان۔ تاپ ہی تو چڑھی ہے۔

ماں۔ تاپ! ہائے رام!

لڑکی (بے ہوشی میں) اوہ ماں، ماں، وہ دیکھ میری لچھی ——— لچھی

(ماں کی گود میں جانے کے لئے تڑپتی ہے)

ماں۔ لاؤ، بھیا مجھے دے دو۔ یہ تمہارے پاس نہیں رہے گی۔

(اچانک لڑکی چپ ہو جاتی ہے، ماں اسے گود میں لیتی ہے)

ماں۔ (چونک کر) ارے، اس کا بدن تو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم تو کہتے تھے گرم ہے؟ بیٹی! بیٹی!! او سکھیا!

لڑکی (آنکھیں کھول کر) ماں، ماں بھوت! وہ دیکھو ——— میری ———

ماں۔ بابا ذرا تم تو دیکھو۔ اسے کیا ہوگیا ہے۔ ہاتھ پیر اولے سے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

بڈھا۔ گھبراؤ نہیں۔ باہر میدان کی جگہ ہے۔ کہاں گیا ہے، کون دیکھ آیا ہے۔ کچھ ہوگیا ہوگا۔ سویرا ہونے دو۔ ما درگا کا نام لو۔ اُن کے نام سے سب دکھ دور ہوتا ہے۔

ماں۔ ماں درگا میری سدھ لو۔ ہائے! بیٹی، بیٹی، تو بولتی کیوں نہیں! جانے سویرا کب ہوگا۔ (روتی ہے)

(ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ پتے کھڑکھڑاتے ہیں)

لڑکی۔ ماں! وہ بھوت۔ میں نے کہا تھا، مجھے مت لے چل۔ وہ دیکھ ——— وہ آیا ——— ارے رے رے! دانت نکال رہا ہے ——— مجھے کھا جائے گا ——— ہائے رے ——— رے ——— میری لچھی رے۔ مجھے مت کھا ——— رے ——— رے ———

(تڑپ کر جان دے دیتی ہے)

ماں۔ ہائے بیٹی! (چھاتی پیٹتی ہے)

(سب حیران بیٹھے رہ جاتے ہیں)

مہندی

محفلِ ادب

پہلی شام

بالآخر فضا میں خاموشی چھا گئی، اور صندلی شفق نے ہر شے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، پرندے اور چوپائے خاموشی کے ساتھ بسیرا لینے کے لئے اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ صرف ایک بلبل باقی رہ گئی جو تمام رات طرح طرح کے خوش آئند نغمے الاپتی رہی، رفتہ رفتہ آسمان زندہ جواہرات سے جگمگا اٹھا۔ زہرہ اپنے ستاروں کی بے شمار فوج پر حکمران سب سے علیحدہ جگمگا رہی تھی۔

یکایک چاند ایک شاہانہ پندار کے ساتھ نکلا اور اس نے اپنے عدیم المثال حسن کو بے نقاب کر دیا، تاریکی پر اب اس کی سیمیں شعاعوں کی حکومت تھی۔

آدم نے اس حال میں حوّا سے کہا "میری رفیقہ! رات آگئی، اور ہر چیز آرام کی خواہشمند ہے، ہمیں جسمانی آسائش کا خیال رکھنا لازم ہے، اس لئے کہ خدا نے راحت و مشقت ساتھ ساتھ تخلیق کئے ہیں اور آئندہ نسل انسانی کے لئے ان کا مفہوم "شب و روز" سمجھا گیا ہے ـــــ اب نیند کی اوس ہماری پلکوں کو خواب کے خوشگوار بوجھ سے جھکا دیتی ہے۔ خدا کی دوسری مخلوق تمام دن بیکار، غیر ذمہ دارانہ طور پر پھرتی رہتی ہے اس لئے انہیں آرام کی ضرورت کم ہے انسان اپنا روزمرہ کا معینہ دماغی یا جسمانی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو خدا کی نظروں میں اسے دوسری مخلوق سے علیحدہ اور ہر لحاظ ممتاز بنائے ہوئے ہے برخلاف اس کے اور حیوانات بے کار گھومتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے اعمال پر خدا ابھی متوجہ نہیں۔ حوّا اس طرح مخاطب ہوئی۔

"میرے آقا! میری تخلیق کے راز، تیرا حکم بلا دلیل ماننا میرا فرض ہے، خدا کی یہی مرضی ہے۔ خدا تیرا قانون ہے اور تو میرا اس سے زیادہ نہ جاننا ہی عورت کی بہترین علمیت اور اعلیٰ ترین صفت ہے۔ میں جب تجھ سے مصروفِ گفتگو ہوتی ہوں تو تمام موسمی تبدیلیوں کو بھول جاتی ہوں اور میرے لئے ہر لحہ پیغام راحت ہوتا ہے۔ صبح کا خوشگوار تنفس، طلوع کی دلکش کیفیت پرندوں کے سہانے نغمے، سورج کی بے شمار جھاڑیوں، درختوں پھلوں، پھولوں پر چمکنے والی نورانی مشرقی شعاعیں، بذاتِ خود میرے لئے ایک ناقابلِ اظہار مسرت ہیں۔

بارش کی ہلکی پھواروں کے بعد بیش بہا شبنمی موتیوں میں جگمگاتی ہوئی معطر اور زرخیز زمین، اس کے بعد سہانی خوشگوار شام کی آمد، پھر خاموش رات کا نزول اور اس میں بلبل کے دلکش راگ، چاندنی کی قرمزی شعاعیں، ستاروں کے آسمانی جواہرات غرض ہر چیز مسرت ہی مسرت ہے۔

لیکن پرندوں کے سحر آفرین نغمات میں صبح کا خوشگوار تنفس، سورج کی سطح زمین پر جگمگاتی ہوئی باصرہ نواز شعاعیں، شبنمی موتیوں میں چمکتی ہوئی نوخیز جھاڑیاں اور پھل پھول، ہلکی پھواروں سے نکلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبوئیں، شام کی خوشگواری، رات کا سکون، بلبل کے نغمے، چاند کی قرمزی شعاعیں۔ ستاروں کی جواہراتی چمک دمک —— ہر شے میرے لئے بے معنی ہے،

اگر تو میرے پاس نہیں ہے"

"عالمگیر"

کتاب خانۂ اسکندریہ کے لائبریرین کا خط

ڈمی مٹ ری ایس شاہِ والاتبار کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ جب تونے کتابوں کی فراہمی اور تنظیم ونگرانی لی خدمت میرے سپرد کی تو میں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب عرض ہے لہ اور کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہودیوں کی کتب شریعت بھی درکار ہیں - یہ عبرانی حروف اور اس نوم کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہمارے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابت بھی مناسب احتیاط سے نہیں کی گئی کیونکہ اب تک اُن کو شاہانہ لطفِ توجہ نہیں حاصل ہوا۔ اب یہ ضروری ہے کہ تو اس کے ستند اور صحیح نسخے تیار کرائے۔ یہ شریعت حکمت ودانش سے معمور ہے کیونکہ یہ قانونِ الٰہی ہے۔ اور اسی بنا پر بیساکہ ہکٹیس باشندۂ ابدرا کا خیال ہے، مورخین اور شعرا کے ہاں اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ خود ان گوں نے اس کا کچھ حال لکھا جو اس شرع کے پابند ہیں کیونکہ یہ مقدس قانون ہے اور ناپاک زبانوں سے اس کی شاعت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا التماس ہے کہ تو یہودیوں کے سردار کاہن سے ہر قبیلہ کے چھ چھ ممتاز افراد ورد یگر ماہرانِ شرع کو طلب کرتا کہ ان کی مدد سے ہم ان صحائف کی روح کو پائیں اور ان کے مضامین کی حقیقی نبیر وتفسیر سے واقف ہوں۔ اس طرح تیرے کتب خانہ میں خاطر خواہ ذخیرۂ کتب جمع ہوسکے گا۔

"تاریخ"

ایرانی ماں کا گیت

اُٹھ ماں تجھ پر قربان! اُٹھ کہ اب تو بہت سو چکا! اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اٹھ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

اُٹھ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدانِ جنگ میں بھیج دوں۔ اُٹھ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُٹھ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو اور میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔ اُٹھ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بےکس ہے بیدادرس ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی امیدگاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُٹھ اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر! اٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار ہے! اٹھ میرے دل کے پرتو اُٹھ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے! آہ تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو! میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔

اُٹھ! میری جان کی روح اُٹھ! کیا تو ناقوس کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کے لئے بلا رہے ہیں۔ اٹھ! اور میدانِ جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سربلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آ یا اپنے باپ کی جگہ آزادیٔ وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر۔ اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

"ادبی دنیا"

قافیہ

قافیہ نظم میں آبشار کا کام دیتا ہے۔ خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے، اور اگر قافیہ کو غزل کی طرح خیال کے بہاؤ کی روکنے والی دیوار بنا دیا جائے تو پھر خیال قافیہ پر سے ابل کر کھلکھلا اور ترنم کی دھواں دھار بوچھاڑ کرتا، دوسرے مصرع میں سریلی ہلچل ڈال دیتا ہے اور پھر اس مصرع کے ترنم کو ساتھ لے کر

ئے کے مصرعوں میں قافیہ پر سے چادر کی طرح بہتا، نغمہ بلند کرتا ہوا پورے بند کے بند کو خیال کے تسلسل اور موسیقی
لے اتار چڑھاؤ سے ایک دلفریب زندہ چیز بنا دیتا ہے!"

"مجلہ عثمانیہ"

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل غرور کے مارے پھٹ جائے گا۔ میں
ے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں، اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

زندگی میں جو تلخی اور ناموافقت ہوتی ہے وہ تمام ایک خوش کن ہم آہنگی میں مبدل ہو جاتی ہے اور
ری پرستش ایک خوش و خرم پرندے کے مانند جو دریا کے پار گذر رہا ہو، اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ تو میرے نغمے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں صرف ایک مغنی
کی حیثیت سے تیرے حضور میں آسکتا ہوں۔

میں اپنے نغمے کے دُور رس بازوؤں کے سِروں سے تیرے قدموں کو چھوتا ہوں، جن تک پہنچنے کی
بھی امید نہیں کر سکتا۔

نغمے کی خوشی میں مست ہو کر میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں، اور تجھے جو میرا آقا ہے، دوست کے
ب سے یاد کرتا ہوں،

"اجمل"

انسان کی حقیقت

زمین بہ مقابلہ ان نو نیلے گنبدوں کے ایسی ہے جیسے ایک خشخاش کا دانہ سمندر کی سطح پر، اور تو اس دانے
مقابلہ میں کیا ہے؟ ———— نیوٹن

میں کہتا ہوں! انسان کیا ہے؟ وہ ایک حقیر چیز ہے، ایک مشتِ خاک اور حیاتِ دو روزہ، ایک سانس
ے زندگی اور موت کے درمیان رو کے ہوتے ہے ———— پسکل

"اردو"

تبصرہ

غالب۔ مولفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی، ایچ ڈی، پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔ یہ مرزا غالب کے کلام اور زندگی کی تنقید ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی نقطۂ نظر بھی مغربی پیش کیا گیا ہے۔ شعر کی تعریف اور شاعری کی مثالیں تمام انگریزی سے اخذ کی گئی ہیں۔ حالانکہ قومی اور مذہبی روایات کی بنا پر مشرق اور مغرب کے تخیل میں بہت کچھ فرق ہے جس میں امتیاز کرنا ایک نقاد کا اولین فرض ہے۔

فاضل نقاد کو غالب کے اشعار پر "سخن ناشناسوں" کی تحسینِ بے جا کا بڑا گلہ ہے۔ سب سے زیادہ شکایت انہیں علامۂ بجنوری مرحوم سے ہے جنہوں نے جوشِ عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا کہ "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" اور جب غالب کے پرستار اس فقرے کو دہراتے ہیں تو انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔

غالب کی نسبت اُن کی اپنی رائے یہ ہے کہ دوسرے غزل گو شعرا کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو صوفی اور فلاسفر ظاہر کرتا ہے اور عشق، جام اور شراب کے جادۂ مبتذل پر گامزن ہے، اور اگر کبھی اُس نے کوئی نئی راہ اختیار کی ہے تو وہ قنوطیت کی راہ ہے۔ غالب کی اردو شاعری کو وہ جذبات سے معرا اور تصنع سے پُرخیال کرتے ہیں۔ ایک ستم انہوں نے یہ کیا ہے کہ غالب کے کلام کی کم مائیگی ثابت کرنے کے لئے اس کے بہترین اشعار منتخب کئے ہیں اور دلیل کوئی پیش نہیں کی مثلاً۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ــــ کاش کے ادھر ہوتا عرش سے مکاں اپنا

کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس میں فلسفہ ہی کون سا ہے؟" اور

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ــــ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس میں لفظی چھل بل کے سوا اور کیا رکھا ہے؟" پھر

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور ــــ جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس میں کوئی نئی بات بھی ہے؟"

بہرحال کتاب دلچسپ ہے، حجم ۲۰۴ صفحات قیمت تین روپے۔ جناب مولف سے طلب فرمائیے!

مضامین شرر

واحدی صاحب کا منجن

اکسیر دنداں

یہ منجن اس نسخہ سے بنایا گیا ہے جو ملّا واحدی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کو اُن کی اڈیٹری طبیب کے زمانہ یعنی سنہ ۱۹۱۴ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے عنایت فرمایا تھا اس سے دانتوں اور مسوڑھوں کی تمام خرابیاں اور تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال سے واحدی صاحب اسے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور اپنے شہر کے ہر ضرورت مند کو بھی دیتے ہیں۔ ہر شخص اس کا ثنا خواں ہے اور اسے سب سے اچھا منجن تسلیم کرتا ہے۔ سینکڑوں ہلتے ہوئے دانت اس منجن نے جوڑ دیئے۔ متعدد آدمی ہیں جنہیں پائریا کی شکایت تھی اور ہر کھانے کے ساتھ مسوڑھوں کا خون اور مسوڑھوں کی پیپ پیٹ میں اُتر اُتر کر جن کی صحت کو برباد کر رہی تھی۔ صرف اس منجن کے ملنے سے اُن کے مسوڑے اچھے ہو گئے اور آج وہ خدا کے فضل سے تندرست ہیں۔ جس منجن سے پائریا جیسے موذی مرض کو آرام ہوتا ہو اور جس منجن سے ہلتے ہوئے دانت جڑ جاتے ہوں اس کے دوسرے معمولی فوائد بیان کرنے فضول ہیں۔ یہ خیال کر کے کہ دہلی سے باہر کے لوگوں کے پاس بھی اس منجن کو پہنچایا جائے۔ ہم نے واحدی صاحب سے منجن کا یہ نسخہ مانگ لیا ہے اور لاگت کی لاگت اسے فروخت کر رہے ہیں۔

قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸ر) محصولڈاک ۴ر

ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ نظام المشائخ۔ ۲ کوچہ چیلان۔ دہلی

ہمایوں کا سالگرہ نمبر

پونے دو سو صفحات کا شاندار ذخیرہ علم و ادب

سات سہ رنگ و یک رنگ گراں پایہ تصاویر جنمیں سے ہر ایک کے ساتھ ایک دلکش نظم یا مضمون موجود ہے

سالگرہ نمبر کے بعض دیگر مضامین

زمانہ حضرت ہمایوں مرحوم و مغفور کی بصیرت افروز نظم
آنکھ کا جادو ہمایوں کے مقالہ نگار خصوصی خان بہادر
میاں عبدالعزیز صاحب کے جدت طراز قلم سے ایک
انوکھا افسانہ
کیفِ موسیقی حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک
دل آویز نظم
سائنس اور مذہب کا ملاپ میاں بشیر احمد صاحب بی اے
آکسن کے قلم سے روح اور روحانیت کے مسائل
پر علمی نظر سے ایک جامع و بالغ تبصرہ
مصوری میاں عبدالرحمن صاحب اعجاز کا ایک

دلکش اور پر از معلومات مضمون
ایک نقاب پوش زندگی خواجہ غلام الدین صاحب
ایم۔اے بی۔ای۔ڈی کے قلم سے ایک خیالی
سیرت کا خاکہ
خزاں کی ایک رات روس کے شہرہ آفاق
افسانہ نویس میکسیم گورکی کی ایک شاہکار کا اردو
ترجمہ از منصور احمد
رویائے محبت صفحات جمیل پر میاں بشیر احمد
صاحب کی ایک پر از سوز و گداز نظم
قوتِ فیصلہ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی کا ایک

مفصل و مبسوط عزم آفریں مضمون
کیٹس انگلستان کے بلند پایہ شاعر جان کیٹس کی زندگی
کے حالات اور شاعری کا ایک دلکش تذکرہ مولوی
حامد علی خاں صاحب بی۔اے
بچہ حضرت امین حزیں کی دل آویز فلسفیانہ نظم
الہامات حکیم آزاد انصاری کے پاکیزہ عارفانہ
تخیلات
فلسفہ یاس کے متعلق مولوی حمید احمد خان
صاحب کا ایک عالمانہ مقالہ
جام صہبائی حضرت از صہبائی کی پر کیف رباعیات

ان مضامین کے علاوہ تیس کے قریب دوسرے گراں پایہ مضامین ہیں جن کے عنوان قلت گنجائش کی وجہ سے یہاں درج نہیں ہو سکے ہندوستان کی فاضل خواتین کی نظم و نثر کے بہترین نمونے آپکو ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں ملیں گے۔ قیمت ایک روپیہ مقرر کیگئی ہے۔

مینجر رسالہ ہمایوں ۔ ۲۳ لارنس روڈ لاہور

از کلبۂ احزان خادم خلق

واقعہ ڈنگہ۔ ضلع گجرات پنجاب

وصال حق طلبی ہمنشین نامش باش   کہ بینی وصال خدا در وصال نام خدا

تقریظ از انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

عبارت میں ثقاہت اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ اہل دین اور اپنے مذہب سے محبت و عقیدت رکھنے والے ضرور اسکا مطالعہ کریں۔

تحفۂ خادم خلق مرتبہ و مولفہ جناب سیدن صاحب خادم خلق۔ ملنے کا پتہ۔ ڈنگہ ضلع گجرات پنجاب قیمت عہ محصول ڈاک حجم ۱۵۲ صفحہ تقطیع ۱۸×۲۲ مولف صاحب جلال پور کی جماعت حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایسے رسالے وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جو اخلاقی و مذہبی طور پر مفید ہوں۔ اور رسالہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ خدا۔ وحدانیت۔ برکات روحانی۔ وجود باری تعالیٰ پر استدلال ہمت۔ جفاکشی۔ وغیرہ مختلف عنوانات قائم کرکے ان پر بحثیں کی ہیں۔ مختصر نظمیں اور غزلیں بھی کہیں کہیں ہیں۔ غرض چھوٹے چھوٹے اخلاقی مذہبی مضامین کا ایک کشکول ہے مسلمانوں کے لئے سودمند ہونے میں شک نہیں ہے۔

نیاز نامہ بخدمت جمیع اہل دل مسلمانان بعد از سلام سنت الاسلام۔ نیازمند آپ صاحبان سے اپیل کرتا ہے۔ کہ اس للہی کام میں بپاسداری فرائض دینی۔ مذہبی قومی و اخلاقی اس کتاب کو خود خریدیں اور اس کے خرید اور ہبہ کرنے میں سعی بلیغ فرماکر عنداللہ ماجور و عندالناس مشکور ہوں اور اس سرمایہ کی توسیع بذریعہ خرید کتاب ہذا فرمائیں۔ تاکہ آئندہ بھی اشاعت و تبلیغ کا کام باحسن طریق جاری رکھا جائے۔

موسم گرما کا تحفہ خواص فعل ہضم کو درست کرکے خون صالح پیدا کرتا اور دوران خون باقاعدہ کر دیتا ہے جس سے بفضل ثانی مطلق انسان بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ جگر کی اصلاح کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے بعض کے لئے بھی مفید ہے۔ بالخصوص سکان لاہور اس کا تجربہ کریں قیمت چھ ماشہ۔ عہ ترکیب استعمال آدھ ملیا یا چھاچھ میں صبح سویرے ایک رتی استعمال کیا جائے۔ پرہیز ترشی بادی اور تیل کی اشیا سے۔

پتہ۔ خادم خلق مقیم ڈنگہ ضلع گجرات

اردو کا نیا رسالہ

کامیابی

مسلمانوں کی علمی ایجادی اور اجتہادی قوتوں کو پیدا کرنے ان میں اولوالعزمی، عالی حوصلگی، جرات و استقامت محنت و جفاکشی ایثار و قربانی کے اوصاف پیدا کرنے اور ان کو ترقی اور کامیابی کے راستوں پر لگانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

نہایت ہی عمل آموز اور کار آمد رسالہ ہے۔ اور اس کا مطالعہ بچوں عورتوں اور جوان کے لئے بیحد ضروری ہے۔

نمونہ دیکھ کر آپ انشاء اللہ بہت پسند کریں گے۔ ابھی ایک کارڈ نمونہ کیلئے لکھ دیجئے۔

مینجر کامیابی دفتر حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹیڈ دہلی

جامِ صہبائی

حضرت اثر صہبائی کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے آپ کی حیات افزا اور روح پرور رباعیات ملک کے مختلف بلند پایہ رسائل میں شائع ہو کر نقادان فن سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں جام صہبائی کی خوبیوں کی ضمانت کے لئے حضرت کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت صرف ۸؍

ملنے کا پتہ

جلال الدین اکبر الراعی بلڈنگ بیرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے +

۲۔ علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے +

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیئے جاتے +

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۹۳۶ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے، اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا +

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے +

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر +

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے +

مینجر رسالہ ھمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی علم الدین مینجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں۔ بی، اے
منصور احمد }

فہرست مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۴

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء

تصاویر:- ۱- کوہ سہسرام کا ایک دلکش منظر - ۲- حکیم عمر خیام

خلوت و جلوت

اپنی خلوت میں الگ بیٹھا ہُوا اپنی ہی چار دیواری میں گھرا ہُوا میں دنیا و عقبیٰ اور حیات و ممات کی الجھنوں کے سلجھانے میں مصروف ہوں۔ دنیا کو کس نے بنایا اور پھر اس کے پیچھے عقبیٰ کیوں ہوئی اور اس کے پہلے کیا تھا اور نہ تھا تو کیوں نہ تھا؟ اس سب کچھ کے اندر زندگی کی رَو کیسے جھنکی اور جھنکی تو پھر اک ہوا کے جھونکے کی طرح کس لئے اس چمن زار میں اُدھر سے آئی اور اِدھر سے چل دی؟ یہ زندگی جس نے بیل بوٹوں کو اگایا یا پرند چرند کو اڑایا دوڑایا یہ مجھ میں آکر کیوں نری سانس لینے والی چلنے پھرنے والی کھانے پینے بولنے چالنے والی جان نہ بنی رہی؟ میرے اس دیس کے خاکی و ارضی جسم میں آکر یہ پردیسن کس سوچ بچار میں پڑ گئی؟ دیکھتی ہے سنتی ہے سوچتی ہے اور سر بگریباں ہو جاتی ہے! کیا یہ اس چھوٹے سے قید خانے میں بند کر دی گئی جس کی کھڑکیاں آنکھیں ہیں جو ہزاروں اور کروڑوں میل کے نظاروں کا پل کے پل میں عکس اتار لیتی ہیں جس کی غلام گردش دماغ ہے جو ایک چشم زدن کے ہزارویں حصے میں اُس دور دراز حریم ناز کے دروازے پر جا دستک دیتا ہے جس کا رہنے والا شاید اسی سبک رفتار کے ساتھ کائنات کی وسعتوں میں کوئی آنکھ مچولی سی کھیل رہا ہے؟

اپنے گھر میں اس گھر والی سے یہ باتیں پوچھتا ہوں تو یہ اندر ہی اندر ایک کرب سا ایک بے چینی سی پھیلا دیتی ہے۔ میں اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہوں اور میری نگاہ اُن چند کتابوں پر جا پڑتی ہے جو میری الماری کی سچی زینت اور میری ہستی کی ایک جھوٹی شیخی کا موجب ہیں۔ اپنی بے تابی میں یکے بعد دیگرے میں اُن کو اٹھاتا ہوں۔ ایک کہتی ہے کائنات کا بنانے والا! اچھا تو پھر اُس کا بنانے والا؟ اور پھر اُس بنانے والے کا بنانے والا؟ فضول لغو بے معنی! دوسری کہتی ہے رحیم و رحمٰن؛ عالم و عادل؛ نیک و پاک؛ اور اس پر یہ برائیاں اور مایوسیاں یہ چھوٹے بڑے کے جھگڑے یہ کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم یہ تکلیفیں اور مصیبتیں؟ بے عقلی کج فہمی خوش گمانی!

جاہل مریدوں کم عقل صوفیوں اور بے علم انسانوں کو طعن و تشنیع کرتا ہُوا اپنے نفس سے باغی و بیزار ہو کر میں گھر سے نکل پڑتا ہوں لیکن اپنی خلوت سے یوں پہلو بچاتا ہُوا میں کسی کی جلوت سے دوچار ہو جاتا ہوں! اب محض اک میں ہی وہاں نہیں بلکہ یہاں تو مجھ سے کروڑوں اَور بھی ہیں اور یہ پھیلتی ہوئی زمین اور یہ اُٹھتے ہوئے پہاڑ اور یہ سورج کی کرنیں اور یہ بادلوں کے پرے اور دور دور وہ سمندر اور وہ صحرا اور وہ غار اور وہ چوٹیاں اور پھر وہ چاند اور تارے اور اُن کی درمیانی مسافتیں اور اور کوئی مانے نہ مانے لیکن اَن دیکھی اَن سنی اور اَن بوجھی خدا ہی جانے کیا کیا کچھ!!!

"خلوی"

جہاں نما

جرمنی اور انگلستان کا لٹریچر

جریدہ "لونگ ایج" کے بہرۂ ادبیات میں جرمنی اور انگلستان کے لٹریچر پر ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"برلنر ٹیبلیٹ" اور "مانچسٹر گارڈین" نے جرمنی اور انگلستان کے موجودہ ادب پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ جرمن اخبار لکھتا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے دوران میں ہماری مطبوعات کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ہے اور انگریزی اخبار نے یہ قیافہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اب سے ایک سو سال بعد موجودہ برطانی افسانہ نویسوں میں سے کون کون سے بہت زیادہ مقبول ہونگے۔

جنگِ عظیم سے پہلے اور اُس کے بعد بھی جرمنی برابر کتابوں کی پیداوار میں سب قوموں سے بڑھا ہوا تھا۔ صرف ۱۹۱۹ء میں وہاں ۱۵۸۷۶ کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ۱۹۲۲ء میں اُن کی تعداد ۲۲۶۱۴ تک پہنچ گئی۔ دو سال بعد تعداد گر کر ۱۸۰۰۳ رہ گئی، لیکن ۱۹۲۵ء میں پھر ۲۴۸۶۰ کتابیں طبع ہوئیں اور ۱۹۲۶ء میں ۲۶۹۵۱ ۱۹۲۷ء میں نئی اور پرانی جتنی کتابیں طبع ہوئیں اُن کا میزان ۳۱۰۲۶ تھا اور ۱۹۲۸ء میں ۲۷۷۹۴۔ ہمارے اپنے ملک (امریکا) میں سالانہ اوسط دس ہزار سے کچھ کم ہی رہتی ہے اور برطانیہ عظمیٰ میں اس سے ذرا بڑھ کر۔

گزشتہ سال کی جرمن مطبوعات کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ادبِ لطیف کی کتابیں دوسری اصنافِ کتب سے تقریباً دوگنی شائع ہوئیں۔ ان کی تعداد ۴۵۰۰ کے قریب تھی، دوسرے درجے پر مدرسے کی کتابیں اور تیسرے درجے پر صنعیات اور دینیات کی کتابیں تھیں۔ گزشتہ سال کی بہ نسبت دو ہزار سے اوپر کتابیں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مضامین پر نکلیں۔ اگرچہ رومن حروف کا رواج ہر جگہ بڑھ رہا ہے لیکن جرمنی میں اب تک نصف سے زیادہ کتابیں گوتھک حروف میں چھپتی ہیں۔ تراجم کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال ان کی تعداد ۱۶ فیصدی سے متجاوز ہوگئی۔ پانچ سو سے زائد کتابیں انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئیں۔ ۲۸۸ فرانسیسی سے اور ۱۶۷ روسی سے۔

انگلستان کے ادبی کوائف ماضی کی بجائے مستقبل کے متعلق ہیں۔ "مانچسٹر گارڈین" میں یہ معلوم کرنے کے لئے ایک مقابلہ جاری تھا کہ ۲۰۲۹ء میں عہدِ حاضر کے کون کون سے برطانی افسانہ نویس سب سے زیادہ مقبول سمجھے جائیں گے۔ مقابلہ میں شامل ہونے والے ہر شخص کو چھ افسانہ نویسوں کے نام تحریر کرنے کی اجازت تھی جن کی تصانیف اُن کی رائے میں آج سے سو سال بعد سب سے زیادہ پڑھی جائیں گی کسی فہرست میں وہ چھ نام یکجا موجود نہ تھے جو آخر مقبول ترین ثابت ہوئے۔ لیکن اول درجے کا انعام اُس شخص کو ملا جس نے ویلز، بینٹ، جارج مور، گالزوردی، شیلا کے سمتھ، اور آر ایچ ماٹرم کے نام لکھے تھے۔ پہلے بیس ناموں کی فہرست یہاں درج ہے، اور ساتھ ہی اُن آرا کی تعداد بھی دی گئی ہے جو ہر ایک کے لئے موصول ہوئیں۔

گالزوردی	۱۱۸۰
ویلز	۹۳۳
بینٹ	۶۵۴
کپلنگ	۴۵۵
بیری	۲۸۶
وال پول	۲۳۳
کے سمتھ	۱۹۸
جارج مور	۱۶۵
برنارڈ شا	۱۱۰
کانن ڈائل	۱۰۱
آر ایچ ماٹرم	۷۹
جان بوشن	۶۳
ڈی ایچ لارنس	۶۱
چسٹرٹن	۶۰
الڈوس ہکسلے	۵۰
ہال کین	۴۸
ہیز فیلڈ	۴۶

لاک	۴۶
روز میکالے	۴۱
فلپاٹس	۳۸

برنارڈشا کو زیادہ بلند جگہ اس لئے حاصل نہیں ہوئی کہ اُس کی شہرت کا انحصار افسانے کی بجائے ناٹک پر ہے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ہکسلے اور لارنس کو زیادہ آرا کیوں حاصل نہ ہوئیں۔ یہ امر بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ ای ایم فاسٹرکو ۳۰، ورجینیا ولف کو ۲۱، کامٹن میکنزی کو ۱۶ اور جیمس جائس کو دس سے بھی کم آرا ملیں۔ امریکا والے یہ دیکھ کر بھی حیران ہونگے کہ مس سمتھ کو ایک کافی بلند مقام ملا ہے لیکن اس کی مقبولیت کی یہ وجہ ہے کہ اُس نے اپنی قابلیت کو اپنے محبوب وطن کے مناظر کے بیان کے لئے وقف کر رکھا ہے اور یہ بات انگریزوں کو بہت بھاتی ہے۔ امریکا کے اہلِ قلم اس مقابلے میں شامل نہ تھے۔

چینیوں کی "ذہانت"

چین کے کئی ایک اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ چینی پولیس نے قیدیوں کی تعذیب کے لئے ایک برقی مشین منگائی ہے۔ ان اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ طریقِ عمل بین الاقوامی آبادی کی پولیس کی تقلید میں شروع کیا ہے، لیکن جب کپتان مارٹن کمشنر پولیس سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے، اس پر عمل نہیں کیا جاتا اور اس کی اجازت کبھی نہیں دی جائے گی۔ بعض قیدیوں نے صوبجاتی عدالتوں میں یہ شکایت کی ہے مگر جب عدالت نے تحقیقات کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ نکلی۔"

کرنل یوآن جو شنگھائی میں شعبۂ امنِ عامہ کے ڈائرکٹر ہیں اغوا اور ڈکیتی کے بڑھتے ہوئے حادثات کے پیشِ نظر یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس سے کم درجہ کی کوئی سزا ان رہزنوں کی سرکوبی نہیں کرسکتی اور نہ اس کے بغیر امنِ عامہ کا قیام ممکن ہے۔ جن جن مجرموں کو جسمانی سزا نہیں دی گئی اُن کے معاملے میں ترغیب و تحریص کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں، انہوں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور معاملہ کی حقیقت واضح نہیں ہوسکی۔ چونکہ جسمانی سزا حکومت کے احکام کے خلاف ہے اس لئے کرنل موصوف کی تجویز سے اور جنرل چنگ کی منظوری سے مجرموں کی تعذیب کے لئے ایک ایسی برقی مشین خریدی گئی ہے جس کے دو کھمبوں کے ساتھ منفی اور مثبت تاریں لگی ہوئی ہیں۔ ہر تار کے سرے پر دھات کا ایک دستہ ہے۔ قیدی کے کپڑے اتروا کر اسے ایک لکڑی کی سیڑھی سے مضبوطی کے ساتھ کس دیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ سینے پر رکھے جاتے ہیں اور ان میں

یہ دھات کے دستے دے دیئے جاتے ہیں۔ پھر بجلی کی رو کھول دی جاتی ہے اور وہ مجرم کے سارے بدن میں ایسی ناقابلِ برداشت سنسنی پیدا کرتی ہوئی گزرتی ہے کہ وحشی سے وحشی ڈاکو بغیر کسی مزید کوشش کے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔

آفتاب

آفتاب ہماری دنیا کے لئے توانائی کا سرچشمہ ہے۔ توانائی کے وہ تمام وسیع خزانے جو کوئلے اور تیل میں پوشیدہ ہیں سبز پتوں نے انہیں سورج کی روشنی ہی سے اخذ کیا ہے۔ پروفیسر فریڈ ایم ڈیلانو کے قول کے مطابق آفتاب کی اس توانائی کی مقدار جو ہر روز زمین تک پہنچتی ہے اُس توانائی کے برابر ہے جو آٹھ ارب ٹن کوئلے سے برآمد ہو۔

صرف ایک دن کی دھوپ سے اگر کام لیا جا سکے تو ساری دنیا کے کارخانے، ریل گاڑیاں اور دخانی جہاز بیس ہزار سال تک چل سکتے ہیں۔

ایک مربع گز قطعۂ زمین پر جو تپش دس منٹ میں پڑتی ہے وہ ایک کوارٹ پانی کو ابال دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن چونکہ ابھی ہم نے اس سے کام لینا نہیں سیکھا اس لئے اس کی تقریباً تمام کی تمام مقدار ضائع چلی جاتی ہے۔ سورج کی تپش اس قدر تیز ہے کہ ۹۹ فی صدی شیشے میں سے گزر جاتی ہے۔ تپش ایک ایسے ڈبے میں جمع کی جا سکتی ہے جس کا ڈھکنا شیشے کا ہو اور جو اندر سے کالا ہو۔ لارڈ ہرشل ایک ایسے ہی ڈبے میں سورج کی تپش سے انڈے پکا لیا کرتے تھے۔ روشن ملکوں میں استعمال کا پانی گرم کرنے کے لئے دھوپ ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ دھوپ سے پانی گرم کرنے کے آلات فلوریڈا اور کیلیفورنیا میں کثرت سے رائج ہیں۔

ذرّے کی جسامت

آخر حکما نے دوسرے رخت و جنس کی طرح ذروں کو بھی تول اور ناپ لیا ہے۔ ماونٹ ولسن کی رصدگاہ کے ڈاکٹر ولسن کہتے ہیں کہ انسان کو ذرّے اور ستارے کی درمیانی منزل میں نصف راستے پر سمجھنا چاہئے۔ دس کھرب کھرب کھرب ذروں سے ایک آدمی کی تعمیر ہوتی ہے اور ایک سو کھرب کھرب کھرب انسانوں کا مادہ ایک اوسط درجے کے ستارے کے برابر ہوتا ہے۔

ذرے کا قطر انچ کے دس کروڑویں حصے سے بھی کم ہے۔ بہ مقابلہ ایک گالف کے گیند کے ذرے کی اضافی جسامت اتنی ہی ہے جتنی گالف کے گیند کی زمین کے مقابلے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گیند کے ہر ذرے کو گیند کے برابر کر دیا جائے تو گیند زمین کے برابر ہو جائے گا۔

م
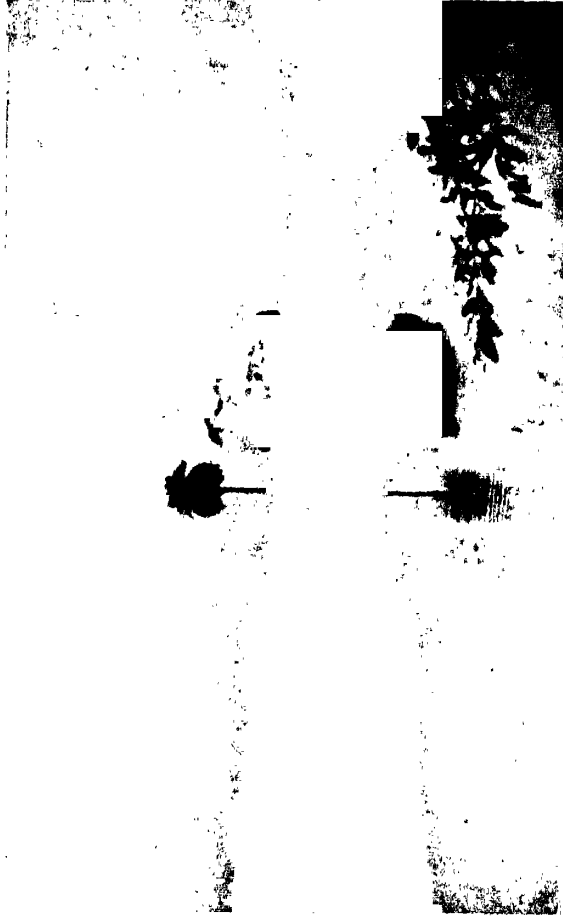
Photo by Shahabuddin Rahmatullah

کوہ سہسرام کا ایک دلکش منظر

اک چشمۂ شیریں ہے رواں کوہ کے اوپر فرہاد کا باقی ہے نشاں کوہ کے اوپر

حکیم عمر خیام

CALCUTTA
ART PG WORKS
LAHORE

عمرِ خیّام

اس دنیا میں ہر شخص مسرت طلب پیدا کیا گیا ہے۔ آدمی پر جو کچھ آلام و مصائب گزرتے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے، اور ان میں تا بمقدور تخفیف کرنے کی دلی خواہش قلبِ انسان میں ہمیشہ مستور رہتی ہے۔ آج جو چیز نئی ہے کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج پیدا ہوا ہے وہ کل مرجائے گا، جہاں آج بہار ہے وہاں کل خزاں ہوگی۔ انہیں مشاہدات کی بنا پر آدمی کے دل میں اس وقت خود بخود سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں جب اس کی عمر ذرا ڈھلنے لگ جاتی ہے اور وہ عہدِ شباب سے نکل کر پیری میں قدم رکھتا ہے۔

یہ دنیا کیا چیز ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ موت کیا چیز ہے؟ زندگی کیا چیز ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ اور کہاں جائیں گے؟ زندگی کا اعتصام کیا ہے اور اختتام کیا ہوگا؟

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ان سوالات کا تشفی بخش جواب کسی نے نہیں دیا ہے۔ مشہور ہیئت دان اور فلسفی شاعر عمر خیام نے ان رموز و نکات کو اپنی لطیف رباعیات میں حل کرنے کی جوسعی کی ہے، وہ قابلِ داد ہے اور اسی بنا پر آج وہ دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔

بقول اس کے روح ایک جنسِ لطیف ہے جس کا علاقہ جسم سے سوا ذات باری سے براہِ راست ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ روح کو دنیا کی تمام کشمکشوں سے پاک رکھو۔ طبیعت پر کبھی غم، تردد، افسوس، فکر اور طمع کا بار نہ ڈالو۔ ہمیشہ بے نیاز رہو۔ ایثار اور قربانی کی حقیقی روح اپنے اندر پیدا کرو۔ اگر تم میں ایثار کا جذبہ موجود نہ ہوگا تو تمہاری روحانیت تباہ ہو جائے گی۔

عمر خیام کسی ایک خاص مذہب و مسلک کا پیرو نہیں ہے۔ اس کے لئے عام مذہبی معتقدات بہت اچھے ہیں، اور عالمگیر مذہب کا وہ قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صداقت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے وقف نہیں ہے۔ خدا نے تمہیں جو دل دیا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تم حق و باطل کی تصویر من و عن دیکھ سکتے ہو۔ "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" اس کا خیال نہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا قائل ہے کہ جو کچھ واقعاتِ حیاتِ انسانی میں گزرتے رہتے ہیں وہ سب تقدیرِ الٰہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ بغیر خدا کی مرضی اور حکم کے پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لہٰذا ہمیں جب کوئی تکلیف پہنچے، یا راحت و کامرانی نصیب ہو تو یہی یقین ہماری تسکینِ قلب کا ضامن ہوگا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

انسانی زندگی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول کی پنکھڑیوں پر قطرہ ہائے آب ہوتے ہیں۔ ذرا ہوا کا جھونکا آیا، قطرہ پھسل کر دریا میں مل گیا، اور پھر وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ لہٰذا انسان کی قابلیت، حسن، شجاعت، دولت، حشمت، سب فانی اور چند روزہ ہے، اگر بقائے دوام حاصل ہے تو صرف اس کی روح کو۔ عمر خیام کو خدا پر انتہائی توکل ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا ہمیشہ معترف رہتا ہے اور توبہ کرتا رہتا ہے۔

عمر خیام کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ باوجودیکہ تنگ خیال اور متعصب ملاؤں کے درمیان اس کی پرورش اور تربیت ہوئی، تاہم ذ[؟] تعصب اور مذہبی امتیاز سے بالکل مبرا اور منزہ رہتا ہے۔

تخیل کی رفعت اس کے کلام کی ایک خاص شان ہے۔ اس کے جامِ سفالی کے ایک ایک ذرے میں ہزاروں خوبصورت چہرے، خندہائے گل مسرت و کامرانیٔ حیات ملے ہوئے ہیں، جو کبھی خاک میں مل گئے اور پھر کمہار نے اُن کی خاک کا جام تیار کیا! اسی طرح خیام کے کاشانے کی ایک ایک اینٹ میں غرور و تمکنت اور شاہانہ اقتدار والے تاجداروں کے سر کی خاک ملی ہوئی ہے۔

عمر خیام باوجودیکہ فضل و علم میں کامل ہے، تاہم اپنے آپ کو انتہائی کسرِ نفسی سے جاہلِ مطلق تصور کرتا ہے۔ اُس کا مقولہ ہے۔

تمہارا آخری مقصد خدا کی ذات ہونی چاہئے

حسن عزیز جاوید

ذوقِ شاعری

تھوڑی دیر کے لئے شاعری کی بحث سے بالکل الگ ہٹ کر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ "مذاق" یا "ذوق" جسے انسان کی دماغی خوبیوں میں "جمالی" نقطۂ نظر سے سب سے بہتر تصور کیا جاتا ہے دراصل ہے کیا چیز؟ مختصر الفاظ میں یہ تعریف پیش کی جا سکتی ہے کہ "ذوق اُس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ ہم خوبصورت چیزوں کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں"۔ قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ذوق کوئی "اندرونی حاسّہ" ہے جو حسن کے اثر کو قبول کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ یا اس قوت کا تعلق عقلی براہین اور خارجی دلائل سے ہے! یعنی ذوق کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے یا تعقل سے؟ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے تجربہ سے دریافت کرنا پڑے گا کہ جب ہم کسی خوبصورت چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم پر اُس کے حسن کا اثر کیونکر اور کس طرح کام کرتا ہے؟ آیا اس قلبی اثر کے لئے ہم اپنے فطری وجدان کے ممنون احسان ہوتے ہیں یا عقل اور تمیز کی عقدہ کشائی کے؟ جب ہم کوئی روح افروز منظر دیکھتے ہیں یا کوئی تڑپا دینے والا گیت سنتے ہیں تو کیا ہم پر ان چیزوں کا محض اس لئے اثر ہوتا ہے کہ چند مخصوص دلائل کی بنا پر وہ منظر قابلِ ستائش قرار پاتا ہے اور گیت سے محظوظ ہونے کے لئے ہمارے پاس متعدد عقلی وجوہ موجود ہوتی ہیں۔

ہمارا تجربہ ان سوالات کا یہ جواب دیتا ہے کہ خوبصورت مناظر یا سامعہ نواز صداؤں سے اثر پذیر ہوتے وقت ہمارا دماغ کبھی کسی منطقی استدلال کی ادھیڑبن میں الجھا ہوا نہیں رہتا، نہ ہمارا ذہن اس وقت دلائل اور براہین کے ذریعہ ہمیں کسی عقلی نتیجہ کی راہ دکھانے میں مصروف ہوتا ہے بلکہ ہم بالکل وجدانی طور پر غیر محسوس طریقے سے حسن کا فوری اثر اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ بسا اوقات حسن کے بہت گہرے اثر کے باوجود ہم یہ تک بتانے سے بالکل قاصر رہتے ہیں کہ اس شدید اثر کی کونسی کھلی ہوئی اور نمایاں وجہ ہے؟ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "ذوق" کا تعلق "وجدان" سے ہے جو تمام تر ایک اندرونی قوت ہے۔ ذوق کے وجدانی ہونے کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ حسن سے متاثر ہونے کے معاملے میں فطرتاً کائنات کے تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ نیچر کے حسین نظاروں اور نغمہ و موسیقی کی دل کش صداؤں سے جہاں ایک طرف حقائقِ عالم کا رمز شناس فلسفی لطف اٹھاتا ہے وہاں دوسری طرف ہل

چلانے والا کسان اور بھیڑیں پالنے والا چرواہا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عمدہ خوشبوؤں اور خوشنما رنگوں سے جس طرح ایک پڑھا لکھا جوان آدمی محظوظ ہوسکتا ہے اسی طرح ایک مدرسہ کے ناتجربہ کار لڑکے کے لئے بھی یہ چیزیں اثر اور لطف سے خالی نہیں۔ خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لئے بچے اور بوڑھے، تعلیم یافتہ اور جاہل، امیر و غریب کی کوئی قید نہیں،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "جمال" کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا یعنی کسی پر کم ہوتا ہے اور کسی پر زیادہ لیکن بہرحال خواہ کم ہو خواہ زیادہ لیکن ہوتا ضرور ہے ۔ یہاں پر سوال صرف "کم اور بیش" یا "مقدار" کا رہ جاتا ہے لیکن اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حسن سے متاثر اور محظوظ ہونے کی خاصیت تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو وصف تمام انسانوں میں مشترک ہو وہ کبھی کوئی خارجی چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر اُسے اندرونی اور فطری ہونا چاہئے۔ بس یہ امر ثابت ہوگیا کہ "ذوق" بلا شبہ ایک وجدانی قوت کا نام ہے۔

ذوق کی اصلی بنیادیں تو دراصل اُس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جسے وجدانِ قلب کہتے ہیں لیکن اگر ہم ایک ترقی یافتہ ذوق کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ ذوق کے اندر جو عناصر شامل ہیں اُن کا پہلا اور بنیادی حصہ تو "وہبی" ہے اور دوسرا اضافہ حصہ "اکتسابی" ہے۔ ذوق کا وجود ہوتا تو تمام انسانوں میں فطری طور پر ہے لیکن سب کا ذوق یکساں اور ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ اکتسابی ذرائع سے ارتقا اور بالیدگی حاصل کرتا رہتا ہے اور یہیں سے تمام انسانوں میں ذوق کی کمی بیشی کا یا اچھے اور بُرے مذاق کا اختلاف شروع ہوجاتا ہے

بعض لوگوں میں ذوق کی قوت بہت ہلکی اور کمزور ہوتی ہے۔ وہ حسین چیزوں سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں میں صرف حسن کی بہت موٹی موٹی اور نمایاں خوبیوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جمال کے لطیف پنہاں اور غیر نمایاں پہلوؤں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں میں ذوق اس قدر قوی ہوتا ہے کہ حسن کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک رخ بھی اُن کی نگاہِ جستجو سے پوشیدہ نہیں رہتے۔

اگر ہم ذوق کی اس کمی و بیشی اور مقدار کی عدم یکسانیت پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس اختلاف کے عموماً دو بڑے اسباب ہوتے ہیں:۔

(۱) داخلی۔

(۲) خارجی

۱- داخلی اسباب سے میری مراد یہ ہے کہ تمام انسان اپنی دماغی ساخت اور ذہنی قویٰ کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور چونکہ وجدان کی عمدگی کا دماغی قوٰی پر بہت کچھ انحصار ہے اس لئے فطرتاً بعض لوگوں میں حسن سے متاثر ہونے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔

۲- خارجی اسباب سے میرا یہ مطلب ہے کہ چونکہ اکتسابی ذرائع سے ذوق کی ترتیب کی جا سکتی ہے۔ اس لئے جن لوگوں کو اپنے ذوق کی بالیدگی کے لئے موافق حالات میسّر آتے ہیں۔ اُن کا مذاق دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظاہری حالات اور تعلیم و تمدن کے فرق کی وجہ سے ذوق میں عدم یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ ذوق پر تعلیم اور تربیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہ حقیقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جس میں نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیت موجود ہے۔ آیئے اب ہم یہ دریافت کریں کہ ہم کون کون سے طریقوں اور ذریعوں سے مذاق کو بالیدہ کر سکتے ہیں اور نشو و نما کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مذاق کے لئے کون سی تدابیر معین اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ انسانی قوتوں کو ترقی دینے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ اُن سے مسلسل اس کثرت سے کام لیا جائے کہ یہ کثرتِ استعمال اُن قوتوں کے لئے ورزش کا سامان بہم پہنچا دے۔ جس طرح جسم کو تندرست حالت میں رکھنے اور بدن کی قوت بڑھانے کے لئے جسمانی ورزش نہایت ضروری چیز ہے ٹھیک اسی طرح ذہنی قوتوں کو نشو و نما بخشنے کے لئے بھی لازمی ہے کہ ہم انہیں استعمال کی کثرت سے برابر طاقت پہنچاتے رہیں۔ ورزش جس طرح جسمانی قوتوں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح دماغی اور ذہنی قوتوں کے لئے بھی فائدہ رساں ہے۔ اور تو اور خود ہمارے حواسِ خمسہ کا یہ حال ہے کہ ان پر استعمال کی کمی اور زیادتی کا پُورا پورا اثر پڑتا رہتا ہے جن لوگوں کو اپنے پیشہ کے لحاظ سے روزمرہ کی زندگی میں کسی مخصوص حس سے زیادہ کام پڑتا رہتا ہے اُن کی وہ حس دوسرے حواس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی بصارت جو مشین کے باریک کل پرزوں کا کام کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر قوی ہوتی ہے جس گھڑی کے پرزوں میں ہمیں باوجود غور کے کوئی خرابی یا بے ترتیبی نہیں دکھائی دیتی اس میں ایک مشاق گھڑی ساز کی آنکھ بیک نظر نازک سے نازک نقص کی گرفت کر لیتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ عطر کے کارخانوں میں ملازم ہوتے ہیں اور جنہیں روزانہ مختلف قسم کے عطروں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اُن

کاشامہ اس درجہ تیز ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحہ میں خوشبوؤں کے باریک سے باریک فرق کو بھی پہچان جاتے ہیں۔

جب حواس کو مشق اور کثرتِ استعمال سے اس قدر قوت پہنچائی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ذوق کو اس قسم کے خارجی ذرائع کی مدد سے ترقی نہ دی جا سکے۔

مثال کے طور پر موسیقی کے ذوق کو لے لیجئے۔ ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ذوق حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ارتقا کے مدارج سے گذرتا رہتا ہے۔ بالیدگی اور نشوونما کی استعداد جس قدر اس مذاق میں ہوتی ہے کسی دوسری قوت میں نہیں۔ مبتدی کو شروع شروع میں صرف سیدھی سادی اور عامیانہ چیزوں میں مزہ آتا ہے۔ اس منزل میں اُسے فن کی بلند چیزوں سے مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ تک کثرت کے ساتھ گانا سنتے سنتے وہ راگ راگنیوں کے سطحی فرق سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس منزل سے بھی گزرنے کے بعد اُسے پست اور بلند چیزوں میں امتیاز ہونے لگتا ہے اب ادنیٰ درجہ کی عامیانہ چیزیں جنہیں وہ کچھ عرصہ پیشتر اس قدر دلچسپی سے سنا کرتا تھا اُسے محظوظ نہیں کرتیں اُسے بلند تر چیزوں کی تلاش پیدا ہونے لگتی ہے۔ غزل سے بتدریج ٹھمری اور دادرا، پھر دادرا سے ٹپہ اور ترانہ کی نوبت آتی ہے یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے سابقہ پڑتے پڑتے مذاق میں اور زیادہ بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے تو ان سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ذوق کی بلندی اس منزل پر پہنچ کر دھرپد اور خیال کی سی نازک فنی چیزوں کی طلبگار ہو جاتی ہے۔

جو لوگ فنِ مصوّری کے مبصر ہوتے ہیں انہیں ابتدائے شعور ہی سے اس صنعت میں دخل نہیں ہوتا۔ مذاق کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے انہیں بھی بالکل اسی طرح صدہا منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جس طرح موسیقی کے اہلِ نظر کو۔

یہاں تک جو بحث ہوئی وہ مجموعی حیثیت سے اس ذوق کے متعلق تھی جس کے ذریعہ سے ہم ہر قسم کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنی بحث کو صرف اُس ذوق تک محدود کریں گے جس کا تعلق محض شعر شاعری اور سخن فہمی سے ہے۔

اب ہمیں یہ بات دریافت کرنا چاہئے کہ ذوقِ شاعری کو سدھارنے اور ترقی دینے کے کیا ذرائع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذوقِ شاعری چونکہ "مجموعی ذوق" ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کو ترقی دینے کے جو طریقے ہیں اُن کی شاہ راہیں بھی بالکل وہی ہیں جن سے مجموعی ذوق کو ارتقائی مدارج میں گذرنا پڑتا ہے، شاعری کے بہترین شاہکاروں کے مطالعے سے اُن کے باہمی موازنہ اور مقابلے اور مختلف قسم کے کلام کو کثرت کے ساتھ پڑھنے سے ٹھیک اسی طرح مذاق کو درست کیا جا سکتا ہے جس طرح نغمے کے شوقین باکمال استادوں کا گانا سُن سُن کر موسیقی کے ذوق کو سنوارتے ہیں۔

ابتدا میں جب کوئی شخص پہلی مرتبہ شاعری کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کا وجدان حد درجہ کند اور ضعیف الحس ہوتا ہے۔ اول اول شعر کی لطافت اس پر بہت خفیف اثر کرتی ہے۔ اُسے عموماً عامیانہ قسم کے اشعار محظوظ کرتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہوتی ہے جس میں اُسے اعلیٰ درجہ کے شعر اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ صاف صاف یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ جس کلام کا وہ مطالعہ کر رہا ہے اس میں کون کون سی نمایاں خوبیاں یا کون کون سے کھلے ہوئے عیوب ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کلام کو جانچنے کے لئے وہ کس چیز پر اپنے فیصلے کا انحصار رکھے زیادہ سے زیادہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اسے حظ اور انبساط حاصل ہؤا یا نہیں۔ لیکن اس شخص کو اگر شاعری سے کثرت کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے تو اس کے مطالعہ کے پہلو بہ پہلو اُس کے مذاق میں بھی ترقی پیدا ہوتی جائے گی۔ جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اُس کا ذوق بھی سدھرتا جائے گا۔ تھوڑے دنوں کی مشق اُسے اس قابل بنائے گی کہ وہ کسی نظم کو پڑھ کر اُس کے متعلق نہ صرف یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ اچھی ہے یا بُری بلکہ وہ نظم کے تمام پہلوؤں کو جزواً جزواً پیشِ نظر رکھ کر اُس کی خوبیوں کو سمجھ سکے۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوقِ شاعری کو بالیدہ کرنے کے لئے مطالعہ بہت ضروری چیز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس مخصوص قوت کی نشو و نما کے لئے ہمیں اپنے دماغ کو ادبی ورزش بہم پہنچانا ضروری ہے۔

ذوق کو بالیدہ کرنے کا ایک دوسرا اہم طریقہ اور بھی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست انسان کی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز سے ہے۔ ہم کسی کلام کے محاسن کو اُس وقت تک حقیقی طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کی مدد سے اچھائی اور برائی میں فرق محسوس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اپنی سمجھ کے ذریعہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُس کو اچھا یا بُرا سمجھنے کے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں؟

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جسے دو طریقوں پر بالیدہ کیا جا سکتا ہے

(۱) کلام کے متواتر مطالعہ کے ذریعہ دماغ کی ورزش سے۔

(۲) کلام کو عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز کے ذریعہ پرکھنے سے۔

اگر ہم مذاقِ شاعری کی مکمل ترین نوعیت پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ مذاق میں عموماً دو بہت نمایاں اور اہم خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اول لطافتِ مذاق۔ دوئم صحتِ مذاق۔

لطافتِ مذاق اور صحتِ مذاق میں بہت نازک اور لطیف لیکن نہایت اہم فرق ہے۔ لطافتِ مذاق کا تعلق تمام تر اُس فطری وجدان کی عمدگی پر ہے جس پر ذوق کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔ وجدان کی عمدگی کا معیار یہ ہے کہ کلام کی وہ خوشنمائیاں بھی جو بے حد نازک اور غیر نمایاں ہونے کی وجہ سے ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں ہمیں اپنی

تمام دلفریبیوں کے ساتھ اپنے اصلی رنگ میں عریاں نظر آجائیں۔

مذاق میں لطافت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اعلیٰ درجہ کے وجدان کے ساتھ انسان میں حساسیت بھی بدرجہ اتم ہو۔ "حساسیت" سے میری مراد "حواس کے ذریعہ خارجی چیزوں سے متاثر ہونے کی قوت" ہے۔ جن لوگوں میں حساسیت کی قوت مضمحل ہوتی ہے وہ کبھی حسن سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہوسکتے۔ نیچر اور آرٹ کی خوبصورتی سے پورا پورا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کی بصارت، سماعت، لمس، شامہ اور ذائقہ اپنا اپنا فعل پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔

صحتِ مذاق کا تعلق اُس بالیدگی سے ہے جو سمجھ اور عقلِ سلیم کے ذریعہ ذوق کو حاصل ہوتی ہے۔ صحیح المذاق شخص وہ ہے جو کلام کی لفظی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ جس کے پیشِ نظر کلام کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہمیشہ عقلِ سلیم کا معیار ہوتا ہے۔ وہ کلام کا باہمی موازنہ کرکے اس بات کا پتہ لگالیتا ہے کہ کونسی خوبی کس پایہ کی ہے؟ اور کلام کا کون سا پہلو عمدگی کے لحاظ سے کیوں قابلِ ستائش ہے؟ ایسا شخص کبھی شعر کے ظاہری محاسن پر نہیں جاتا۔ اس کو الفاظ کی بھڑک اور فقروں کا انوکھاپن اُس وقت تک ہرگز نہیں رجھا سکتا جب تک وہ شعر کو اپنی سخن سنجی کی کسوٹی پر کس کر اُس کے حقیقی محاسن کا اندازہ نہ کرلے۔

اس میں شک نہیں کہ صحتِ مذاق اور لطافتِ مذاق دونوں لازم اور ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ کسی طرح انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح المذاق اُس وقت تک صحیح المذاق قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اُس کے ذوق میں صحت کے پہلو بہ پہلو "لطافت" بھی موجود نہ ہو۔ اسی طرح لطیف المذاقی کے لئے صحیح المذاقی لازمی چیز ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اب یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اچھّے اور بُرے ذوق کے درمیان تمیز کرسکیں؟

اس سوال کا جواب زیرِ نظر بحث کا وہ حصہ ہے جس میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس بات کا ایمان داری کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دماغِ انسانی کی کوئی قوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر لوچدار، تغیر پذیر، اور جلد جلد رنگ بدلنے والی نہیں ہے جتنی کہ ذوق مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے تحت دنیا میں ہمیشہ مذاق میں اس قدر کثرت اور سُرعت کے ساتھ انقلاب اور تغیر رونما ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کوئی مستقل بالذات شے ہے بھی یا محض اعتباری اور ظنی شے ہے؟

آیا اس کی بنیاد ہیں کسی ٹھوس حقیقت پر قائم ہیں یا یہ چیز فطرتِ انسانی کے تلوّن پذیر رجحانات اور ذہن کے رنگ برنگی میلانات کے زیرِ اثر ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ چیز جو آج سے پچاس برس پیشتر صنعتی خوشنمائی اور فنی حسن کا بہترین شاہکار قرار دی جاتی تھی آج جدید روشنی کے دور میں اس قدر پامال اور غیر دلکش سمجھی جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونا بھی اپنے مذاق کی توہین سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ناسخ کی شاعری کو لیجیے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ناسخ استادِ روزگار تصور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اِس گوشے سے اُس گوشے تک اُن کی شاعری کی دھوم تھی۔ اور سخن فہموں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کے کمالِ شاعری کے گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ لیکن آج ناسخ کے رنگ کا پسند کرنے والا مشکل سے ہندوستان کی تمام آبادی میں کوئی ایک آدھ ملے گا۔ انصاف سے بتائیے موجودہ زمانہ کے اردو دان حلقے میں آپ کتنے ایسے اربابِ فہم دیکھیں گے جو ناسخ کی شاعری سے لطف اُٹھا سکتے ہوں؟ "مثنوی گلزارِ نسیم" جو ایک زمانہ میں سخن سنجوں کی آنکھ کی سرمہ بنی ہوئی تھی، جو اپنے عہد کی بہترین شاعری کا بہترین شاہکار تصور کی جاتی تھی آج کیوں بے توجہی اور فراموشی کی تاریکی میں پڑی ہوئی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے بظاہر یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کا کوئی اصل معیار نہیں۔ ہر شخص کا ذاتی مذاق ہی اُس کے لئے معیار کا کام دیتا ہے اور یہ کہ ہم کوئی ایسا مشترک معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جس کے فیصلے کے سامنے سب کو بلا چون وچرا تسلیم کی گردن خم کر دینا پڑے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا سمجھنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر بالفرض ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیں کہ اعلیٰ درجہ کے ذوق اور ادنیٰ ذوق میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی ایسا معیار مشترک نہیں ہے جس سے مرافعہ کیا جائے تو لامحالہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ہر قسم کا ذوق خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اپنی اپنی جگہ پر اچھا ہے۔ اہلِ نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یہ دعویٰ کس قدر مہمل اور بے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ کلام کی سطحی خوبیوں کے معاملے میں یہ دعویٰ زیادہ ناقص اور بے معنی نہ نظر آئے لیکن جہاں شاعری کے اعلیٰ درجے کے نمونوں کی بحث آ پڑتی ہے وہاں یہ دعویٰ محض غلط ہی نہیں بلکہ حد درجہ احمقانہ ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہمارے پیشِ نظر ایک ایسا گروہ ہے جس میں مذاق کے لحاظ سے ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر اس گروہ کا ہر شخص فرداً فرداً غالب کی شاعری کو پسند کرتا ہے تو اس سے ہم اس نتیجہ پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے کہ اس جماعت کے تمام افراد کا ذوق یکساں طور پر اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر انہیں لوگوں سے

علیحدہ علیحدہ غالب کے بہترین شاہکاروں پر تنقیدی نقطۂ نظر سے تفصیلی رائے پوچھی جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ ذوق کے لحاظ سے اس جماعت کے سارے افراد یکساں نہیں ہیں بلکہ کسی کا مذاق بلند ہے کسی کا پست۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ تسلیم کرلینا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذوق میں سرے سے کوئی فرق نہیں کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ جب ہمارے پاس اس بات کے کافی دلائل موجود ہیں کہ ہم بجا طور پر ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دے سکتے ہیں یا ایک شخص کے ذوق کو اچھا اور دوسرے کے ذوق کو بُرا قرار دے سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مذاق میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کرسکتے ہیں تو یہ حقیقت خودبخود واضح ہوجاتی ہے کہ ذوق کی اچھائی اور برائی پرکھنے کے لئے کوئی مشترک معیار ضرور ہونا چاہئے۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ معیار کی ضرورت عموماً کن صورتوں میں لاحق ہوتی ہے؟ ہمیں کب اس کی حاجت پیش آتی ہے کہ ہم کسی معیار سے فیصلے کے لئے اپیل کریں۔

اگر مختلف چیزوں کے متعلق متضاد آرا کا اظہار کیا جائے تو اس وقت معیار کا سوال زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کیجئے آپ کا کوئی دوست غالب کا پرستار ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو غالب کا ہم مقابل نہیں سمجھتا۔ اس کا خیال ہے کہ غالب کا کلام میر سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آپ میر کی شاعری کو غالب کی شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ چونکہ آپ کی رائے آپ کے دوست کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ اس لئے یا تو آپ کا مذاق صحیح ہوگا یا آپ کے دوست کا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے دعووں کی حمایت میں آپ یہ کہہ کر اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ میر کا سا سوز و گداز، اس کی سی زبان کی حلاوت اور نرمی، اس کا سا خلوص اور درد غالب کے کلام میں موجود نہیں لہٰذا میر لازمی طور پر غالب سے بہتر شاعر ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کا دوست غالب کی فوقیت میں یہ دلائل پیش کرسکتا ہے کہ خیالات کی ندرت، مضامین کے تنوع، تخیل کی بلند پروازی، انداز بیان کی جدت، اور الفاظ کے شکوہ کے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کرسکتا لیکن اس تمام بحث کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کا ذوق جو میر کو غالب پر فوقیت دیتا ہے بہتر ہے یا آپ کے دوست کا جو غالب کو میر کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ٹھہراتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تضاد کے باوجود دونوں کا مذاق اپنی اپنی جگہ پر اعلیٰ درجہ کا ہو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ دراصل معیار کے سوال کی اہمیت اُس وقت بڑھ جاتی ہے، جب ایک ہی شے کے متعلق لوں میں اختلاف رائے ہو، یعنی جب اسی چیز کو ایک شخص خوبصورت اور دوسرا بدصورت قرار دے۔ مثلاً اگر

کوئی شخص یہ کہے کہ میرؔ کے کلام میں کوئی خوبی نہیں۔ اس کی شاعری بے جان اور مردہ ہے اس کے کلام میں نہ کوئی گداز ہے نہ سوز و ساز نہ تاثیر۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اُسے اردو شعرا کی صف میں کوئی مرتبہ دیا جائے، تو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یا تو یہ شخص شاعری کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یا اس کا مذاق حد درجہ ناقص اور بگڑا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اس پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کا مذاق غلط ہے شاعری کے کسی مشترک معیار سے اپیل کریں اور اس معیار کے ذریعہ اُس شخص کی بے راہ روی اسے سمجھاویں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ذوق کی اصلی بنیادیں تو اس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جس کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے لیکن خارجی طور پر بھی ذوق کو عقلِ سلیم اور قوتِ امتیاز کے ذریعہ ترقی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔

اب اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا موجود ہوتا جس میں تمام انسانی قوتیں مکمل ہوتیں جس کے ذہنی اور دماغی قویٰ ہر حالت میں بہترین اور صحیح ترین کام انجام دیتے۔ جس کی عقل کبھی خطا نہ کرتی اور جس سے فیصلے کے وقت ذرہ برابر غلطی کا احتمال نہ ہوتا تو ہم بلا خوف و اندیشہ تمام مخلوق کے مذاق کے لئے ایسے شخص کی صائب رائے کو معیار قرار دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا کی اس وسیع کائنات میں ایک شخص بھی اپنے اندر یہ تمام خصوصیتیں اکٹھی نہیں رکھتا اس لئے لازمی طور پر ہمیں اُس اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کے افراد میں مندرجہ بالا خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ یعنی ہم بآسانی اُس اکثریت کے مذاق کو معیار قرار دے سکتے ہیں جس کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر وہبی اور اکتسابی دونوں حیثیتوں سے اپنے اندر وہ تمام خوبیاں رکھتا ہو جو مذاق کی صحت اور لطافت کے لئے ضروری ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ اختلاف رائے کے ہر موقع پر ہم اس معیار سے کسی صحیح اور فوری فیصلے کے طالب ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر و سخن کے معاملات میں عام طور پر جو موٹے موٹے اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے طے کرنے کے لئے اکثریت ہی کے مذاق کو معیار کے طور پر پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔

ذوقی

حیدرآباد دکن

غزل

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہی
تصوّر کے ہمراہ تصدیق ہے

ہمیں علم ہے اور یہ تحقیق ہے
فقط دردِ دل وجہِ تخلیق ہے

بجا ہے، مرا نازِ قسمت بجا
کہ تیری تمنّا کی توفیق ہے

وہ مجھ سے قریب اور مَیں اُس سے دُور
مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے

محبت کے اثنا میں ہر جورِ دوست
محبّت کے وعدے کی توثیق ہے

تعجب ہے اُس کا کرم اور یہ دیر
خدا جانے کیا وجہِ تعویق ہے

عطائے دو عالم تو برحق مگر
کچھ اس کے علاوہ بھی توفیق ہے؟

جو تُو کافرِ عشقِ جاناں نہیں
بالاجماع کافر ہی، زندیق ہے

مرے کفر کو کفر کہنا غلط
مرا کفر ایماں کی تصدیق ہے

اُسے خبطِ عقبیٰ سے کیا واسطہ
جسے عیشِ دنیا کی توفیق ہے

مرا ایک دم اور دو عالم کے غم
عجب کشمکش ہی، عجب ضیق ہے

حقیقت میں آزادؔ! اُس کی جفا
ہماری وفا کی اتالیق ہے

حکیم آزادؔ انصاری

بلنسیہ

بلنسیہ جسے آج کل آپ نقشۂ یورپ پر ویلنشیا کے نام سے مرقوم دیکھیں گے سپین کا مشہور شہر ہے اور اُس کے دارالحکومت میڈرڈ سے جسے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مجریط کہتے تھے ۱۹۰ میل پر جنوب مشرق میں آباد ہے۔ وادی الکبیر کہ سپین کا مشہور دریا ہے اس کے شمال میں موجیں مارتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔ دریا کا منظر نہایت سہاونا ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درخت جھوم رہے ہیں، اور دریا کا نیلگوں پانی اُن کے درمیان سے گزرتا ہے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے اپنی فیاضی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے اپنے حسین ولطیف مناظر اسی جگہ کے لئے خاص کر دیئے ہیں۔ شہر کے باہر کی عمارتیں خوشنما اور منظر دلکشا ہے، مگر اندر کے مکانات بہت بلند واقع ہونے کے سبب آنکھوں کو کچھ اتنے بھلے معلوم نہیں ہوتے جب ان کا سایہ بازاروں پر پڑتا ہے تو طبیعت میں خنکی اور افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔ بازار کچھ اتنے فراخ نہیں ہیں اور سڑکیں تو دور دور تک پیچ و خم کھاتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ صنعت لوہے شیشے اور ریشم سے ہمکنار ہے اور تجارت ریشم شراب انگور اور زعفران سے لطف اندوز۔ اک زمانہ تھا کہ بلنسیہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہ تھا، سوداگر کیڑوں کو دور دراز ممالک میں لے جاتے تھے، یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا جو نسیج بلنسی کے نام سے مشہور تھا، شمالی افریقہ میں اس کی بہت مانگ تھی۔ نارنگیاں یہاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اگر اس کو نارنگیوں کا شہر کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ بلنسیہ کو اپنی قدامت پر ناز ہے، ایک زمانہ میں پومپی نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر کچھ عرصہ کے بعد از سرِ نو تعمیر ہو کر آباد ہؤا۔ جب مسلمانوں نے ۷۱۳ء میں اس کو فتح کیا تو اُس وقت گاتھ قوم برسرِ حکومت تھی، ۱۰۹۴ء میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا اور یہ مسلمانوں کے مستحکم ہاتھوں، سے نکل گیا، المثمین کی فوج نے دوبارہ اس کو پامال کیا مگر ۱۲۳۸ء میں کارپردازانِ قضا و قدر نے ہمیشہ کے لئے اس شہر کی حکمرانی سپینی عیسائیوں کی قسمتِ زریں میں لکھ دی۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بلنسیہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کا دارالحکومت شہرِ بلنسیہ نہایت آباد پُر رونق اور فضل و کمال کا مرکز تھا تاریخ جغرافیہ اور ادب کی کتابوں کے ہزاروں صفحے بلنسیہ کے باغات اور عمارات، یہاں کے علما، فضلا اور شعرا کے تذکروں سے معمور ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی شہر کا بیرونی حصہ نہایت پُر فضا اور آباد تھا، سطحِ سمندر سے آفتاب

کی شعاعیں منعکس ہوکر اس حصے کو روشن رکھتی تھیں مگر اندرونی حصہ صفائی کے نہ ہونے سے متعفن اور تنگ وتاریک تھا۔ پسّوؤں اور مچھروں کے لشکر موجود رہتے تھے، چنانچہ غرناطہ کا ایک مشہور شاعر ابوجعفر بن مسعدہ کہتا ہے۔

ھی الفردوس فی الدنیا جمالًا　　لساکنہا مکدرہا البعوض

یعنی جمال ولطافت کے لحاظ سے تو بلنسیہ اپنے ساکنوں کے لئے بہشت ہے مگر اس میں مچھروں کی مصیبت ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ کہ

رقص البراغیث فیہا　　علی غناء البعوض

یعنی مچھر تو اس میں گیت گاتے ہیں اور پسو رقص کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں بلنسیہ کے باغات کی یہ کثرت تھی کہ ہر طرف سبزہ زار لہلہاتے اور چشمے رقصاں نظر آتے تھے رصافہ اور مدینۃ المنصور دو مشہور رسمنے تھے، ان میں نہریں بہتی تھیں اور نہریں پل بستہ تھیں، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی یا تو زعفران کے زریں کھیت دعوتِ نظارہ دیتے تھے یا نارنگیوں کے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ ایک مورخ لکھتا ہے: بلنسیہ رصافہ اور پل کے اعتبار سے رونق اور لطافت میں بغداد کے ساتھ ہمسری کرتا ہے، سبزہ زاروں اور باغوں چشموں کی کثرت کے باعث بلنسیہ کو مطیب الاندلس، یعنی سیرگاہِ سپین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلنسیہ کے دلربا مناظر کی تصویر اکثر شعرائے اندلس نے اپنے اشعار میں نہایت حسن وخوبی سے کھینچی ہے۔ مگر جو عربی زبان کے مذاق اور علم سے محروم ہیں لاریب کہ انہیں ان مدحیہ اشعار کی آب وتاب اور لطافت سے بھی محروم ہی رہنا پڑے گا، چنانچہ ان کے نفس مضمون ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے

ابنِ زقاق لکھتا ہے "انصاف کی پوچھو تو بلنسیہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے تمام شہروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے، میرے اس دعوے کی دلیل خود بلنسیہ ہے جس کا جمال آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے، خدائے حسن نے اُسے حسن کا خلعت بخشا ہے جو دریا اور سمندر کے نقش ونگار سے مزین ہے!" بلنسیہ کے تاجدار، مروان نے کہا ہے۔ بلنسیہ وہ نوجوان معشوق ہے جو سندسِ سبز کا لباس زیبِ تن کئے رہتا ہے، اگر تم اُس کے قریب جاؤ تو وہ اپنے آپ کو پھولوں اور شگوفوں میں چھپالے گا"

بلنسیہ کو کبھی کبھی قحط سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اور سروی عیسائی آئے دن اُس پر یورش کرتے

ابوالحسن بن حریق اس بات کا اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: یہ بات مشرق و مغرب میں مسلّم ہے کہ بلنسیہ ہر قسم کے حسن کا مرکز ہے اگر کوئی کہے کہ اس میں قحط کی آفت برپا ہوتی ہے اور تلواروں اور نیزوں کا مینہ برستا ہے تو اس کو کہہ دو کہ بلنسیہ ہے تو بہشت، مگر قحط اور جنگ کی دو مصیبتوں کی اوٹ میں!

علم و فضل کے اعتبار سے سرزمینِ بلنسیہ بہت بلند مرتبہ ہے، مادرِ گیتی نے اس مردم خیز خطے میں ایسے ایسے علما اور شعرا کو جنم دیا کہ جن کے نام آسمانِ ادب و شہرت پر رہتی دنیا تک چاند سورج بن کر چمکتے رہیں گے اگر شاعروں کی فہرست تیار کی جائے تو یہاں کے مندرجہ ذیل شعرا نمایاں طور پر داد کے مستحق ٹھیریں گے:۔

ابوالعباس بن امیہ، ابنِ محذر، ابنِ حجاف، ابوجعفر بن عبدالولی، ابوالحکم ابنِ عماز، ابنِ جبیر، ابنِ عبدون، علی بن احمدؒ، ابنِ سعد الخیر، رصافی وغیرہم۔

محدثین کے اسمائے گرامی بلنسیہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:۔ ابوالمطرف بن عمیرہ، ابواحمد جعفر الخزاعی، ابوعبداللہ بن یعیش، ابن ہاجر اور ابنِ ہذیل وغیرہم

بلنسیہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ایک صوبے کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس میں بہت سے قصبے اور قریے آباد تھے، جن میں سے مشہور قصبہ شاطبہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ قرات اور حدیث کی درس گاہ تھا، اور منظر کی لطافت و خوبی کے لحاظ سے بھی بے نظیر تھا، یہاں کا کاغذ تمام اندلس میں مشہور تھا اور دور دور تک جاتا تھا، ۶۴۵ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے صوبوں کی فہرست میں اس کے نام کا بھی اندراج ہو گیا! اندہ جس کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں ہیں بلنسیہ کے مضافات میں شامل تھا، یہی وہ سرزمینِ پاک ہے جس کو ابوجعفر احمد بن حسن القضاعی جیسے بلند پایہ محدث کی زاد بوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ابوجعفر کو حدیث کے علاوہ ادب اور فنِ طب میں بھی کمال حاصل تھا اور وہ ایک عرصہ تک غرناطہ کے گورنر عثمان بن عبدالمومن کے سکرٹری بھی رہے تھے۔

یہ ہے بھولے بسرے بلنسیہ کی مجمل سی تاریخ اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی داستان کا ایک پارینہ اور پُر درد ورق!

امین

برسات

کل تک بیساکھ کی گرمی تھی آج آئی ہوا برکھارُت کی
کیا کیا نہ دعائیں کرتی تھی مخلوقِ خدا برکھارُت کی

اللہ یکایک یہ بادل گھر گھر کے کدھر سے آئے ہیں
اللہ کہاں سے آنکلی یہ سرد ہوا برکھارُت کی

بجلی کی کڑک بادل کی گرج، زوروں کی جھڑی، طغیانی
دکھلا گئی کیا کیا دم بھر میں گھنگھور گھٹا برکھارُت کی

لو بھر گئے پل میں سب جل تھل، لو ندی نالے چلنے لگے
چشمے ہر سمت ابلنے لگے جن سے ہے فضا برکھارُت کی

کیسی ہے زمیں پر ہریاول، ہیں چرخ پہ کیا پیارے بادل
ہے ارض و سما پر کیفیت، کیا جلوہ نما برکھارُت کی

کیا وادی کیا صحرا کیا بن، کیا کوہ کا دامن کیا گلشن
ہر چیز بنی فردوسِ نظر، برسی جو گھٹا برکھارُت کی

دھرتی کو ملا ہے لباس نیا، آتا ہے نظر آکاس نیا
ہے رُوپ انوپ جدھر دیکھو تاثیر ہے کیا برکھارُت کی

کیا پیڑ ہیں، کیسی بیلیں ہیں، کیا پھول ہیں کیا سبزہ ہے
گھر سے تو نکل جنگل کو تو چل، لذت تو اٹھا برکھارُت کی

اشجار ہیں کیا جھولے ہیں پڑے کس لطف میں ہیں سب چھوٹے بڑے
کیا جھولتے ہیں کیا گاتے ہیں، کر کر کے ثنا برکھارُت کی

کیا پیاری کوک ہے کوئل کی، کیا راگ چھڑا ہے بھونرے کا
کیا کیف فزا و ہوش ربا، ہے موجِ ہوا برکھارُت کی

بھنگراج کہیں، دراج کہیں، چنڈول کہیں، طاؤس کہیں
ہر پنچھی راگنی گاتا ہے ہر صبح و مسا برکھارُت کی

کیا ناچ رہی ہے ہر تتلی، کیا جھوم رہی ہے ہر ڈالی
اللہ یہ کیفیت کتنی، ہے ہوش ربا برکھارُت کی

چشموں کی صدا اللہ اللہ جھرنوں کی نوا اللہ اللہ
کیا میٹھے سُروں میں رہ رہ کر گاتی ہے ہوا برکھارُت کی

مصروفِ تبسم ہیں کلیاں مشغولِ ترنم ہیں چڑیاں
کس کس کو نہ جوش میں لائے گی مستانہ ادا برکھارُت کی

نسرین سمن جُوہی چمپا، بیلا کیوڑا ہر سُو ہے کھلا
کس درجہ معطر رہتی ہے ہر وقت ہوا برکھارُت کی

دیکھو تو ذرا اے اہلِ نظر کیسا ہے سماں یہ گردوں پر
بگلوں کی قطار ایسی اُجلی، کالی یہ گھٹا برکھارُت کی

رنگین گھٹا کی چادر پر کیسے ہیں شفق کے گل بوٹے
خورشید نے کیسی اوڑھی ہے خوش رنگ ردا برکھارُت کی

پھر جھوم کے بادل آئے ہیں، پھر دھار لگی ہے مینہ کی نجیب
ہاں بہرِ خدا پھر نظم ذرا تُو اپنی سنا برکھارُت کی

میر سعادت حسین
نجیب

ساڑھی اور سُوٹ

کچھ عرصہ ہُوا کہ شملہ کی کسی سڑک پر ایک خالی ساڑھی خراماں تھی یعنی ساڑھی تھی پر ساڑھی کے اندر کچھ نہ تھا یا کم ازکم معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر والی گھر میں ہے اور ساڑھی ہواخوری کے لئے تن تنہا خود ہی نکل پڑی ہے۔ خدا جانے ساڑھی اور ساڑھی پوش میں تُوتُو میں میں تک نوبت پہنچی تھی اور ساڑھی تنگ آکر نکل پڑی تھی یا بچاری پہننے والی کو گھر کے کام کاج سے فرصت نہ تھی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں تو مرتی ہی ہوں یہ بچاری کیوں یونہی سڑے بسے، بہرحال کچھ بھی وجہ ہو چند آنکھوں والوں نے دیکھا کہ ساڑھی موجود ہے اور ساڑھی پوش غائب۔ ان میں سے ایک حضرت نے جرأت کرکے قدم بڑھایا۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی تاک میں تو نہیں یہ صاحب ساڑھی کے پاس جانکلے اور ٹوپی اٹھاکر قدم ساتھ ملانے کو تھے کہ کسی غیبی طاقت نے ان حضرت کو سوٹ سے غائب کردیا اور ان کا خالی سوٹ اس ساڑھی کے ساتھ سرگشت کرنے لگا۔ اسی غیبی طاقت نے صاحب موصوف کو سوٹ اور ساڑھی کی گفتگو سمجھنے کی لیاقت تو دے دی اور یہ بھی مجبور کیا کہ یہ ساڑھی اور سوٹ کے عقب میں چلتے رہیں مگر اور ہر قسم کی طاقت اُن سے لے لی۔ جو مکالمہ اُن حضرت نے ساڑھی اور سوٹ کا سنا اُسے آپ یوں بیان کرتے ہیں۔

سوٹ۔ معاف کیجیے، مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سیر کا لطف اٹھاؤں انکار نہ کیجیے!

ساڑھی۔ آپ ساتھ ساتھ تو چل ہی پڑے مگر میں سوچتی ہوں کہ میرا آپ کا کیا ساتھ؟

سوٹ۔ کیوں؟

ساڑھی۔ جناب یہ بندی کسی غریب ہندوستانی جلاہے کی دستکاری کا سیدھا سادھا نمونہ اور وہ بھی ایسا جیسے جیسی کہ وہ ہر بھولے پن سے لپٹ جانے کی عادت، اور آپ ماشاءاللہ مغربی چستی وچالاکی کا بہترین اشتہار۔ چلیں تو اکڑ کر اور رہتے ہوں تو وہ بھی شکنجے میں۔

سوٹ۔ بنانے میں تو آپ مشاق معلوم ہوتی ہیں۔

ساڑھی۔ واللہ بنا نہ رہی تھی۔ کیا جو کہتی ہوں وہ غلط ہے؟ مجھ غریب کا تو دامن آج تک جیب سے

آلودہ نہیں ہؤا اور آپ ہیں کہ اوپر جیب نیچے جیب، اندر جیب، باہر جیب۔

سوٹ (ہنسکر) خالی جیب سے جیب نہ ہونا اچھا ہے۔

ساڑھی (انداز دلربائی سے) جی ہاں، جیب خالی اور اس پر اکڑ بازی۔

سوٹ۔ جناب یہ آپ کے آنچل کا ذرا سا کھسکنا سب کس بل نکال دیتا ہے۔

ساڑھی۔ اوہو، آپ تو شاعر مزاج معلوم ہوتے ہیں۔

سوٹ۔ ہوں تو نہیں مگر بننا پڑتا ہے۔

ساڑھی۔ اچھا آپ زبردستی شاعر نہ بنئے اور کچھ آپ بیتی کہئے۔ جھوٹ چاہے کتنا دلفریب ہو سچ کے سامنے ہیچ ہے۔

سوٹ۔ تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں مگر بہتر تو یہی ہے کہ آپ بیتی نہ کہوں۔

ساڑھی۔ جی نہیں، ہم تو ضرور سنیں گے۔

سوٹ۔ اچھا تو سنئے۔ میں جب سے اس ملک میں آیا ہوں درا صل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی میری ذلت ہوتی تو بھی یہ خوشی ضرور ہوتی رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا گاہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گذرتا مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اعتدال سے کام لو، چلو تو سنبھل کر، بیٹھو تو سمٹ کر، دیکھو تو جھک کر، پاس رہو مگر دور دور رہیں تو جان بلب ہوں۔ اچھا ہو جو کسی دن پھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں۔

ساڑھی۔ کیوں؟ میں نہ کہتی تھی کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں۔ آپ کون ہیں یہاں کی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے والے؟ کیا اتنا بھی پتہ نہیں کہ غیر کا کیا مذکور بھائی بہن کو نہیں کہہ سکتا کہ "بہن تم حسین ہو" جب زمانہ بدلے گا تو بدلے گا فی الحال تو پرانی تہذیب رائج ہے اور اُس کے مطابق خوبرو کو حسین کہنا گناہ ہے اور اپنے آپ کو برا ثابت کرنا ہے۔

سوٹ۔ یہی تو رونا ہے کہ دیکھیں تو بُرے، کہیں تو بُرے اور جو قدرت نے قلیل آزادی دی چاہیں تو بُرے۔ آپ نے مجھ سے میرا حال پوچھا کیوں تھا؟

ساڑھی۔ خدا جانے کیوں مگر مجھے تو کچھ ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارا پُرانا فلسفہ تو یہ کہتا ہے کہ رنج میں

بھی راحت ہے اگر انسان کا ایمان ٹھیک ہو۔
سوٹ۔ یہ بات مطلقاً سمجھ میں نہیں آئی۔ رنج میں کس طرح راحت ہوسکتی ہے؟
ساڑھی۔ آپ روحانیت سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں۔ رنج خدا کی طرف سے ہے اور جب اُس کی مرضی سے ہے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہئے۔ آپ کی خواہشات کے مطابق دنیا کا نظام جب نہیں ہے تو بہتر ہے کہ آپ وہ خواہشات ترک کردیں۔ یہاں اگر فراک اور ساڑھیاں آپ سے ملنے سے کتراتی ہیں تو آپ اُن سے ملنے کی خواہش ہی دل سے نکال دیں۔ قسمت کے آگے سر تسلیم خم کریں۔
سوٹ۔ یہ ہوچکا۔ اگر روحانیت یہی ہے کہ کوشش نہ کی جائے تو اِن جانب کا روحانیت کو دور ہی سے سلام ہے۔ کوشش کرکے آپ سے نہ ملتا تو یہ چند لطف کی باتیں کیسے سنتا؟

(۲)

صاحب سوٹ بیان کرتے تھے کہ کسی نکڑ پر یک لخت ساڑھی غائب ہوگئی اور اُن کا سوٹ پھر اُن کے گلے کا ہار ہوگیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُس دن سے وہ اپنے سُوٹ کے سامنے سخت خجل رہتے ہیں کہ اس پردیسی کی زندگی عبث حرام کی۔ جب ان کی طبیعت ذرا زیادہ گداز ہوا کرتی ہے تو فرمایا کرتے ہیں کہ اس ملک میں انسان تو کیا اچھا کپڑا بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہوجاتا ہے۔
اس امر کی بہت کوشش کی گئی کہ پتہ چلایا جائے کہ کیا ساڑھی پوش سے اس ملاقات کا ذکر کیا یا اس تمام واقعے کو کھا گئی مگر اڑتی اڑاتی بھی کوئی خبر نہ سنی۔ البتہ اس واقعہ سے ایک دو مہینے بعد کسی خاتون کی تحریر ایک رسالے میں شائع ہوئی اور اس تحریر سے شاید عقدہ کشائی ہوسکے۔ وہ تحریر حسب ذیل ہے

ساڑھی سے گفتگو

"چڑیل یہ تیرا پھڑکنا مجھے کہیں کا نہ رکھے گا! کیا کہا کہ بیوی! یونہی خفا ہوتی ہو! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے بھلا جو میں یونہی خفا ہوتی ہوں تو یہ بتا کہ کل جو میں جوہری کی دوکان پر کھڑی تھی تو تو کیوں اس جنٹلمین کے سوٹ کو چھو رہی تھی؟ ہوا کی اٹکھیلیاں، اُف ری لپاٹن! ہوا کا تو وہاں نام و نشان نہ تھا۔ اچھا ہاں سچ بتاؤ۔ کیا کہا کہ ایک دفعہ یونہی ملاقات ہوگئی تھی۔ سوٹ کا مجھ سے اور میرا سوٹ سے رنگ کھلتا تھا۔ اچھا کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ بیوی وہ نہ ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے آپ نے رنگنے کے لئے دیا تھا۔ وہ ایک بھلے سے آدمی کی دکان ہے ناٹھنڈی

سڑک پر۔ بس وہیں۔ ہم دونوں تیار تھے لیکن لینے کوئی نہ آیا تو ہم یونہی چہل قدمی کے لئے ذرا نکل پڑے تھے اللہ قسم ایسے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ کیا کہئے مگر میں نے اُسے خوب بنایا' اب آیا میری سمجھ میں یہ تیرا اپنا ٹھنارہنا۔ شرم حیا گھول کر پی گئی ہو۔ کیا کہا ؟ کیا کروں کہ رنگ ہی شوخ ہے' تیرا تو دماغ چل گیا ہے مگر بندی اس آزادی کی حامی نہیں۔ کیا کہا کہ تم نے اسے بہت سمجھایا ؟ بچارا رو دیا تو رحم آیا' جی نہیں ایسے رحم کو تم رہنے دو۔ لوگ کچھ کا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری زبان بند بھی ہوگی یا یونہی قینچی کی طرح چلتی جائے گی ؟ کیا کہا کہ ہنسنا بولنا کیسے بند ہو ؟ ہے نا تو آفت ! اب جو کچھ کہوں گی تو رو دوگی۔ کیا کہا کہ ' بُرا ماننے کی بات نہیں مگر امر واقع یہ ہے کہ انسان کپڑے سے ہی بنتا ہے' جی ہاں۔ گویا وہ مہاتما لوگ جو کپڑا نہیں پہنتے انسان ہی نہیں۔ اری ہے تو تُو دیسی مگر باتیں تیری سب فرنگنوں کی سی ہیں۔ کیا کہا کہ میری بلا فرنگن ہو۔ بات یہ ہے کہ سب ساڑھیوں نے حلف اُٹھایا ہے کہ ہندوستان کی خاتونوں کو آزاد کر کے چھوڑیں گی' اُف ری تیرے دعوے ! گویا یہ جو ہندوستان میں ترقی کی رو ہے اُس کے محرک سوت، کپاس اور ریشم ہیں۔ کیا کہا کہ ہاں بیوی سچ تو ہے۔ مرد کمبخت ولایت گئے تو وہاں سے ٹو بڈا اٹھالائے مگر ایک صدی سے ہندوستان کی روئی سفر کر کے ململ بن کر آرہی ہے آخر کچھ تو اس سفر کا اثر ہونا تھا مجھ میں بھی ولایتی تاگا ہے مگر اس کی بدولت نہیں بلکہ نشو و نما کا تقاضا ہے کہ ہم آزادی چاہیں۔ دیسی کھیتوں میں امریکن کپاس کا بیج، انگریزی نہروں کا پانی، جاپانی کارخانوں کی مانگ۔ چھوڑیئے وہ اب اپنی پرانی ترنگ تُو تو بڑی عالم فاضل نکلی۔ کیا کہا کہ اب مسکرادوں۔ کیوں ؟ کیا تجھے میرا مسکرانا بھاتا ہے ؟ اری کیوں لپٹی جارہی ہے۔ چلوں؟ کہاں ؟ باہر۔ دیوانی ہو خواہ مخواہ چل نکلوں۔ کیا کہا کہ ' اور کئی ساڑھیاں مل جائیں گی'۔ اور جوان کے ساتھ مرد ہوئے ؟ کیا کہا کہ ' اگر ہوئے تو کوئی اچھی سی بات ہی کہیں گے کچھ کھا نہ جائیں گے'۔ نہ بابا تو تو بڑی دلیر ہے"۔

فلک پیما

محبت ایک آتش ہے سردی سے معمور، ایک شیرینی ہے کڑواہٹ سے بھرپور، اور ایک درد ہے مسرت کا سرمایہ دار ؛ یہی وہ جذبہ ہے جو خیالات و احساسات کو دل آنکھیں اور کان تفویض کرتا ہے ؛ یہی وہ جذبہ ہے خواہش جس کی خوراک ہے، مسرت جس کی تربیت ہے، حسد جس کا امتناع ہے، مکر و فریب کی چالیں جس کی موت ہیں اور بے توجہی جس کا کفن ہے ——— للی

امین

تاثرات

دے کر تسلیاں دلِ حسرت نشاں کو میں ‏ — پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے آستاں کو میں

مسرور ہوں مٹا کے دلِ سخت جاں کو میں ‏ — فانی سمجھ رہا ہوں نشاطِ جہاں کو میں

دے کر فریب تیری نوازش کا رات دن ‏ — تسکین دے رہا ہوں دلِ نیم جاں کو میں

گردش نے جس کی خونِ تمنّا بہا دیا ‏ — ہمدرد جانتا تھا اسی آسماں کو میں

شکوہ ترے ستم کا نہ ہوگا بیاں کبھی ‏ — رو کے رہوں گا حشر میں اپنی زباں کو میں

بجلی کو ضد ہوئی ہے کہ گلشن کو پھونک دے ‏ — لے جاؤں یاالٰہی کہاں آشیاں کو میں

تم چھپ گئے ہو دے کے مجھے دعوتِ تلاش ‏ — اب ڈھونڈتا پھروں گا تمہارے نشاں کو میں

کب تک سناؤں آپ کو رودادِ بے کسی ‏ — سو بار کہہ چکا ہوں اسی آستاں کو میں

رفعت پسندیاں ہیں یہ میری نگاہ کی ‏ — کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں

جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا

جنّت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

نذیر احمد ظفر

تاریخی جامعات

علمی مدارس کا رواج حقیقت میں زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ مغربی عمران کے ظہور سے بہت پہلے کلدانیوں اور مصریوں نے مدارسِ علمیہ کی تشئید کی تھی۔ ان کے مدرسوں میں طب وحکمت، اور فلکیات کی بہترین تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر سب سے پہلے یونانیوں نے اُن کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ اور یونان کی تبعیت میں رومن قوم نے بھی مدارس کا افتتاح کیا لیکن رومن قوم کی اس ترقی اور اٹھان سے پہلے بطالسہ نے (اسکندر مقدونی کی اجازت پر) اسکندریہ میں ایک مدرسے اور کتب خانے کی بناڈالی تھی۔ جو تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے تمام مدارس ومکاتب پر فوقیت لے گیا۔ اسکندریہ کا یہ مدرسہ تقریباً سات صدیوں تک اعلیٰ پیمانے پر چلتا رہا۔

ابتدا میں پیروانِ مسیح نے زمانی علوم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس زمانے میں اُن کی تمام تر ہمت وتوجہ کا اصلی مرکز دینی علوم تھے۔ اس میدان میں فارس اور عرب مسیحیوں سے بہت آگے ہیں، نوشیروان عادل نے ۵۲۵ء میں جندیسا پور میں طب وحکمت کا اعلیٰ پیمانے پر ایک مدرسہ کھولا تھا جو عباسیوں کے زمانۂ حکومت تک قائم رہا۔ چنانچہ خلیفہ منصور عباسی نے اُسی نقش پر بغداد میں ایک نئے دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ لیکن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو علوم وفنون کی گرم بازاری بہت بڑھ گئی، حتیٰ کہ ہر جامع مسجد کے پہلو میں ایک پرائمری اسکول قائم تھا۔ مامون کے زمانہ میں باپ کی علمی یادگاریں اور زیادہ آب وتاب کے ساتھ چمکیں۔ دمشق وبغداد، بصرہ وبخارا، اسکندریہ وقاہرہ، مراکش وفارس اور اندلس وغیرہ میں مدارس علمیہ کا رواج بڑی دھوم سے پھیلا۔ ۱۰۰۰ میلاد میں صرف قاہرہ کے اندر ۲۰ بڑے بڑے مدارس تھے۔ قرطبہ میں ۷ عظیم الشان کتب خانے بہترین اور لاجواب کتابوں سے مملو موجود تھے۔ اندلس کے ہر پرگنے میں چھوٹے چھوٹے مدارس کے علاوہ ایک بڑا مدرسہ بھی تھا۔ ۱۱۲۶ میلاد میں خود قرطبہ کے اندر ۱۵۰ مدرسے تھے ۵۲، پرتگال میں ۲۵، مرسیہ میں ۱۷ علمی انجمنیں تھیں، اشبیلیہ، غرناطہ اور بلنیہ کی علمی انجمنوں کی تعداد مزید برآں تھی۔ علامہ مقری کا بیان ہے کہ اہل اندلس علم کے بڑے حریص تھے۔"

خود علم اور علمی کتابوں کے ساتھ خلیفہ المستنصر کی عنایتوں کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے علمی

کتابوں کی خریداری کے لئے مصر و افریقہ فارس و عرب کی طرف مختلف وفود بھیجے، جو ہر قسم کی علمی کتابوں کو خریدتے اور نقل کرتے۔ خلیفہ نے مصنفین زمانہ سے اُن کی تمام تصنیفات طلب کیں، اور معاوضے میں زر و جواہر سے اُن کے دامن کو مالا مال کیا۔ یہاں تک کہ علمی جواہر ریزوں کا چار کروڑ یا چھ کروڑ کتابوں کی صورت میں ایک انبار لگ گیا۔

ابوالفرج المطلی کی روایت ہے کہ قاضی صاعد بن احمد اندلسی قاضی طلیطلہ المتوفی ۴۶۲ھ نے لکھا ہے کہ:۔ عرب نے صدرِ اسلام میں زبان اور احکامِ شریعت کی معرفت کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ کہیں کہیں بعض افراد ضرورت کی مجبوریوں سے صرف طبی مشغلہ رکھتے تھے۔ عربوں کی یہ رفتار دولتِ امویہ کے خاتمہ تک قائم رہی لیکن جب ہاشمیہ کا دور آیا اور یہ لوگ ملک کے بادشاہ ہوئے تو سب سے پہلے جس نے علوم کی طرف توجہ کی وہ خلیفہ ثانی ابوجعفر المنصور کی ذاتِ گرامی تھی۔ موصوف کو تبحرِ فقہ کے علاوہ فلسفہ و نجوم کے مسائلِ دقیقہ میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اسی سلسلہ کا ساتواں فرمانروا مامون بن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو اُس نے اپنے دادا المنصور کے ناتمام عزائم کو بڑی خوبی سے پورا کیا۔ مامون نے علوم و فنون کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ تاریخ کے اوراق میں زندۂ جاوید رہیں گی۔ مامون نے ملوکِ روم کے پاس بہت سے وفود بھیجے۔ اور اُن کے کتب خانوں کی نادر اور جید فلسفیانہ کتابیں منگوا کر ماہرینِ فن سے اُن کے ترجمے کرائے اور لوگوں کو فلسفہ پڑھنے کی ترغیب دی۔ مامون کو حکما سے بہت زیادہ انس تھا۔ وہ ان کے مذاکرات اور مناظروں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

بغداد میں عباسیوں نے، مصر میں فاطمیوں نے، اندلس میں امویوں نے مامون کے اس مبارک طرز کی عرصہ دراز تک تقلید کی۔ جس کی بدولت مدارسِ عربیہ کے انتشار کا دائرہ سمرقند و بخارا سے لے کر فارس و قرطبہ تک پھیل گیا۔ امرا و ملوک ان مدارس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے تھے۔ مشہور مورخ گبن نے نقل کیا ہے کہ:۔ کسی وزیر نے بغداد میں صرف ایک مدرسہ جامعہ کے انشا پر ۲۰۰ ا ہزار گنی خرچ کی تھی اور ۹ ہزار گنی سالانہ کی آمدنی کی جائیداد اُس پر وقف کی تھی۔ (یہ فیاض ذات نظام الملک طوسی کی ذات تھی اور وہ مدرسہ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ تھا)

قاہرہ کے صرف ایک کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی ایک لاکھ سے زیادہ نادرِ روزگار کتابیں موجود تھیں اور اُن کے مطالعہ کی ہر شخص کو عام اجازت تھی۔ اس مکتبہ کی صرف فلکی اور طبی کتابوں کا شمار ۶۵۰۰ مجلدات

سے زیادہ تھا۔

مدارسِ عربیہ اور اُن کی علمی خدمات کے حیرت انگیز کارناموں کی یہ ایک معمولی توصیف ہے۔ (اگر موقعہ ملا تو کسی اگلی صحبت میں انشاء اللہ بسط کے ساتھ ہم پھر عرض کریں گے) لیکن بااین ہمہ تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ برداشت حقیقت ہے کہ گیارھویں اور بارھویں صدی سے پہلے حقائق و معارف اور علوم و فنون کا آفتابِ عالمتاب مشرق سے مغرب کی طرف مائل ہوگیا۔ اور ایشیا و افریقہ سے ہٹ کر اس کی نورانی شعاعیں سرزمینِ یورپ پر پڑنے لگیں۔ یورپ میں سب سے پہلے علوم و فنون کے مدارس کا رواج اٹلی میں شروع ہوا۔ نویں صدی میں مدرسہ "سالرنو" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور گیارھویں صدی میں یہ مدرسہ طب میں اتنا مشہور ہوا کہ اقطارِ یورپ سے جوق در جوق طلبا آنے لگے۔ دسویں صدی کے اواخر میں مدرسہ "پولونا" کا افتتاح ہوا۔ اور گیارھویں صدی میں اس مدرسے نے قانون میں عام شہرت حاصل کی۔ اور ۱۲۰۶ء میں طب و قانون اور الٰہیات کی اعلیٰ ڈگری دینے لگا۔

پیرس کا مدرسہ ایک زمانے سے قائم ہے لیکن تیرھویں صدی کے اوائل میں جا کر قانون اور طب، فنون اور الٰہیات وغیرہ کا اس میں باقاعدہ انتظام ہوا۔ ۱۲۵۳ء میں پیرس کے اندر ایک جدید مدرسہ "سارین" کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ابھی چودھویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فرانس میں ۴۰ یونیورسٹیاں تیار ہوگئیں۔ "سلامنکا" کا مشہور مدرسہ ۱۲۴۲ء میں قائم ہوا۔ اور مسلسل ۵۰۰ برس تک اسپین والوں کے لئے باعثِ فخر رہا۔ آکسفورڈ کے متعلق صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب قائم ہوا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ بارھویں صدی کے شروع میں اس کا مکمل افتتاح ہو چکا تھا۔ ۱۲۳۳ء میں "کیمبرج" کا مدرسہ، جامعہ کی حیثیت میں منتقل ہوا۔ ۱۳۴۸ء میں مدرسہ "براگ" اور ۱۳۶۵ء میں مدرسہ "وائنا" کو یونیورسٹی بنایا گیا۔ پھر مدارسِ جامعہ کی تاسیس اور تشئید اس کثرت سے پھیلی کہ سارے یورپ میں عام ہوگئی۔ امریکہ والوں نے بھی اپنے یورپین اسلاف کی پیروی میں بے نظیر ہمت اور انفاق کے ساتھ یونیورسٹیوں کا افتتاح کیا۔ امریکہ میں کتنے ہیں جنہوں نے بیسیوں لاکھ گنی یا اس سے بھی زیادہ کی رقمیں مدارس پر وقف کی ہیں۔ امریکہ والوں کی یہ عدیم النظیر قربانی اور ایثار حقیقت میں ساری دنیا کے لئے ایک پیغامِ درس و عمل ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار لعلکم تفلحون

بدر اصلاحی

خدا حافظ

اے گلِ گلستانِ رعنائی　　جانِ محبوبی و دلآرائی

میرے دم سے ہے سوزِ پروانہ　　تجھ سے روشن ہے شمعِ زیبائی

میرا جینا بھی کوئی جینا ہے　　تجھ بن اے نورِ چشمِ بینائی

تجھ بن آرامِ زندگی معلوم　　اے سرورِ دلِ تمنّائی

کیسے گزرے گی رات فرقت کی　　کیسے کاٹوں گا روزِ تنہائی

جاں ہی لے کر رہے گی آخرِ کار　　دردِ فرقت کی کارفرمائی

مر رہا ہوں میں اس تصوّر سے　　ہے مرے دل پہ غم کی یغمائی

از جگر دود میرود بسرم

شعلہ ام خشک مغز و سودائی (نظیری)

تجھ کو جانے نہ دوں کہیں ہرگز　　چاہتا ہے یہ شوقِ سودائی

لیکن اس وقت کی عنان گیری　　ہے سراسر خلافِ دانائی

کہہ رہا ہوں تجھے خدا حافظ　　گو نہیں طاقتِ شکیبائی

بسفر رفتنت مبارک باد

بسلامت روی و باز آئی (سعدی)

جلال الدین
اکبر

شادی کیونکر ہو

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ مردانی بیٹھک میں ایک چھوٹی کوٹھڑی اور دو خاصہ کمرہ ہیں زنانے میں ایک چھوٹا سا صحن ہے دو جانب دالان اور اندر کے رخ تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ بیچ میں ایک شاہ نشین سی بنی ہے۔ اوپر ایک چبوترہ اور اس کے بعد تین در کا دالان۔ دالان کے بعد ایک سہ درہ کمرہ اور بازوؤں میں دو چھوٹے کمرے ہیں۔ دالان میں دری کا فرش ہے وسط میں گاؤ تکیہ اور سوزنی بچھی ہے۔ اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کی مکین دو بہنیں ہیں۔ بڑی بہن عصمت لاولد ہیں۔ بیوہ ہو چکی ہیں اپنی چھوٹی بہن رفعت کے پاس رہتی ہیں۔ رفعت کے دو بچے ہیں لڑکی پندرہ سال کی اور لڑکا دس سال کا ہے۔ رفعت کا میاں وکیل ہے کافی آمدنی ہے۔ گھر کا خرچ اجلا ہے۔ شریفانہ زندگی بسر ہوتی ہے۔ موقع موقع سے کچھ پس انداز بھی ہو رہتا ہے۔

رفعت دالان میں بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ عصمت کسی اور کام میں مشغول ہیں

رفعت ۔ اے باجی ذرا ورے آنا۔

عصمت ۔ بوا کیا ہے۔ آج فرصت تھی میں نے کہا لاؤ خمیری سموسہ ہی تل لوں تمہارے میاں کو پسند ہیں چار اور رہ گئے ہیں، ذری ٹھہر جاؤ یہ نکال لوں۔ نہیں تو کڑاہی جلے گی۔

رفعت ۔ اے ہے آپا آپ کو تو جب دیکھو جب بھی تلنا پکانا۔ وہی مثل ہے اُٹھ ساسو پیٹ کا دکھ۔ وہ رحمت بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اسے دیجئے نا۔

عصمت ۔ ے رحمت تو آ بیٹھ تیری بیوی کوئی کام بھی قرار سے کرنے دیتی ہیں؟ دیکھیو ذرا سنہری نکالیو جلا نہ دیجو۔

عصمت کفگیر چھوڑ بہن کے پاس آ بیٹھیں۔ پٹاری گھسیٹ کے پان بنایا۔

رفعت ۔ آپا کل مہرالنسا پھر آئیں گی میں کیا جواب دوں گی۔

عصمت ۔ جواب کیا۔ "ہاں" اس کے لئے بھی کسی تام جھام کی ضرورت ہے۔

رفعت ۔ اوئی لو اور سنو ۔ آپ نے تو کیسی آسان "ہاں" کہہ دی ۔
عصمت ۔ تو بوا اور کیا کہوں ۔ بیٹی کا معاملہ ٹھہرا آخر لڑکے میں کیا نی ہے ۔ ٹک ٹک سے ٹھیک ۔ ننھیال ددھیال صاف ۔ پڑھا لکھا وہ مو ابی اے ٹی اے کیا ہوتا ہے اس میں پڑھتا ہے سو پچاس کا نوکر بھی ہو جائے گا اور تمہیں کیا چاہئے ۔ یہی چودھویں پندرھویں برس شادی کا وقت ہوتا ہے ۔
رفعت ۔ آپا ابھی تو شوکت کی پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی ہے ۔ اور پھر جب تک لڑکا کھاتا کماتا نہ ہو کس امید پہ لڑکی دے دوں ۔ میں تو بیس سے پہلے کبھی بھی میری شوکت کو نہ بیاہوں اور وہ بھی جب تک شوکت کی رائے نہ ہو ہاں کیسے کہہ دوں ۔
عصمت ۔ تو بوا پھر پوچھتی کیوں ہو جو دل میں آئے سو کرو ۔ نا بوا ہمارے زمانے میں اماں باوا نے جس کے چاہا حوالے کر دیا ۔ جیسا ملا اُسے بھرا بھگتا ۔ جب آئی گور ہی جا سوئے کسی نے ہوں سنی نہ ہاں ۔ یہ موئے فرنگیوں کے طور طریق انہیں کو مبارک رہیں ۔ بھلا غضب تو دیکھو شوکت سولھویں برس میں موئے لونڈوں کی طرح مدرسوں میں پڑھنے جائے نہ ڈولی نہ گاڑی ۔ اچھی بُری نظریں پڑیں ۔ بیٹی ذات ٹھہری ۔ اللہ اماں باوا کی عزت رکھے ۔ نا بوا مجھے تو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔
رفعت ۔ آپا بے شک والدین اولاد کے لئے اچھا ہی کرتے ہیں لیکن انہیں اولاد کے خیالات کا احساس کیسے ہو ۔ اب آپ ہی بتائیے میرے دل میں اس وقت کیا ہے ۔ آپ اپنی ہی کہئے آکا دولہا سے آپ خوش تھیں ۔ ایک نہیں دو دو سوکنوں کا جلاپا رات دن کی دانتا کِل کِل آپ دن کہتیں تو وہ رات ۔ آپ نے اپنے کو تمام کر لیا مگر انہیں کبھی پروا بھی نہ ہوئی ۔ کیوں کیا ابا جان کو اُن کے اطوار معلوم نہ تھے بچپن سے دیکھا تھا ۔ مگر وہی کوتاہ نظری ۔ خاندان سے باہر نگاہ ہی نہ کی ۔ بیسیوں پیام آئے مگر خدا بخشے اماں جان نے کسی کو کشمیر کا جلاہا ٹھہرایا کسی کو نو دولتا کہا کسی کی ددھیال میں نی نکالی ۔ کسی کی ننھیال میں کیڑے ڈالے ایک نہ پسند آیا ۔
عصمت ۔ نا بوا ۔ میرے موئے اماں باوا کو کیوں پیتی ہو ۔ قسمت میں جیسا لکھا تھا مل گیا ۔ تم ہی کہو شمّوں کے لئے آخر تمہیں بھی تو مانگا تھا ۔ وہ بھی تو ان کا بھانجا ہی تھا ۔ پھر تمہیں کیوں نہ دے دیا ۔
رفعت ۔ تو مجھے جھونکنے میں کسر ہی کیا تھی ۔ اللہ بخشے نانا جان نہ اڑتے نہ اِن سے میری شادی ہوتی ایک نواسی کا حشر تو دیکھ چکے تھے دوسری کی چھاتی پر کیوں مونگ دلواتے ۔ دیکھ لو شموں کیا کر رہا ہے ایک پہ ایک سوکن لا رہا ہے باپ کی اس گاڑھے پسینے کی کمائی یوں خاک میں ملا رہا ہے ۔ باجی یہ سب جہالت کی باتیں ہیں قسمت کے

لکھے کو تو کون میٹ سکتا ہے۔ مگر اللہ نے جب آنکھیں دی ہیں تو اندھے کیوں ہو جائیں
عصمت۔ ہاں بوا سچ ہے۔ چودھویں صدی ہے۔ لڑکی کو کولے سے لگائے بیٹھی رہو۔ تم ہی نے تو اس لڑکی کو غارت کیا ہے۔ موئی چھپل پائیاں میموں جیسا لہنگا پھڑکاتی پھرے۔ بوا چاہے برا مانو یا بھلا میں تو خدالگتی کہوں گی۔ نوج کنبہ کی لڑکیاں ایسی ہوائی دیدہ ہوں۔ نہ سینا نہ پرونا نہ پکانا نہ ریندھنا۔ جب دیکھو جب نگوڑی پرچیاں۔ یہ فلانی مس کی ہے یہ ڈھکی میم کی ہے۔ بس یہی کسر رہ گئی بیٹی سے میاں بھی پسند کرالو (کانوں پہ ہاتھ رکھ کر) نا بوا۔ اللہ بچائے بُرا زمانہ ہے۔
رفعت۔ آپا آپ سچ کہتی ہیں۔ اگلے زمانے میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ اس زمانے میں نہ کوئی شرم کو پوچھتا ہے نہ گھرداری کو۔ جہاں دیکھو تعلیم پوچھی جاتی ہے جس لڑکے کو دیکھئے انگریزی تہذیب کا دلدادہ، انگریزی رہائش کا شیدا۔ اگر لڑکی اس جیسی نہ ہوئی تو دونوں کی جان ضیق میں اور ماں باوا کے گلے میں جوتیوں کا ہار۔ تو باجی اپنے کو جنجال میں کون ڈالے۔ اولاد جانے اور اُس کا کام۔ ہاں اچھا بُرا ہم بھی بتا دیں گے۔
عصمت۔ بس بوا تو پھر تم پہ کاہے کا بوجھ ہے۔ لڑکی خود جواب دے لے گی۔
رفعت۔ توبہ آپا آپ تو ناراض ہوتی ہیں۔
عصمت۔ ناراض نہ ہوں تو کیا کروں۔ لڑکی کو تم نے ہوّا بنا دیا۔ بوا بیٹی نہ ہوئی اتالیق ہوئی۔
رفعت۔ آپا اتالیق کی کیا بات ہے۔ لڑکی سے پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں تو کل مہرالنسا سے کہہ دوں گی لڑکا پڑھ لکھ لے کام سے لگ لے پھر دیکھا جائے گا۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے۔

سردار محمد معظم خاں

تھوڑے پر قناعت کرنا بہت بڑی دانائی ہے۔
نیکی کی محبت خوشی پیدا کرتی ہے۔
محبت کا ہاتھ افلاس کو شکست دیتا ہے۔
کاہل کو اپنا نفس بارگراں اور زندگی وبالِ جاں معلوم ہوتی ہے

ارشد بدایونی

بھابی کے نام خط

اے بی بھابی سلام

کہو گی تو سہی کہ اللہ ری سعیدہ کتنی جھوٹی ہے۔ مگر بھئی بھابی دیدوں گھٹنوں کی قسم جو مجھ نگوڑی کو دم لینے کی بھی مہلت ملی ہو۔ یوں تو مجھے گھر پہنچے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہو گئے مگر ادھر تو نگوڑے گھر کے دھندے اور اُدھر ماما ایسی کم بخت ہے کہ بس اگر خبر نہ رکھوں تو کھانا دیکھتے ہی بجائے بھوک لگنے کے بھاگ جائے۔ مصالحہ کی ہرانڈ گوشت کی بساند کے مارے متلی ہونے لگتی ہے۔ یہ نگوڑی دیہات کی عورتیں ہماری دہلی کے کھانے کیا جانیں۔ یہ تو خیر بیچاری غریب عورت ہے جو سونے سے پیلی ہوئی پڑی ہیں اُن کو بھی دیکھو تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ روپیہ ہو جانے دو موا گنوارپن کہاں جائیگا کل یہاں کے تحصیلدار کی بیوی ملنے آئی تھیں، کوئی پچاس برس کی عورت، سر میں کڑبڑے بال، سانولا رنگ، موٹا نقشہ تلوے سے سارے منہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سبز مخمل کا سربیب پاجامہ جس کی مہریوں پر لچکا ٹنکا، اودا مخمل کا کرتا نتھی جان توئی لچکا لگا، سبز چمپا نے رنگ کا بنارسی دوپٹہ، زیور میں گوندنی کی طرح لدی، پاؤں میں پازیب رم جھول چوراہی پل لچھے الم غلم پہنے، ہاتھ میں آرسی جس میں بار بار اپنا منہ دیکھتی تھیں۔ غرض کہ عورت کیا تھی خاصا ہولی کا سوانگ تھی۔ بے خبر بے اطلاع آدھمکیں۔ میں غسل کر رہی تھی بسنتی نے جا کر کہا، جلدی جلدی نہیں لوٹے ڈال باہر نکلی۔ یہ ہیئت کذائی دیکھ کر ہنسی بہت آئی مگر ضبط کیا۔ افروز جہاں جیسی شریر ہے تم کو معلوم ہے۔ وہ باتیں کر رہی تھیں یہ پیچھے کھڑی نقلیں اتار رہی تھی میری مارے ہنسی کے بُری حالت تھی۔ اے ہے بھابی ان دیہات والیوں کی شکل پر روڑھاپن کیسا برستا ہے۔ خدا کسی دلی والے کو تو دیہات میں لائے نہیں۔ بات کرو تو مزا نہیں، نگوڑی سخت زبان، میرا تو دم الٹتا ہے، آٹھ دن میں دل گھبرا گیا۔ سچ کہوں تمہارے نندوئی کی تکلیف کا خیال نہ ہو تو ایک دن بھی نہ ٹھہروں۔ کٹنے بیں لدی پڑی ہیں مگر قرینہ نہیں۔ اِلو میں تم کو ایک دعوت کا حال سناؤں۔ پیر کے دن یہاں ایک بڑے زمیندار ہیں، گاؤں گراؤں کوٹھی باغ سب کچھ، باہر کا کارخانہ بہت بڑا، میں سمجھی اُن کی بیوی سے مل کر ضرور جی بہل جائے گا۔ خیر بھابی میں جو پہنچی تو دیکھا کہ آنگن بہت بڑا مچنتہ، مگر نارنگی امرود کے چھلکے جابجا کوڑے کے ڈھیر، حوض سنگِ مرمر کا کیسا خوبصورت بنا ہوا مگر اس میں بھی ٹوٹے ٹھیکرے، ماش کی دال کے چھلکے نوکریں تین چار انڑ والنے آئی تھیں۔ میلے چکٹ کپڑے جھنڈے بال۔ میرے کپڑے دیکھ کر لگیں چرغم چرغم کرنے۔ میں اس حیرت میں تھی کہ یہ تماشا کیا ہے۔ آگے بڑھی چبوترے پر ایک بان کی چارپائی پر ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی بیٹھی ہوئی۔ ایک ماما اُس کی جوئیں دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کے کپڑے ریشم کے تھے اور گوٹا کناری لگا تھا مگر میلے چکٹ۔

معلوم ہوا یہ سردار صاحب کی صاحبزادی ہیں ۔ میں یہ تماشا دیکھتی چلی جا رہی تھی کہ دو تین لونڈیاں دھبڑ دھبڑ بھاگتی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی آئیں کہ بی بی جی بی بی آتی ہیں ۔ بوا میں ان کی شکل حیران ہو کر دیکھنے لگی بے خیالی میں منہ اوپر اٹھائے جا رہی تھی نگوڑے کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسلا ، اوندھے منہ گرنے سے بچی ، ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک بیوی سیاہ فام ، بھدی سی آ کر نہ سلام نہ دعا گلے سے لپٹ گئیں ۔ میں ہکا بکا کہ یہ تماشا کیا ہے ۔ خیر جب وہ الگ ہوئیں تو معلوم ہوا سردار صاحب کی بیوی یہی ہیں ۔ کہنے لگیں بوبو اندر چلو ۔ اُن کے اس فقرے پر ایسی ہنسی آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی ۔ ہنستے ہوئے دوپٹے پر جو نظر پڑی تو نگوڑا ابر لیٹ کا دوپٹہ جس پر اللہ بخشے دادا خوش قدم کے ہاتھ کی کیکری اور رکتاؤ بنا ہوا تھا غارت ہو کر رہ گیا ۔ چکنے ہاتھ کا پورا پنجے کا نشان دوپٹے پر ہو گیا ۔ صدر دالان میں پہنچی ۔ چوکوں پر قیمتی دالان کا فرش مگر منوں گرد ۔ قیمتی اشیاء جو طاقچوں میں سجی تھیں وہ بھی خاک آلود ۔ اب کھانے کا حال بھی سنو ۔ سینی زلبتنی خوان پوش ، دو لونڈیاں طشتریوں میں کھانا لے کر آئیں ۔ پیچھے سے ایک روٹیوں کی تھئی لے کر آئی ۔ کھانے تو بہت تھے مگر نگوڑے سراندے بساندے ، گوشت کچر کچر کرتا ۔ بہ مشکل تھوڑا بہت کھایا ۔ اور تو خیر سب کچھ تھا مگر شامی کبابوں پر ورق دیکھ کر ہنسی ضبط نہ ہو سکی ۔ کھانا شروع کرنے سے ذری دیر پہلے ایک بیوی نے آ کر پاؤں پکڑ لئے ۔ میں نے سردار صاحب کی بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا ، کہنے لگیں یہ بہو ہیں ، ہمارے ہاں بہوئیں پاؤں چھوتی ہیں ۔ ان کا بھی حلیہ سنو ۔ شکل تو خیر خاصی تھی مگر دیہات کا روڑھا پن کہاں جائے ۔ بچہ کوئی چار برس کا گود میں ، ٹانگوں سے ننگا سر پر گوٹے کی ٹوپی ، ہاتھ میں گاجر کا ٹکڑا ۔ کھانا شروع ہوا لڑکا بہت بے باکی سے سب چیزیں بہت بہت لے کر کھا رہا تھا ، شب دیگ کا پیالہ اٹھانے کے لئے جو ہاتھ بڑھایا تو پانی کا گلاس جو بھرا رکھا تھا وہ اس سے ٹکرا کر گرا ۔ شامتِ اعمال سے وہ مجھ نگوڑی کے قریب تھا ۔ پانی بہ کر آیا اور جب تک میں اٹھوں اٹھوں غرارے کے پائنچے سب گیلے ہو گئے ۔ اس قدر غصہ آیا کہ بس کیا کہوں مگر دادی نے مسکرا کر کہا ۔ ننھے نچلے بیٹھو ، دیکھو پانی گر گیا ۔ لڑکا اس کہنے پر بگڑ گیا اور منہ اوندھا کر جو لات ماری تو تلاجی کا پیالہ جو پاس رکھا تھا اوندھ گیا ۔ بہ مشکل ماں نے خوشامد منت سماجت سے اٹھایا ۔ میں تو ایسی گھبرائی کہ کھانا ختم کرتے ہی اجازت مانگی ۔ لے ہے بھابی کبھی اماں جان یہاں ہوں اور تم ہو تو تماشا دیکھو ۔ لے بھابی افروز کہتی تھی کہ حسنے کا خیر سے پیر بھاری ہے اس چھوٹی پماڑن کا تو مجھے یقین نہیں تم لکھو تو یقین آئے ۔ ہم تو اس دن کی آس منا رہے ہیں ۔ ماموں ابا تو بہت خوش ہونگے ! افروز تم کو سلام کہتی ہے ۔ یہ خط ذری حمیدہ کو دکھا دینا ۔ ذرا مہلت ہو تو اُن کو بھی خط لکھوں ۔ اماں جان کی خیریت لکھنا ۔ لو خدا حافظ ۔ اب غسل کرنے جاتی ہوں ، مارے گرمی کے دم ہولا رہا ہے ۔ فقط تمہاری سعیدہ

ماہ رخ

لمعات

حیات و ذوقِ طرب، اے رہینِ بےخبری　　گئی نہ ظلمتِ شب تا ستارۂ سحری

غمِ زمانہ صبر آزما مُبارک باد　　کہ رازِ ہمتِ پرواز ہے شکستہ پری

ہر ایک ذرۂ تاریک ہے حریمِ جمال　　حجابِ دید اگر ہو نہ تیری کم نظری

مگر بطرزِ جنوں چاکِ پیرہن کر لے!!　　جنوں اگرچہ نہ دیتا ہو درسِ جامہ دری

نثار لاکھ نشاطِ ارم، جو ممکن ہو　　شرابِ ناب و لبِ جوئبار و رقص پری

مقامِ شکر ہے اے شکوہ سنجِ ناپرسی　　کہ ننگِ زخمِ جگر تھا خیالِ بخیہ گری

حدودِ میکدہ ہیں، کائناتِ لامحدود　　جہانِ بیخودی و صد جہانِ بےخبری

ذلیل کیوں نہ متاعِ کمال ہو اختر
ہوئی ہے زینتِ بازار جنسِ بےہنری

سید علی اختر

خالد اور جیّدہ

(عرب کے مشہور شاعر اصمعی کا ایک افسانہ)

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے دو بھائی تھے، دونوں اپنی جرات اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر تھا۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا مگر ظہیر پھر بھی اُس کا تابع فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر سخت تکرار ہوئی اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا "اے عربی سرداروں کے سردار! تم اس قدر آزردہ خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے؟" ظہیر نے کہا "میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا وہ دنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ، اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مدمقابل ہوا ہے اور اپنی قوم کے رؤسا کے سامنے اس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا۔" اُس کی بیوی نے کہا "اُسے اپنے مال و منال سے لطف اٹھانے دو اور تم یہاں سے چلو۔" اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے شعرا کے شعر پڑھے جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورہ کو مان لیا۔ اُس نے رخصت کی تیاری کر لی۔ اپنے خیمے لپیٹ لئے اونٹوں پر اسباب لادا، اور قبیلۂ سعد کی قیام گاہ کی طرف چل دیا جو اُس کے حلیف تھے۔ مگر اُس کے دل میں اپنے بھائی سے جدا ہونے پر رہ رہ کر ایک درد اُٹھتا تھا ـــــ اور اُس نے کہا "اس سفر میں جو مجھے تجھ سے دُور لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دُور لے جائے گا۔ . . . اگر اب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے اور ہر مصر میں ایک ہزار نیل ہوں تو میں انہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دوں گا جب تک میں تجھ سے دور رہوں گا اپنی کم مائگی پر قناعت کروں گا اور جدائی کے دنوں میں اس شعر کو پڑھوں گا جو تابناک موتیوں کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے: "جب کسی شخص کی اپنی ہی قوم اور اپنے ہی وطن میں تحقیر کی جائے تو

اُس کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تو جس نے میرے دل کو یوں زخمی کیا ہے بہت جلد رحمٰن و رحیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا کیونکہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے"

آخر ظہیر قبیلۂ سعد میں پہنچ گیا اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، اور ظہیر نے اُس سے کہا "اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا چرچا نہ کرنا اور لوگوں کو اس مغالطے میں رہنے دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شماتت پیدا نہ ہو" آخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی انہوں نے اس کا نام جنیدہ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جُندر کہہ کر پکارا جائے تاکہ وہ اسے لڑکا سمجھیں۔ اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے ان کے ہاں کئی دن تک صبح و شام دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر منتخب کیا، کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اُس کے معاملات سلجھ رہے تھے۔

دونوں بچے جوان ہو گئے اور اُن کی شہرت عرب کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری اور تمام وہ فنونِ جنگ سکھا دیئے تھے جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت محنت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا جب کبھی وہ کسی جنگ پر جاتا قبیلہ کے اور عربوں کے ساتھ وہ اُسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جنیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقا سے سبقت لے گئی، یہاں تک کہ وہ تنِ تنہا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی۔ اُس کا نام سن کر لوگ کانپ جایا کرتے تھے۔ جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی تو وہ ضرور کہا کرتی تھی: "میں جندر ابنِ ظہیر ہوں جو قبیلوں کا شہسوار ہے"

اُدھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت عقلمند اور دانا سردار تھا اجنبیوں کی تواضع کے لئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے جہاں بہادرانِ ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسواری کا فن سیکھا تھا،

اور اب ایک بے باک سپاہی اور ایک خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جبار کے متعلق سنا اور اُس کے دل میں اُس سے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اُس کے کرتب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا لیکن وہ اپنے اس شوق کو پُورا نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ محارب کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اعزاز دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضے میں آگئی۔ اجنبیوں کی تواضع، غربا اور مساکین کی دستگیری اور بھوکے ننگوں کو کھانا کپڑا دینے میں وہ اپنے باپ کا پیرو تھا۔ اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کی معیت میں بادیہ پیمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس نے اُس کی جسمانی قوت اور جرات کو اور بڑھا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے بہت سے قیمتی تحالف جمع کئے اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام نہ کھینچی جب تک وہ ظہیر کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا۔ ظہیر اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس کی خاطر تواضع کا بڑا اہتمام کیا۔ کیونکہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پر سنی تھیں۔ خالد جیدہ سے بھی ملا۔ اُس نے اُسے سلام کیا اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چوما یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی اسی کی طرح مرد ہے۔ جیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اُس نے شہسواری اور سپہگری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصہ لیا۔ اُدھر جیدہ کا یہ حال تھا کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حسن پر پڑی تھی وہ سو جان سے اُس پر نثار ہو چکی تھی۔ اُسے نیند نہ آتی تھی، اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا اور اُس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا "اے میری ماں، اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں اُس کی جدائی میں مر جاؤں گی"۔ اُس کی ماں نے جب یہ سنا تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناراض ہونا بے کار ہے۔ اُس نے کہا "جیدہ، اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، کیونکہ خالد تمہاری پسند کا لڑکا ہے اور اُس کی رگوں میں تمہاری قوم کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو اور اسی کی طرح تم بہادر اور شہسواری میں فرد ہو۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کر دوں گی، پھر ہم جلد ہی تمہاری شادی خالد سے کر دیں گے اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی۔ جیدہ کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ حسن کی اس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی، اور کہنے لگی: "کیا! یہ تمہارا بیٹا جندر نہیں ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا "نہیں! یہ جیدہ ہے ـــــ ماہِ حسن کو دیکھو وہ طلوع ہو چکا ہے۔" پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں۔ خالد کی ماں نے جس کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا: "میری پیاری بہن ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں میں نے کبھی اس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کا نام کیا ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کا نام جیدہ ہے اور اس راز سے تمہیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہ حسن و جمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں" خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا۔ اور کہنے لگی "جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی۔ وہ فوراً اٹھی اور خالد کو تلاش کر کے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسے بتا دیا اور جیدہ کے حسن و جمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی اُس نے کہا "مجھے اپنے ایمان کی قسم، اے بیٹے، میں نے جیدہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے اور نہ کبھی شہر میں۔ کوئی چیز اپنے حسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے اور کوئی چیز اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے۔ جلدی کرو میرے بیٹے اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے مانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کرلے تو یقیناً تم خوش قسمت ہو گے۔ جاؤ اور جلد سے جلد اُسے حاصل کر لو۔"

یہ الفاظ سن کر خالد کی آنکھیں جھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا، پھر اُس نے کہا "اماں، میں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیئے مجھے اب جیدہ سے کچھ نہیں کہنا، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معین ہے، اُس کی سیرت اور اس کا طرزِ کلام استحکام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گزاری ہے جن پر میں اپنا روپیہ صرف کرتا ہوں اور جن کے ساتھ مل کر میں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے۔ اب رہی جیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے، ایک نوجوان لڑکی کی؟" پھر اُس نے اپنا زرہ بکتر پہن لیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، چچا کو خدا حافظ کہا اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا "آخر اس جلدی کے کیا معنی ہیں؟" خالد نے کہا "میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔" اور

گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اُس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

جیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی ـــ اُس کی نیند اڑگئی اور اُس کی بھوک زائل ہوگئی کچھ دن کے بعد جب اُس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اُس کی نگاہ جیدہ پر پڑی ـ اُسے یوں افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آجائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ جیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی اور جس کی اداسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی اپنی ماں سے کہا " اماں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مر رہی ہوں، درآنحالیکہ یہ کم بخت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر خدا مجھے قوت دے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے موت کے قہر و غضب کا تجربہ کراؤں اور اُس کے درد و کرب کا مزہ چکھاؤں" یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی، اُس نے زرہ پہنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی کہ میں شکار کے لئے جا رہی ہوں۔ تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیام گاہ میں پہنچ گئی۔ چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا اس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا اور وہ اُس خیمے میں داخل ہوگئی جو اجنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح ڈھکی ہوئی تھیں۔ غلاموں اور خادموں نے اس کا استقبال کیا اور اس طرح اُس کی خاطر و مدارات کی جیسے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی۔ اُس رات جیدہ نے آرام کیا، لیکن دوسرے دن فوجی ورزشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کر دیا، بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کاردانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ دوپہر سے بہت پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کرالی۔ خالد خود اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا، اور جب اُس نے اُس کا کمالِ فن ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا، اور اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ کے لئے پیش کیا۔ جیدہ فوراً مقابلے کے میدان میں آگئی اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گئے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں آزما ڈالے یہاں تک کہ رات کے سائے اُن پر چھانے لگے۔ جب وہ جدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریقِ غالب کون ہے۔ یوں جب جیدہ تماشائیوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ لوگ

اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ جز بز سے ہو رہے ہیں۔ خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ اُس کا دل آج کے معرکے کے خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ جیدہ تین دن تک خالد کے ہاں مقیم رہی۔ ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آ دھمکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی۔ اُس نے ان مقابلوں سے خُوب لطف اٹھایا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا، کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کس قبیلے سے ہے۔

چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسبِ معمول اپنے گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اُس نے اسے سلام کیا اور اُس نے سلام کا جواب دیا۔ خالد نے کہا "اے شریف عرب، میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں گو میں اب تک اظہارِ نیازمندی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا ہوں جس نے تجھے یہ قوت اور چستی عطا کی ہے مجھے بتا کہ تو کون ہے اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے؟ کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے بتا میں تجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بیتاب ہوں۔"

جیدہ مسکرائی، اور خود کو اوپر اٹھاتے ہوئے اُس نے جواب دیا "خالد میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی مگر تو نے انکار کر دیا ـــ اپنے اُس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا۔ ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اُسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اُس بیتاب محبت کا جو یکایک اُس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے کیا انجام ہوگا۔ وہ اپنے اُس جنگجویانہ ذوق اور اپنی اُن سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہو گیا جنہوں نے اُسے اس رنج و اندوہ کے کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورتوں سے اُس کی نفرت یکایک محبت سے بدل گئی۔ اُس نے اپنی ماں کو بلا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے کہا "میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیئے، مگر تھوڑی دیر صبر سے انتظار کرو، تاکہ میں جا کر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ تمہارے لئے مانگوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک اونٹ پر سوار ہو گئی اور صحرا میں اُن نقوشِ قدم پر پڑ لی جو جیدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے۔ جیدہ نے گھر پہنچ کر تمام واقعہ من و عن اپنی ماں کو سنا دیا تھا۔ خالد کی ماں نے آتے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی

میں ڈال دیا اور اپنے بیٹے کے لئے جیدہ کا رشتہ مانگا کیونکہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا۔ جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سنا تو اُس نے کہا "یہ کبھی نہ ہوگا خواہ مجھے اس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہوا اُس کا مقصد محض غم واندوہ کی اُس آگ کی پیاس کو بجھانا تھا جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی اور میری روح کو جھلسے ڈالتی تھی۔"

یہ الفاظ سن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی جسے جیدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے جیدہ کا جواب سنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ اور جیدہ کا انکار اُس کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ ہوگیا۔ اُس نے کہا "اے میری ماں، میں کیا کروں مجھے اس دام سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا"۔ اُس نے جواب دیا "مگر یہ کہ تم اپنے تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو اور اُن دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آجائے۔ اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ اور ان سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو اور اپنا دامن پھیلائے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کرلے"۔ اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کر دیا۔ جونہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا چچا گھر واپس آگیا ہے اُس نے اپنے رؤساءِ خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی انہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ عجیب بات ہے کیونکہ ہم تو ہمیشہ سے یہی سنتے آئے تھے کہ تمہارے چچا کے ہاں ایک بیٹا ہے جس کا نام جندر ہے مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو جو اپنے چچا کی لڑکی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ ہم سب اُس کے سامنے جاکر اپنے سر جھکا دیں اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے"۔ خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھ اُن ایک سو بہادر سواروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پلے اور بڑھے تھے اور پہلے سے زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک وہ قبیلۂ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی خصوصاً جب اُس نے اپنے بھتیجے کو تمام امرا و اعیان کے ساتھ دیکھا۔ اُسے سان گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ

اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ ظہیر نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی اُن کے لئے خیمے مہیا کئے اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ اُس نے اونٹ اور بھیڑیں ذبح کرنے کا حکم دیا اور اُن کی ایک عظیم الشان دعوت کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام اُن کے لئے کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جندر کے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہہ دیا اور جو کچھ اُس کے ساتھ گزر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "میرے بھائیو! میں اس راز کو زیادہ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہو گی کیونکہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اُس کے لائق پاتا ہوں" اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاہدے کے گواہ تھے۔ پانچ سو بھورے سیاہ چشم اونٹ اور یمن کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ جہیز قرار پائے۔ لیکن قبیلہ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملہ کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا تو جیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریقِ عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب اُسے بن بیاہا نہیں رکھنا چاہتا تو اُس نے کہا "ابا! اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اس کے خیمے میں داخل نہ ہوں گی جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اونٹوں میں سے ایک ہزار اونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت "تلوار کے دھنی" قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں" خالد نے اِس شرط کو منظور کر لیا۔ لیکن اُس کے افسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ تیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر مہم پر روانہ ہو گیا اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلۂ عامر کو مغلوب کر لیا۔ "تلوار کے دھنی" کو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا، بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا، اُن کو لوٹا اور اُس سے بہت زیادہ مالِ غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا جتنا جیدہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدا ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا۔ مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تو جیدہ نے اسے اپنے پاس بلا کر یہ الفاظ کہے، "اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں

اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذی رتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو میرے اونٹ کی مہار تھامے۔ وہ ملک کے کسی معزز ترین رئیس کی بیٹی ہو تاکہ اُس دن میں عرب کی معزز ترین بیٹی سمجھی جاؤں۔" خالد نے مان لیا اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہوگیا۔ اُسی روز وہ اپنے سواروں کو لے کر چل کھڑا ہوا اور سرزمین یمر کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کرگیا یہاں تک کہ وہ ملکِ حجاز میں پہنچا۔ اس جگہ اُس نے معاویہ بن مضل کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا، اور مدافعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عمیرہ بنتِ معاویہ کو گرفتار کیا جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی۔

اُس نے اپنی تیغ کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی سب مدافعت بے کار ہوگئی، اور وہ بھاگ کر منتشر ہوگئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی اور پھر گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کرلیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کئی قسم کے دوسرے ساز بجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں۔ سارا قبیلہ خوشیاں منا رہا تھا اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے اور رفیقوں اور دوستوں کو اُس دعوت پر مدعو کیا جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کر رہا تھا۔ شادی پر اس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سرمست کردیا۔ لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیروں شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیدہ کو کسی طرح پہلے ہی سے اُس کے ارادہ کا علم ہوچکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زرہ بکتر میں چھپا لیا اور گھوڑے پر چڑھ کر نیزہ خالد کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ ابھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں اُن دونوں کا سامنا ہوا۔ وہ ایک وحشی درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور ایک شدید حملے کے ساتھ چلا کر بولی "اے عرب! اپنے گھوڑے سے اُتر جا اور اپنی زرہ بکتر اتار ڈال اگر تو نے ذرا بھی لیت و لعل کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہوگا" خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کرلیا۔ ذرا سی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ کشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف

کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا "میں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، مجھے بتا کہ تُو اس صحرا کا کون سا بطلِ جلیل ہے، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا حملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں کو اور میری دلی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔" یہ الفاظ سن کر جیدہ نے اپنا خود اوپر اُٹھایا تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا "خالد، کیا اُس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے تاکہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اس کے واحد اجارہ دار جنگوں میں لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں؟" اِس چبھتی ہوئی ملامت پر خالد شرم میں غرق ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم، جیدہ تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو یا بس مجھ ہی پر تجھے اپنے زور و قوت کو ثابت کرنا تھا؟" جیدہ نے کہا "خدا کی قسم، میں اس صحرا میں اس لئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے شکار میں تیری مدد کروں، تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ سن کر خالد جیدہ کی جرات اور عزم پر حیرت اور تعجب سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالد نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا اور جیدہ نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور جیدہ خالد کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا "اور میں تمہیں اُس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے۔" پھر یکایک وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالد اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا، اور اُس نے انہیں درندوں کو اٹھا کر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالد نے کیا کیا ہے انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالد تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ کنیزیں جھانجھیں بجاتی تھیں، غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں۔ اس نشاط و سرود کے درمیان خالد اور جیدہ کی شادی ہوئی۔ عمیرہ بنتِ معاویہ دلہن کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھی اور عورتیں اور مرد جیدہ کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

منصور احمد

جستجوئے حق

جنہیں علمِ حقیقت ہے عمل سے ہے مُدّعا اُن کا
جو دل رکھتے ہیں سینے میں خدا ہے منتہا اُن کا

ضمیر ایمان سے ہے جن کا جنہیں حاصل ہی یکسوئی
اُنہیں کعبے سے کیا؟ دل اُن کا ہے قبلہ نما اُن کا

کسی کو کیا ضرورت ہے کسی کی رہنمائی کی؟
خود اپنے رہنما ہیں جو خُدا ہے رہنما اُن کا

جنہیں دشت جہاں میں زندگی راہِ ترقی ہے
اُنہیں منزل سے کیا مطلب؟ سفر ہے مُدعا اُن کا

خوشی ہو غم ہو کچھ ہو زندگی یہ ہے کہ خوش رہیے
جو خوش رہتے ہیں خوش اُن سے ہمیشہ ہی خدا اُن کا

جنہیں ہے آرزو حق کی جنہیں ہے جستجو حق کی
خدا ہے مبتدا اُن کا خدا ہے منتہا اُن کا

یہی رازِ حقیقت ہے خودی بھی بےخودی بھی ہو
جو بیخود ہیں خودی میں وہ خدا کے ہیں خدا اُن کا

د۔ ل

رات کی خاموشی میں

رات کی خاموشی میں تنگ و تاریک جھونپڑی کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر فرشِ خاکی پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا بار سینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر ہر صبح جب صبح قیامت کے استقبال کو اٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرہ کا سورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ مجھے دنیا کی راز جُو نگاہوں کے سامنے عریاں بدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے اندھیری راتوں کو جب جھکڑ کی خوفناک تندی اور آندھی کا زور بدن میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے، بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ جب بارش اور اولوں کے طوفانی شور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث روحیں تحت الثریٰ سے نکل کر کائنات کو اپنی لرزہ انگیز چیخوں سے تہ و بالا کر ڈالیں گی میں اپنے پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ انسان کا دل ان طوفان زدہ عناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ "انسان کا دل" میں نے غلط استعمال کیا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

وہ جنہیں زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی گلشنِ حیات میں شگوفے نکلتے، کلیاں چٹکتی اور نوا سنجانِ چمن کو نغمہ پیرائی میں مصروف دیکھا۔ جن کے کان سازِ زندگی سے صرف نغمہ ہائے عشرت ہی سننے کے عادی رہے۔ جن کی سماعت نوحۂ غم کی دلدوز صداؤں سے ہمیشہ محفوظ رہی آہ وہ بھی انسان ہیں۔ اگر یہی "انسان" ہیں تو کیا اس لفظ کا اطلاق اُن سوختہ سامانوں پر بھی ہو سکے گا جن پر آسمان کے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے آنکھ کھولی تو زندگی کے باغ میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی اور جوں جوں دن گزرتے گئے بادِ خزاں کے تند جھونکوں سے پتے گرتے اور پھول مرجھاتے چلے گئے جن کی امید کی کلی کھلنے سے پیشتر ہی مصائب کی گرم لو نے جلا کر خاک کر دی۔ جن کی کشتیٔ حیات سفر کی شروع منزل میں حوادث کی سخت چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ خوش نصیب جن کی آنکھیں اشکِ خوناب اور دل بارِ الم سے آزاد ہیں کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کا دل بھی ان طوفان زدہ عناصر کی طرح بجائے خود ایک پُر خروش طوفان ہے

وہ بیدار بخت ہستیاں جن کے لئے "بستر خار بستر" اور "سر رنج بالیں" نہیں ثابت ہوتا کیا جانیں کہ ایک طوفان زدہ دل کو پہلو میں لے کر سونا گویا کانٹوں پہ لیٹنا اور دہکتے کوئلوں پہ جلنا ہے۔

اکثر راتیں اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں۔ صبح کے انتظار میں نہیں کیونکہ فکرِ فردا اور غمِ ماضی تو میری جان کے قاتل ہیں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اندر ہی اندر مر جاتی ہیں خیالات آتے ہیں اور کسی کے کان یا زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رات کے اختتام پر سپیدۂ سحر نمودار ہو کر حیاتِ تازہ کا پیغام دیتا ہے۔ ہر شب آسمان پر تیرہ و تار بادل چھائے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ملفوف رہتی ہے لیکن اُس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو، ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، پُرنور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ حیات !!!!!! سالہا سال گزر جانے پر ایک امیدِ گریزاں "ایک فریبِ نفس" میں مبتلا ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے افقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو۔ مگر جہاں میری اور تمنائیں لاحاصل ثابت ہوئیں یہ آرزو بھی بجھتی نظر آرہی ہے۔

میرے آقا عین اُس وقت جب میں صبحِ مسرت کی شادکامیوں سے ہمکنار ہونے والا تھا تو نے مجھے شامِ غم کی حسرتوں سے دوچار کر دیا۔ جامِ عشرت میرے لبوں تک پہنچتے پہنچتے "لمحاتِ حیات" میں متبدل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کو آگ اور پانی کے طوفان میں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے سب صحیح۔ لیکن ایسے تہی دستانِ قسمت بھی تو ہیں جو تکمیلِ حیات کے اس مرحلہ سے گزرتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو گئے یا موجوں کا لقمہ بن گئے۔ جاڑا، گرمی، برسات، بہار، خزاں رنگ رلیاں منانے والوں کے لئے قدرت کے مختلف اللون مظاہر ہیں جن سے بہ لحاظِ موسم دلبستگی کے لوازمات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر غم کا ایک ہی موسم ہے غمگین دلوں کے لئے وقت بدلتا نہیں گردش کرتا ہے۔ کتنی برساتیں آئیں اور گزر گئیں مگر میرا دیدۂ گریاں نہ تھما۔ بادل آتے کھل کر برسے اور برس کر کھل گئے لیکن ادبار کی کالی گھٹائیں نہ چھٹیں۔ گرمی کی حدت دنیا کو نمونۂ جہنم بنا کر سردی میں تبدیل ہوتی گئی مگر اُس تپش کا کیا علاج جس نے میری جانِ ناتواں کو شعلہ زار اور روحِ نزار کو آتشکدہ بنا رکھا ہے۔

اے آقا میں تجھ سے شبہائے عشرت کا طالب نہیں میں حیاتِ مستعار کے چند دنوں کو جھوٹی خوشیوں سے بھر لینا نہیں چاہتا۔ میں تیرے پاس شکایت لے کر نہیں آیا کہ کیوں مجھ سے کم استعداد والے لوگ موردِ الطاف و اکرام بن رہے ہیں۔ میں کون کہ تیری تقسیمِ انعامات پر حرف گیری کروں؟ ہاں اس دنیائے فانی میں،

جہاں روزِ محشر سے قبل ہی نفسا نفسی کا عالم طاری ہے۔ اطمینان کا ایک سانس چاہتا ہوں۔ قلب کو وہ کیفِ سرمدی عطا کر جو رنج و راحت، دکھ اور سکھ کو یکساں برداشت کرلے اور شکوہ زبان پر نہ آئے۔ تیری رضا سے اپنی رضا وابستہ کرلوں۔

مجھے دوست دشمن، کسی سے گلہ نہیں۔ ہرچند کہ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے مروتی نے کئی مرتبہ خون کے آنسو رلائے۔ تُو جو لطف و احسان کا سرچشمہ اور انوار و تجلیات کا منبع ہے مجھ سیہ کار کے قلبِ حزیں کو، جو کثرتِ عصیاں سے اپنی درخشانی کھو چکا ہے، لمعاتِ قدسی کے ایک پرتو سے منور کردے۔ تیری ذات میری حدِ نگاہ سے بھی بلند اور اتنی پاکیزہ ہے کہ یہ گنہگار اس کا تصوّر بھی کرنے کا اہل نہیں۔ مگر اے نحن اقرب کہ کر کشتِ امید کو سرسبز کرنے اور مایوس دلوں کو ڈھارس دینے والے، مَیں دیوانہ وار تیری طرف دوڑتا ہوں۔ ناچیز کو دامنِ شفقت میں چھپالے۔ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کرلیتا ہے۔ ریت کا حقیر ذرہ ریگ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ میں بھی ہرچند کہ کون و مکان کی بے پناہ پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہا ہوں، تیری جانب دوڑوں گا۔ اگر سمندر کی لہریں چاند تک پہنچ سکیں گی اگر دیدۂ نرگس کی بے نوری دیدارِ حبیب سے روشن ہوسکے گی اور اگر بلبلِ سینہ چاک کو بہارِ جاوداں کی دائمی مواصلت کبھی نصیب ہوسکے گی تو شاید میں بھی، آہ میں بھی ایک دن اپنی ذات کو جو میری روح کے لئے بوجھل اور روح کو جو میری ذات کے لئے بارِ گراں ہے تجھ میں فنا کر کے مقصدِ حیات پاسکوں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عاشق بٹالوی

زبان خدا کے اسرار کا خزانہ ہے تم اس پر خاموشی کا قفل لگاؤ ــــ لقمان

تمام خزانوں سے بڑا خزانہ ہنر ہے ــــ سقراط

سب سے بڑھ کر آسان بات دوسروں کو صلاح مشورہ دینا ہے ــــ تھیلز

کون تمہیں باندھتا ہے؟ کون تمہیں غلام بناتا ہے؟ تمہاری اپنی خواہش! ــــ سوامی رام تیرتھ

محمد داؤد

ضبطِ نفس

اکثر لوگ "ضبطِ نفس" "شکستِ آرزو" اور "فنائے خودی" کی مصطلحات کے متعلق نہایت مبہم اور غلط خیالات رکھتے ہیں بعض لوگ اور بالخصوص ایسے لوگ جن کی طبائع کا میلان قیاسیات کی طرف ہوتا ہے ضبطِ نفس کے مسئلہ کو کوئی مسئلہ مابعد الطبیعیات سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو زندگی اور اُس کی تمام قوتوں کو معدوم کر کے جمود پیدا کر دینے کی سعی کو ضبطِ نفس کا مرادف سمجھتے ہیں۔ یہ غلط اور پریشان خیالات جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انہی کی ذاتی کوششوں سے دور ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کو سچائی کی تلاش ہو تو اُس کی تمام لاطائل قیاس آرائیاں اس مسئلہ کو اپنی حقیقی شکل و صورت میں پیش کر کے نہایت آسانی سے رفع کی جا سکتی ہیں۔

اپنے نفس پر قابو پانے اور اسے مغلوب کر لینے کا مسئلہ نہایت سادہ ہے۔ اس قدر سادہ اور قابلِ عمل کہ ایک پنج سالہ بچہ جس کے دماغ پر قیاسیات مذہبیات اور فلسفیانہ خیال آرائیوں کے گرد و غبار کا پردہ ابھی نہیں پڑا اُن سن رسیدہ لوگوں سے جن کی لوحِ دل سے پیچیدہ مسائل کے غبار نے تمام سادہ اور خوبصورت سچائیوں کو محو کر دیا ہے زیادہ آسانی سے اس کی کنہ کو پہنچ جاتا ہے۔

خودی کو فنا کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ روح سے اُن تمام عناصر کو خارج کر دیا جائے جو تشتت، جنگ، مصائب، امراض اور آلام کے پیش خیمہ ہیں۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ کسی امن پرور صفتِ حمیدہ کو تباہ کیا جائے، مثلاً جب ایک آدمی کو غیظ و غضب یا غصہ آنے لگے اور وہ کوشش خاص سے اس کو ضبط کرے اور صبر و محبت سے کام لے تو اُس کے اِس عمل کو ضبطِ نفس یا شکستِ خودی سے تعبیر کریں گے۔ ہر شریف آدمی خواہ وہ اس حقیقت سے انکار ہی کیوں نہ کرے اس پر جزوًا عمل کرتا ہے۔ اور جو شخص اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر ایک خود غرضانہ خیال کو مٹا دیتا ہے حتیٰ کہ اس میں صرف الٰہیانہ صفات باقی رہ جاتی ہیں وہ اپنی خودی کو مٹا دیتا ہے اور صداقت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

خودی جو مٹا دینے کے قابل ہے اِن دس بے قیمت اور رنج زا عناصر سے مرکب ہے، شہوت، نفرت، لالچ، حظِ نفس، خود غرضی، تکبر، غرور، شک، بد اعتقادی اور فریب۔ ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ ان دس ذلیل عناصر کو بالکل معدوم کر دیا جائے۔ اس سے انسان میں تربیتِ ذات، عمل اور پاکیزگی، صبر و تحمل، تواضع، ایثار،

خوداعتمادی، بے خوفی، علم، عقل، حلم اور محبت جیسی صفاتِ حمیدہ کے تحفظ کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صداقت انہی دس صفات سے مرکب ہے۔ اور جو شخص ان صفات کے دائرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ صداقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ خود صداقت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اول الذکر دس عناصر کے اجتماع کا نام خودی یا نفس ہے، اس کے برعکس آخر الذکر دس صفات کے مجموعہ کو صداقت کہتے ہیں جو انسان کو بے نفس، دائمی حقیقی اور زندۂ جاوید بنا دیتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ضبطِ نفس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی شریفانہ سچی اور متحملانہ صفت کو تباہ کیا جائے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ غیر شریفانہ جھوٹی اور رذیل خصلت کو معدوم کر دیا جائے۔ یہ بھی غلط ہے کہ انسان ضبطِ نفس سے مسرت، بہجت اور خوشی کھو بیٹھتا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ صفاتِ حمیدہ کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں کو ہمیشہ کے لئے پا لیتا ہے۔ ضبطِ نفس خوشی کی حرص کو ترک کرنے کا نام ہے نہ کہ خوشی ہی کو۔ یہ مسرت کی ہوس کو تباہ کرتا ہے نہ کہ مسرت کے وجود کو۔ یہ محبت طاقت اور اقتدار کی خودغرضانہ تمناؤں کا خاتمہ کرتا ہے۔ نہ کہ محبت طاقت اور اقتدار ہی کا۔ ضبطِ نفس اُن تمام چیزوں کو قائم رکھتا ہے جو بنی آدم کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں اور انہیں رشتۂ اتحاد و مودت میں منسلک کر دیتی ہیں۔ ضبطِ نفس جمود و موت کی پرستش سے ہٹا کر بلند ترین، شریف ترین، موثر ترین اور پائدار عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ شخص جس کے افعال مذکورہ دس رذائل پر مبنی ہوں اپنی قوتوں کو اپنی تخریب پر ضائع کرتا ہے اور اپنی روح کو محفوظ نہیں رکھتا، لیکن وہ شخص جس کے افعال کی محرک ثانی الذکر دس صفات ہوں نہایت دانائی سے صحیح راستہ پر گامزن ہے اور اپنی روح کو برقرار رکھتا ہے۔

ایسا شخص جو مذکورہ بالا دس رذائل کی تنگ دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے تسلیم و رضا کے اصول میں کوئی کشش نہیں پاتا اور تمام روحانی حقائق کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے اور حق کی آوازوں پر پنبہ بگوش ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم و رضا کے معنی یہ ہیں کہ ذات کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ان دس آسمانی صفات کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیتا ہے اس اصول کے حسن و شوکت کو بخوبی دیکھ سکے گا، اور اسے حیاتِ جاوداں کا سرچشمہ قرار دے گا۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جب بنی نوعِ انسان نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا تو صنعت و حرفت، تجارت و حکومت غرضکہ زندگی کا ہر شعبہ برائیوں سے پاک و صاف ہو جائے گا اور عمل، مقصد اور ادراک تباہ ہونے کی بجائے خوب بڑھیں پھولیں گے اور زندگی کی کلفت انگیز کشاکش دور ہو جائے گی۔

شفیع واکبر

معارفِ محبّت

کھو گیا ہوں یہ اِن نظاروں میں | ڈھونڈتا ہوں تجھے بہاروں میں
کچھ نہ سمجھا کہ صبح کو غنچے | ہنس کے کیا کہہ گئے اشاروں میں
دیکھنا ہے کہ فرش کیوں ہیں گل | چھپ کے بیٹھوں کا لالہ زاروں میں
اوس برسا رہی ہے کیوں موتی | کون پھرتا ہے سبزہ زاروں میں
بزم کی بزم بے قرار ہے کیوں | کون بیٹھا ہے بے قراروں میں
کھینچے لیتا ہے دل کو اور کوئی | یا کشش خود ہے اِن ستاروں میں
تیرا ہی گیت گاتی ہے ہر شے | کیا ترنّم ہے آبشاروں میں
جب نظر اَور اُوپر اُٹھتی ہے | دل نہیں لگتا چاند تاروں میں
آنسوؤں میں سفینۂ دل ہے | بہا جاتا ہوں جُوئباروں میں
تیری ممنون ہر خلش دل کی | لطف گلزار کا ہے خاروں میں
تھے اکیلے نہ صبح کے تارے | تُو بھی تھا صبح کے ستاروں میں
صبح ہوتے ہی کلیاں کھلنے لگیں | نہ رہا راز، راز داروں میں
پایا ہر بزم میں تجھے یکتا | تُو مگر ایک ہے ہزاروں میں

بندۂ غیر تو نہیں گویاؔ!
ہوں اگرچہ گناہگاروں میں

گویاؔ جہان آبادی

ایک بالاتر ہستی کے مصائبِ زندگی

یا

سنجیدہ خانم کا روزنامچہ

اے دوست! کیا تو کبھی آئینے میں اپنا منہ دیکھتا ہے؟ میں تو دیکھتی ہوں! اکثر میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی ہوں اور غور سے اپنے چہرے کو اس میں دیکھتی ہوں۔ اور حیرت کرتی ہوں! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اُس کو الٹ دیتی ہوں اور غور سے اس کی پشت کو دیکھنے لگتی ہوں! میں وہ راز معلوم کرنا چاہتی ہوں جس پر بدنصیب آئینے کے وجود کا انحصار ہے! مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرخ سیندوری آنکھ سے میری طرف دیکھتا ہے۔ گویا وہ مجھ سے واقف ہے اور ہم کلام ہونا چاہتا ہے!

صبح سے شام تک میں ہزاروں سوال آئینہ سے کرلیتی ہوں۔ آہ! مگر کوئی جواب نہیں ملتا! ایک دھواں سا، دل میں اٹھتا ہے اور وہیں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں کیوں پیدا ہوئی تھی؟ مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں! ایسا اتفاقاً جب لوگ میرے کمرے کے پاس سے گذرتے ہیں ——— میری نوکرانی نصیرن اور ملازم رحیم ——— اور مجھ کو آئینہ سے بات کرتا دیکھتے ہیں تو مجھ کو دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں! کیا اس میں کوئی حقیقت ہے؟ ہرگز نہیں!

کبھی میں اپنے آپ کو کسی صوفے پر پھینک دیتی ہوں اور اپنے سر کو نرم تکیوں میں ڈال دیتی ہوں! باوجود اتنی کوشش کے مجھ کو اپنی ہستی کا راز معلوم کرنے میں ناکامی ہوتی ہے! میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہے لیکن کیا میں اٹھاسی کی بھی ہو جاؤں گی؟ آہ جس وقت یہ خیال آتا ہے میرے دل میں ایک الجھن اور بےچینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ قدرت کے سربستہ بھیدوں کو معلوم کرنے کے لئے دل کی آنکھ زیادہ متجسس ہو جاتی ہے! آہ کیا میں چھیاسٹھ برس کی بھی ہو سکوں گی ......؟ اکثر میں نے آئینہ سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کبھی میں سوتے سوتے چونک پڑتی ہوں اور بے اختیار پوچھنے لگتی ہوں کہ میں ننانوے برس کی کب ہونگی؟ معبود جانے ......!

+ + + + + + + +

دوسرا دن

آج میں ایک خوشنما پھول کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ساحلِ دریا پر ایک لہراتے ہوئے شاداب

کھیت کے خاموش کنارے پر رقص کر رہا تھا۔ شاید تھک کر اپنی نازک شاخ پر سو گیا تھا۔ کیا میں اس کا نام نہیں جانتی؟ کیا میں گوبھی کے پھول کو کبھی بھول سکتی ہوں؟ نہیں یہ پیارا نام میرے دل میں نقش فی الحجر کی طرح محفوظ ہو گیا ہے۔ میں اِس کے اوپر جھکی اور پوچھا "ننھے خوبصورت پھول کیا میرا دل کبھی محبت کے جذبہ کا بار بردار ہو گا؟" وہ میرا پُرحسرت استفسار سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے ساکت رہا!

واپسی پر مجھے ایک پیاز ملی۔ وہ شاہراہ کے کنارے کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی کسی بے درد نے اُس کی نازک پتیوں کو کچل ڈالا تھا! آہ، پیاز کو کیسا صدمہ پہنچا ہو گا! میں نے اُس سے کہا بدقسمت پیاز! تیرے حسرتناک انجام اور میری پُرالم زندگی کے مصائب میں کچھ مطابقت سی معلوم ہوتی ہے! میری تمام ہمدردی تیرے ساتھ ہے!" میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے اور آہستہ سے اٹھا کر میں نے مرحوم پیاز کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔ اور سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لیا!

+ + + + + + +

پرسوں

میں محبت کرنا چاہتی ہوں مگر کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر میں اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن کسی سے محبت نہ کر سکی۔ میرے ابا جان نے میری منگنی مغموم نواز خاں سے کر دی تھی۔ جو فوج میں رسالدار میجر ہے، مگر میں اس سے محبت نہ کر سکی نہ کر سکتی ہوں۔ آہ! مجھے ان لوگوں نے کیسا مجبور کر دیا ہے! کتنا ستا رکھا ہے! مجھے سانس لینے کی اجازت نہیں ہے اور میں لے بھی نہیں سکتی! بارہا میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے میری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ گزشتہ شب میں نے پھر کوشش کی میں نے اپنے پلنگ کے بالکل قریب میز پر "سہ آتشہ مارالحم" کی ایک بھری ہوئی بوتل رکھ لی۔ مگر وہ کمبخت بھی میرا کام تمام نہ کر سکی! صبح کو جب میں اٹھی تو وہ اسی طرح پڑی تھی اور میں زندہ سلامت موجود تھی!

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

+ + + + + + + گزشتہ پرسوں!

مجھ کو ڈوبنے کی اجازت بھی تو نہیں! کیوں؟ یہ میں نہیں کہہ سکتی! بے سود میں صبا سے پوچھتی ہوں اور درختوں سے کہ کیا مجھ کو غرقاب ہو جانے کی اجازت ہے؟ آہ! وہ ظالم بھی خاموش رہتے ہیں!

تاہم میری انتہائی آرزو آزاد رہنے کی ہے۔ ننھی چڑیوں کی طرح آزاد! ان میں سے سب سے ننھی

کے برابر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !میں خزاں کی پتیوں کو بادِ پریشاں کے جھونکوں پر دیوانہ وار ناچتا دیکھتی ہوں! کاش میں ایک پتا ہی ہوتی!

یہی نہیں۔ میری خوشیوں کو پامال کرنے کے اور بہت طریقے اُن کو آتے ہیں!

آہ! مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ کھاؤ! چنانچہ کل انہوں نے مجھ کو ایک اناناس کھلا دیا جس نے میری تمام آرزوؤں کا ناس کر دیا!! میں اس کا مزہ اور خوشبو تمام عمر نہیں بھول سکتی!

\+ \+ \+ \+ \+ نیا دن!

میرا دل دھڑکتا ہے! آج ایک آدمی میرے پاس سے گزرا! وہ سچ مچ پاس سے گزر گیا! میں نے اپنی کھڑکی سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھیت کے کنارے کنارے جا رہا تھا جہاں میرے خوبصورت گوبھی کے پھول کے پودے لگے ہیں! چلتا ہوا وہ کیسا اچھا معلوم ہوتا تھا! پست قد اور فربہ جسم ہونے کے باعث اس میں میرے پھول کی بہت مشابہت نظر آتی تھی! خوبصورتی میں وہ خوشنما گوبھی کا عکس معلوم ہوتا تھا! اُس کے ہاتھ میں ایک اسٹول تھا اور اُس کی کمر پر ایک میز لٹکی تھی۔ وہ سگار کا دھواں اڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے ایک دخانی انجن سے دھواں اٹھتا ہو! اُس کے اندازِ رفتار میں کیسی دلکشی تھی! کیا میں اس سے محبت کرتی ہوں؟ نہیں کہہ سکتی! ابھی نہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! محبت ایک نازک پودے کی مانند ہوتی ہے! کوئی اس کو بڑھا نہیں سکتا! آہ اُس کے گندمی رنگ کے چہرہ پر دوڑتی ہوئی مسکراہٹ ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے دھان کے کھیت پر بھاگتی ہوئی شہابِ ثاقب کی روشنی! میں نے گلدان سے نکال کر ایک گوبھی کا پھول اُس پر پھینکا۔ آہ مگر وہ اس پر نہ گرا! تب میں نے پیاز کی پتیاں (جن میں مرجھانے کے بعد بھی خوشبو باقی تھی) اُس پر پھینکیں۔ مگر اُن کو ہوا کے ظالم جھونکے اڑا کر لے گئے!

\+ \+ \+ \+ \+ نئی کلی!

میری زندگی کے خشک باغ میں آخر بہار آئی! اُجڑے چمن کو محبت کی شگفتگی نے شاد و آباد کر دیا! آج میں نے اُس کو پھر دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !اس سے بات کی ۔ ۔ ۔ !وہ لہریں مارتے ہوئے دریا کے کنارے اپنے اسٹول پر عالمِ محویت میں بیٹھا تھا۔ اسٹول پر بیٹھا وہ اتنا ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا جتنا اپنی نازک شاخ پر سوتا ہوا میرا پسندیدہ پھول اس کے سامنے میز پر تصویر بنانے کا فریم تھا۔ جس میں وہ پہاڑ کے قدموں پر پڑے ہوئے شاہ بلوط کے خشک سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے ہوئے باربرداری کے ایک ایسے کوہستانی چرندے

کی تصویر بنا رہا تھا جس کے سر سے بے ثباتیٔ دنیا اور گردشِ افلاک کے باعث سینگ اڑ گئے ہوں۔ اُس کے ایک ہاتھ میں مصوّری کا پاپوش برش تھا۔ سامنے کئی قسم کے رنگوں کی کوبرا پالش کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ڈبیاں رکھی تھیں! میں نے اُس سے بات کی! اب تو مجھ کو اُس کا نام بھی معلوم ہوگیا تھا! اُس کا نام...... ! میرا دل دھڑکتا ہے...... ! میں لکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں لکھ سکتی...... ! پھر کسی وقت...... !

اُس کا نام مرزا گاؤزبان بیگ تیموری لنگوی ہے...... ! وہ کالے اور بادامی رنگوں سے کیسی اچھی تصویر بنا رہا تھا...... ! میں دیر تک کھڑی دیکھتی رہی! اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے میں نے اپنے دل میں اس سے یوں کہا "اس تصویر کے بنانے کا کیا راز ہے؟ کیا یہ کشمکشِ وجود کی تصویر ہے جس کو مرقعِ قدرت کی زیبائش کے لئے تصور کی مدد سے بنا رہے ہو؟ موجوداتِ عالم کے رازوں کو جاننے والے مصور! مصورانِ فطرت وغم کے قابل استاد کیا یہ تصویر بہشتِ بریں کے کسی نادر و نفیس جانور کی ہے؟" اُس نے پُر معنی طور پر جواب دیا "نہیں!" میں نے غور سے دیکھا واقعی اُس کا کہنا سچ تھا! میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف پُر اسرار نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہمارا راز رہے گا!"

\+ \+ \+ \+ \+ \+ پرانی کل

ہر صبح میں دریا کے کنارے مرزا گاؤزبان بیگ تیموری لنگوی (کیسا پیارا نام ہے) کے پاس جاتی ہوں! وہ خاموش تصویر بناتا رہتا ہے۔ میں پاس بیٹھی رہتی ہوں اور اس طرح ہم دونوں باتیں کرتے ہیں! میں جو کچھ سوچتی ہوں۔ جو کچھ پڑھتی ہوں۔ جو کچھ جانتی ہوں! جو کچھ محسوس کرتی ہوں یا جو کچھ کھاتی ہوں یا جو کچھ پہنتی ہوں سب حال اُس کو سناتی ہوں۔ وہ بے پروائی کے ساتھ خاموش بیٹھا تصویر بناتا رہتا ہے گویا ہمہ تن گوش ہے اور میری باتیں سن کر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہوگیا ہے!

بعض مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ میری کوئی بات سُن ہی نہیں رہا ہے...... ! ہم روز اسی طرح باتیں کرتے ہیں!

اس طرح تبادلۂ خیالات اور علمی مباحثوں سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے کہ اُس کے سامنے میں ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کل میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ "مولانا روم کی رباعیات میں کوئی خوبی ہے؟" اُس نے جواب دیا "نہیں"! علمی تحقیق، علمی گفتگو اور نئی معلومات سے بھی کیسا فائدہ ہوتا ہے!

\+ \+ \+ \+ \+ \+ دو دن پہلے!

آج گاؤزبان نے مجھ سے نشانی مانگی تھی! میں نے اُس کو خوشی سے اپنے جوتے کا تسمہ نکال کر دے دیا!

ما۔ مگر اُس نے کہا "نہیں!" اور ضد کر کے میرا ہیروں کا بروچ لے گیا! میں اُس کے اس مصلحت آمیز برتاؤ
کا پوشیدہ سبب سمجھ گئی۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس کی نظروں میں میری اتنی ہی وقعت ہے جتنی ایک معمولی
خیال ہستی کی نظروں میں ایک ہیرے کی ......!

+ + + + + + اس سے دو دن پیشتر!

آج صبح اُس نے دوسری نشانی مانگی! میں نے اپنے صندوقچے سے ایک اشرفی لاکر اُس کو دے دی اور
کہا کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دو تاکہ ہم دونوں کے پاس اُس کی یادگار رہ سکے! لیکن گاؤزبان نے کہا "نہیں!"
میں اُس کے خیالات کا مفہوم سمجھ گئی۔ وہ اشرفی کو اس لئے نہ توڑنا چاہتا تھا کہ ہماری محبت ہمیشہ سالم
رہے اور کبھی نہ ٹوٹے! وہ بہت دور اندیش ہے! اب وہ اشرفی کو ہم دونوں کے بدلے اپنے ہی پاس رہنے دے گا!

+ + + + + + آج سے بعد کل سے پہلے!

آج اُس نے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسری اشرفی بھی ہے؟ اُس کی سادہ باتیں مجھے بہت ہی
بھلی معلوم ہوتی ہیں!

+ + + + + + نہ آج نہ کل!

آج میں نے دوسری اشرفی لاکر اُس کو دے دی! اُس کی خواب آلود آنکھیں محبت کی خوشی سے
چمک اٹھیں! اس کے عوض اُس نے مجھ کو تانبے کا ایک منصوری سکہ دیا ہے۔ گویا ہماری محبت سونے کی طرح
پاک ہے اور تانبے کی طرح مضبوط! میں اس کے اعلیٰ جذبات اور وسیع خیالات کی داد دیتی ہوں!

+ + + + + + گزشتہ پرسوں کے دو دن بعد!

مجھ پر خوف طاری ہے کہ میری شادی کا دن قریب آگیا اور مغموم نواز خاں آتا ہوگا! مجھے زیادہ ڈر اس
بات کا ہے کہ کہیں گاؤزبان اس کو مار نہ ڈالے! وہ اس قدر خاموش رہتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں وہ مغموم کا نہ
معلوم کیسا حشر کرے! میں کانپتی ہوں!

+ + + + + آنے والی کل سے ایک دن پہلے!

میں نے گاؤزبان سے مغموم کے متعلق کہہ دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ سرحدی فوج میں افسر ہے۔ اور یہ
کہ اُس سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ پہلے تو گاؤزبان کو اس کا سننا ہی گوارا نہ تھا! اُس کے چہرے کی گھبراہٹ سے
ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو خوف ہے کہ کہیں اُس کو بہت زیادہ غصہ نہ آجائے! چنانچہ اُس نے اپنا سامان سنبھالنا

شروع کردیا۔ تب میں نے اُس کو سمجھایا کہ معموم کے آنے میں ابھی عرصہ ہے! اُس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہونے لگے! اس خیال سے مجھ کو خوشی ہوئی کہ اُس کا غصہ فرو ہوا!

+ + + + + + بالکل نیا دن!

آہ! معموم کے آنے میں صرف پندرہ دن رہ گئے! اب زندگی عبث ہے! رات میں نے اپنا خاتمہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب مجھ کو جینے کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ نایاب شے، محبت، جس کی مجھ کو عرصے سے تلاش تھی مجھ کو مل گئی ہے! میں نے اپنے پلنگ کے پاس بھرے ہوئے کارتوسوں کا ایک ڈبہ رکھ لیا تھا! صبح کو اٹھی تو میں زندہ تھی! وہ بھی میرا کام تمام نہ کر سکے! میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے! اس کے معنی ہیں کہ اب میرا اور گاؤزبان کا خاتمہ ایک ساتھ ہی ہو گا!

+ + + + + + گذشتہ دن سے ایک دن بعد!

آج میں نے گاؤزبان سے کہا ہے ہم دونوں کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ اُس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس نے رائے دی کہ پہلے مجھ کو اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے بعد ازاں وہ میری قبر کا جاروب کش بن کے "بھوک ہڑتال" سے اپنے آپ کو فنا کر دے گا!! مگر مجھ کو پسند نہیں کہ وہ اتنی بڑی قربانی کرے! میں نے اُس کو صلاح دی ہے کہ تم دریا کے کنارے اپنے گلے میں پھانسی ڈال لو۔ میں ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں! وہ اس پر غور کرے گا۔ اگر اُس نے پھانسی نہ ڈالی تو گولی ضرور مارے گا!

+ + + + + + بعد ازاں!

افسوس گاؤزبان ابھی زندہ ہے۔ وہ کہنے لگا کہ "میں رسی خریدنا بھول گیا" بیچارے نے کئی بار اپنے دل میں گولی ماری۔ مگر ہر بار نشانہ خطا گیا اور گولی سر میں لگی! اور اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا!

+ + + + + + قبل ازاں!

گاؤزبان اور میں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے! اس بارے میں ہماری تمام خودکشی کی کوششیں رائگان گئیں اب ہم معموم کے آنے سے ایک دن پہلے کہیں باہر چلے جائیں گے! جب وہ آئے گا تو ہم کو نہ پائے گا . . . . . ! میں اپنے پیارے گوبھی کے پھولوں اور باغ کی چڑیوں درختوں، پتوں اور مکھیوں کو خدا حافظ کہہ دوں گی!

+ + + + + + قیامت خیز شام!

کس دل سے میں ان واقعات کی تفصیل بیان کروں جن کو میں قلمبند کر رہی ہوں! آہ میرے قلم کی نب کانپتی

ہے! جس بات کا سخت خطرہ تھا آخر وہی ہوئی! اب میں زندہ رہ کر کیا کروں! آہ! پروردگار! کیسا خوفناک بیان ہے! میں اور گاؤزبان کھڑے تھے۔ میں اُس کو اپنے زیورات کا صندوقچہ دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی محبت اور زندگی بھی ساتھ ہی میں معغوم کو آتے دیکھا! وہ اپنے فوجی لباس میں کیسا شاندار معلوم ہورہا تھا! بجلی کی طرح یہ خیال میرے دل میں کوندگیا کہ دنیا کیسی بے ثبات ہے اور ناپائیدار! اگر گاؤزبان نے معغوم کو قتل کردیا تو ابھی ذرا دیر میں اُس کا خون آلود جسم فرشِ خاک پر ایک بے جان چیز کی مانند خاموش اور بے حس وحرکت پڑا ہوگا! میں چلائی "گاؤزبان بھاگو۔ اگر تم ذرا دیر اور ٹھہرے تو ضرور تم اُس کو قتل کرڈالوگے!"

گاؤزبان نے معغوم کو آتا ہوا دیکھا۔ اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا! میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے وہ بھاگا! جب وہ بھاگ رہا تھا تو کیسا مجمع اور رفیع الخیال معلوم ہورہا تھا! صد آفرین ہے تجھ کو اے بہادر دل والے انسان! تو نے ایک ہم جنس کی زندگی کو بچانے کے لئے غصہ کی مطلق پروانہ کی اور اس طرح اپنے جذبات کی بڑی قربانی کردکھائی۔ ...... ! مگر معغوم نے دوڑ کر اُس کو پکڑ لیا! گاؤزبان بہادری کے ساتھ لڑنے لگا۔ آہ! جب دو مرد آپس میں لڑتے ہیں تو کیسا ہیبت ناک نظارہ ہوتا ہے! معغوم نے ذرا دیر میں گاؤزبان کو اوپر اٹھا لیا اور کوٹ سے پکڑ کر اپنے گرد کئی دفعہ گھمایا۔ یہاں تک کہ کوٹ پھٹ گیا اور گاؤزبان ایک دھماکے کے ساتھ گھاس میں جاگرا! اُس کے گرنے کی آواز میں وہی نغمہ تھا جو کسی آبشار کے پتھروں پر گرنے سے پیدا ہوتا ہے!

پھر معغوم نے اپنے فوجی بوٹ سے اُس کی کمر کو اس طرح چھوا جیسے کوئی شریر لڑکا مظلوم فٹ بال کو تنگ کرتا ہے! پھر اُس نے تصویر کے تختہ کو اٹھا کر اُس کے سر پر پٹکا! تختہ چیخ جانے کے باعث اُس کے گلے میں ہار کی طرح آویزاں ہوگیا! آہ! اس وقت گاؤزبان کیسا بہادر معلوم ہورہا تھا! اُس کے گلے میں تختہ لٹکا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہادر راجپوت سورما کے گلے میں ڈھال! تب معغوم نے اُٹھا کر اُس کو دریا میں پھینک دیا! میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی پر تیرنے لگا! وہ نظارہ میں کبھی نہ بھولوں گی۔ .... !

+ + + + + + چھ مہینے بعد

میری شادی معغوم سے ہوگئی ہے اور اُس نے دہلی میں میرے لئے ایک عالیشان کوٹھی خرید لی ہے!

اب وہ کمانڈران چیف کا اے ڈی کانگ مقرر ہوگیا ہے۔ ہاں جس وقت گاؤزبان کنول کے پھول کی طرح

سطح آب پر تیر رہا تھا اُس وقت معلوم ہوٹل جاکر اُس کے کمرے سے میرا تمام وہ سامان واپس لے آیا تھا جو سفر کے خیال سے میں نے وہاں بھجوایا تھا۔ اب بھی میں سوچتی ہوں تو مجھ کو خیال آتا ہے کہ گاؤ زبان گومتی میں بہتا ہوا جمنا میں جا ملا ہوگا! اور جمنا سے نکل کر گنگا میں پہنچا ہوگا! آخر بہتا بہتا طویل سفر کے بعد خلیج بنگال میں جا ملا ہوگا!

"کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا"

پاس سے گذرنے والے جہازوں کے مسافر اگر غور سے دیکھتے ہونگے تو اس میں اب بھی گوبھی کے پھول کی خوبصورتی کا تمام عکس موجود پاتے ہونگے!!

شاہد حسین بی، اے

ایک کشمیری گیت

ہائے میرا محبوب میری شاخِ حیات میں محبت کی آگ لگا کر چپکے سے چلا گیا۔

میری قسمت کا ستارہ اس وقت بلند ہوگا جب میرا محبوب میرے صحن میں آجائے گا۔

میرا محبوب چلا گیا۔ میں اُسے کہاں تلاش کروں۔ اے سکھی اس کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ جب میرے باغِ جوانی میں بسنت کے دن آئیں گے تو اس کی بہار کون لوٹے گا؟

ہائے وہ جوانی پھر نہ آئے گی جو تیر کی طرح نکلی جارہی ہے۔

اس کا جینا کس کام کا جس کے ساتھ اس کا محبوب نہ ہو۔ وہ ہاتھ مل کر پچھتائے گا کہ ہائے تیر کی طرح میرا جوبن نکل چلا۔

جو مر گئے وہ اس دنیا کی تمام مصیبتوں سے چھوٹ گئے مٹی کے ساتھ مٹی مل جائیگی۔ ہائے جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

اس جوانی پر غرور نہ کرو یہ زمانہ سوچنے کا ہے۔ یہاں سے جانا ہے یہ سوچ کر تیار رہو جوبن تیر کی طرح نکل گیا۔

مندرجہ بالا گیت جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے کشمیر میں بہت مشہور ہے۔ کشتیوں پر ملاح، کھیتوں اور کھلیانوں میں کسان اور بوجھ ڈھونے والے مزدور اس گیت کو خوب جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔

اعظم کریوی

تجلّیات

قدر آموزِ وفا خونِ شہیداں ہوگا ہم نہ ہونگے نہ سہی تُو تو پشیماں ہوگا

ہر نظر پردہ بر انداز ہے چھپنے والے تو کہاں جا کے نظر والوں سی پنہاں ہوگا

چارہ فرمائی عبث، فکرِ سکوں بے حاصل درد ہی بڑھ کے ہمارے لئے درماں ہوگا

موت آئی نہیں اور یاد تری بھول چلی کون اب حالِ دلِ زار کا پُرساں ہوگا

پھر بہار آئی کھِلے پھُول چلی بادِ مراد مژدہ پھر تا بہ جگر چاک گریباں ہوگا

اے جنوں ہوش سی آزاد کیا خوب کیا اب غمِ جیب نہ اندیشۂ داماں ہوگا

یوں ہوا اک قطرۂ خوں شورشِ محشر بہ کنار! دل جسے کہتے ہیں وہ آپ کا ارماں ہوگا

یوں تو دنیا میں ہزاروں ترے دیوانے ہیں
کہیں مجھ سا بھی کوئی بے سروساماں ہوگا

نُورجہاں بیگم نازؔ

بچے اور بوڑھے

ہر شب سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے۔ وہ سب ایک کمرے میں ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے ننھے دماغوں میں آتا بکا کرتے۔ اور دھندلی کھڑکی میں شام کی نیرگی خواب آلود آنکھوں سے انہیں جھانکتی رہتی۔

ہر کونے سے خاموش سائے اپنے ساتھ عجیب و غریب حکایات اور کہانیاں لئے ہوئے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آتے۔

اُن کے دماغ میں جو کچھ آتا کہہ ڈالتے، لیکن اُن کے دماغ میں صرف بہار اور روشنی کی محبت اور امید افزا داستانیں ہی آتی تھیں۔ سارا مستقبل اُن کے لئے ایک مسرت ناک تعطیل کا روشن دن ہوتا تھا۔ الفاظ زبان سے نکلتے تھے ــــ نہایت آہستہ ــــ سرگوشیوں کے لباس میں مستور، اور صرف نصف سمجھ میں آتے تھے اُن کے قصوں کی نہ ابتدا ہوتی تھی نہ انتہا، اور نہ اُن میں تسلسل ہوتا تھا۔ بعض اوقات چاروں بچے ایک ساتھ بول اُٹھتے، لیکن ایک کی وجہ سے دوسرا گھبراتا نہ تھا۔

بچے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ دھندلی سی چاندنی میں، سب سے چھوٹے چار سالہ تان شیک اور سب سے بڑے دس سالہ لوئی کا کی شکلوں میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

اس شام کو ایک ایسی خبر جسے وہ نہ سمجھ سکتے تھے ایک ایسے مقام سے جسے وہ نہ جانتے تھے اس فردوسی فضا میں پہنچی اور اُس نے کہانیوں اور لطیفوں کا خاتمہ کر دیا۔ ڈاک سے انہیں یہ خبر ملی تھی کہ اُن کا باپ سرزمینِ اطالیہ میں چل بسا۔

"لیکن وہ کب واپس آئیں گے؟" تان شیک نے تعجب سے پوچھا۔

لوئی کا نے اُسے کہنی مارتے ہوئے مغموم لہجہ میں جواب دیا: "وہ کس طرح واپس آسکتے ہیں جب کہ وہ خدا کے ہاں چلے گئے"!

یہ سُن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے

اور اُس کے آگے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔
"میں بھی جنگ پر جا رہا ہوں"۔ میٹی چی نے بلا غور و خوض زور سے چلا کر کہا۔
"تم ابھی بہت چھوٹے ہو"۔ تان شیک نصیحتاً بولا۔
سب سے زیادہ لاغر، نازک اندام اور نحیف ملکا نے، جو اپنی ماں کے بڑے دوشالے میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک مسافر کی گٹھری معلوم ہوتی تھی، اپنے نرم اور دھیمے لہجہ میں کسی پوشیدہ مقام سے پوچھا "جنگ کیسی ہوتی ہے، مجھے بھی بتاؤ میٹی چی"۔
میٹی چی نے مطلب یوں سمجھایا "سنو جنگ اس طرح کی ہوتی ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے پر چاقو سے حملے کرتے ہیں، تلواروں سے قتل کرتے ہیں اور بندوقوں سے مارتے ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی مارے اور قتل کرے اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے ——— یہی جنگ ہے"۔
"لیکن وہ لوگ کیوں قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہیں؟" ملکا نے پوچھا۔
"شہنشاہ کے لئے"۔ میٹی چی نے کہا۔ اور سب چپ ہو گئے۔
پھر فوراً ہی میٹی چی نے اپنے خیالات یکجا کئے۔ تاکہ اُس خاموشی کو دور کر دے جو اس وقت ان پر بار گذر رہی تھی۔
"میں بھی دشمن کے خلاف لڑائی پر جا رہا ہوں"۔
"دشمن کیسا ہوتا ہے؟ کیا اُس کے سینگ ہوتے ہیں؟" ملکا کی کمزور آواز نے فوراً سوال کیا۔
"درحقیقت اُس کے سینگ ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر وہ دشمن کیسے ہو سکتا؟" تان شیک نے متانت اور کسی قدر غصہ سے جواب دیا۔ اور اب خود میٹی چی بھی صحیح جواب نہ جانتا تھا۔
"میں نہیں سمجھتا ——— کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں۔!" اُس نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا۔
"اُس کے سینگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ ہماری طرح ایک انسان ہے"، لوئی کا نے کہا۔
"مگر صرف یہ بات ہے کہ اس میں روح نہیں ہوتی"۔
"چند لمحوں کے بعد تان شیک نے پوچھا "لیکن جنگ میں آدمی خدا کے ہاں کیسے چلا جاتا ہے؟"
"لوگ اُسے جان سے مار ڈالتے ہیں"، میٹی چی نے جواب دیا،
"ابا جان نے میرے لئے ایک بندوق لانے کا وعدہ کیا تھا"۔ تان شیک غمگین لہجہ میں بولا۔

"وہ بندوق کیسے لا سکتے ہیں، جب کہ خدا کے ہاں چلے گئے" لوئی کا نے کسی قدر سختی سے پوچھا
"اور لوگوں نے انہیں جان سے مار ڈالا؟" تان شیک نے سوال کیا۔
"ہاں جان سے!" لوئی کا نے جواب دیا۔
معصومیت اور بچپن سے آلودہ اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں میں سے سکوت اور غم تاریکی میں گھورنے لگا ـــــ کسی نامعلوم فضا میں ـــــ دماغ اور دل میں محسوس نہ ہونے والی فضا میں۔

اس وقت جھونپڑے سے باہر ایک بنچ پر اُن کی دادی اور دادا بیٹھے تھے۔ آفتاب کی آخری سرخ اور سنہری شعاعیں گھنے درختوں میں سے گذر کر باغ میں آرہی تھیں۔ شام نہایت پُرسکون تھی، مگر ایک مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً یہ بچّوں کی جوان ماں کے گریہ و بکا کی آواز تھی۔ دونوں بوڑھی جانیں کمرخمیدہ ایک دوسرے سے ملی بیٹھی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے جیسے عرصۂ دراز کے بعد یہ موقع ملا ہو۔ وہ دونوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے محروم تھیں اور وہ کچھ نہ بول سکتے تھے۔

محشر عابدی

غم خوشی کے نقشِ قدم پر دبے پاؤں چلتا ہے۔
خیال عمل کی روح ہے۔
قسمت ممکنات پر ہنستی ہے۔
انسان فانی ہے مگر غم ابدی۔
بہترین استاد وقت ہے، بہترین کتاب دنیا۔
نیکی کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اُسے صحیح طریق پر کرنا چاہئے
چالاک آدمی اچھے ہوتے ہیں مگر بہترین نہیں ہوتے۔
ہر پہلو میں ایک ہی دل ہے۔

(ماخوذ) نسیم رضوانی

غزلیات

۱

بہارِ گلشنِ ہستی کا اعتبار نہیں ۔۔۔ خزاں نہیں ہے اگر آجکل بہار نہیں

ملے ہیں سب کی نشانی ہیں داغِ ناکامی ۔۔۔ وہ کونسی ہے تمنا جو یادگار نہیں

بتا گئی نگہِ واپسیں یہ رازِ فراق ۔۔۔ وہ آنکھ ہائے جوابِ محوِ انتظار نہیں

عدم سے واں مجھے لائی ہوائے آزادی ۔۔۔ جہاں کہ اپنی طبیعت پہ اختیار نہیں

ہوا نے دوش پہ رکھی ہے خاکِ تربتِ شہیدِ عشق کا لاشہ زمین پہ بار نہیں

وفا کا عہد وہ کرتے ہیں مجھ سے میں چپ ہوں

نگاہِ یاس نہ کہدے کہ اعتبار نہیں

علی حسنین نیّر بیاردولوی

۲

جان و دل ہم نثار کرتے ہیں ۔۔۔ اس طرح اُن کو پیار کرتے ہیں

اُن سے امید ہے وفائی ہیں ۔۔۔ دل جو ہے کر فگار کرتے ہیں

تیرِ طعنوں کے یہ رقیب آخر ۔۔۔ کیوں مرے دل کے پار کرتے ہیں

آبلے دیکھ اپنے وحشی کے ۔۔۔ یہ خزاں کو بہار کرتے ہیں

کر کے وعدہ بھی یہ جواب آیا

آپ کیوں انتظار کرتے ہیں

اندرجیت شرما

۳

مدعی ہے کہ عاشقی میری ۔۔۔ دشمنی ہے کہ دوستی میری

میں اڑاتا تھا چٹکیوں میں جنہیں ۔۔۔ اب اڑاتے ہیں وہ ہنسی میری

جی سے جانا ہی ہوش میں آنا ۔۔۔ مجھ سے کہتی ہے بیخودی میری

غش بھی آتا نہیں خبر لینے ۔۔۔ کتنی بےکس ہے بےکسی میری

قصۂ غم دراز ہے میرا ۔۔۔ اور کوتاہ زندگی میری

بن گئے وہ عدو کی روحِ رواں ۔۔۔ موت ہے اب تو زندگی میری

کون ان کو منا کے لے آئے ۔۔۔ مجھ سے روٹھی ہے زندگی میری

بھول کر آ گئے ہو تربت پر ۔۔۔ دیکھتے جاؤ بےکسی میری

دن کو نالے ہیں رات کو آہیں ۔۔۔ یوں ہی کٹتی ہے زندگی میری

خاک سمجھے گا مدعی شائق

اک معمّا ہے شاعری میری

سید محمد کاظم علی شائق

۴

کسی صورت مجھے قرار نہیں ۔۔۔ طاقتِ دردِ انتظار نہیں

کون سی چیز ہے جو دنیا میں ۔۔۔ مستِ صہبائے حسنِ یار نہیں

طور پر حسن کی جھلک سی ہے ۔۔۔ برقِ مضطر نہیں شرار نہیں

کہہ رہی ہے خزاں کی پامالی ۔۔۔ رنگِ ہستی کا اعتبار نہیں

جب شگفتہ نہ ہو کلی دل کی ۔۔۔ لطفِ رعنائیِ بہار نہیں

ہائے دشتِ جنوں کی ویرانی ۔۔۔ آبلہ پا ہوں اور خار نہیں

دعوئ عشق ہے غلط تنہا

دل اگر رشکِ لالہ زار نہیں

محی الدین تنہا

محفلِ ادب

ادیب آقا ہے یا غلام؟

جب یونانیوں کی آزادی چھن گئی اور رومی اُن پر حکمران ہوگئے تو ادب آقائی کے درجہ سے گر کر غلامی کے درجے پر آگیا۔ یونانی ادبا فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اس کی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کی طرف لے جانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤ گے جو دل سے چاہتا ہے کہ اُن کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں با نظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو بھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤ گے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دھوکے میں رکھے اور اُن کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے۔

بہرحال جب رومی یونانیوں پر غالب آگئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خریدنے اور اپنی اولاد کو اُن کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہلِ ادب غلام ہو کر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے۔ لیکن اسی طرح جیسے ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جس طرح ہم اُس قلی کی رائے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہم کو ریل پر سوار کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کہتا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا و برتر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اُس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونے کے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر ازمنۂ وسطیٰ کا دور آیا جس میں عرب اور اہلِ فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کے خود مختار نظامِ حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یک رنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہوگئے اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں

کی خوشامد میں آقائی رتبے سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ ازیں اس دور میں ادب اَور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتی، دوسری ضروریاتِ زندگی کو۔

ادب کا جو حصہ ضروریاتِ زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقائی کے اُس بلند مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا جو قدیم یونانی اہلِ قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اُس درجے میں اتر آیا جس میں یونانی ادیب غلام ہو کر اتر آتے تھے۔

بنی عباس کے زمانے میں جس طرح بغداد میں تم کو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملے گی جس نے ادب حاصل کر کے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کر دی اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہر امیر کے پاس ایک شاعر کو اُس کی مدح سرائی میں رطب اللساں پاؤ گے۔ غرض کہ ازمنۂ وسطیٰ میں مشرق اور مغرب کے تمام اہلِ ادب اسی رنگ پر جا رہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ اُن کی سب سے بڑی مہم اور اُن کا سب سے اہم فرض دولت مندوں اور آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ ادب امرا کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہوگیا اور اہلِ ادب کو امرا کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گو اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھایا جو مجلسوں میں لوگوں کا دل بہلانے اور ہنسانے کے لئے بھروپیے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد ازاں یورپ کی بیداری اور ترقی کا دور آیا اور اُس نے قدیم ادب کے ناخداؤں کو زندہ کرنا اور دامانِ ادب کو غلامی کے گرد و غبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقائی کا رنگ جھلکنے لگا اس دور کا انشا پرداز تم کو ہنسانے کے لئے تمہارے سامنے نرچوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تم کو خوش کرنے کے واسطے بھانڈپن دکھا سکتا ہے بلکہ وہ تم کو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تم کو بسا اوقات دردمند بنا دیتا ہے اور تم اسی دردمندی میں لذت اور مزا محسوس کرتے ہو کیونکہ تم کو اس طرح دردمند بنانے سے انشا پرداز کا مقصد محض تمہیں صاحبِ بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے تمہارے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنے کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

مگر ہم میں اب تک اہلِ قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے، جس کی ساری ہمت شوخی نقالی اور گرانڈیل الفاظ تک محدود ہے۔ میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرعوب کر دینے والی صنعتِ ترصیع کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا

کٹورا سادہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ایک حسین وجمیل ہستی لباس سے عریاں اور برہنہ ہو کر ہی زیادہ جاذب نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے اور ریشمی کپڑا نقش ونگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہو سکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین وجمیل معلوم ہوتی ہوں۔ چونکہ کوئی سادہ چیز اُس وقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جب تک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کر سکتا اس لئے ہم کو کبھی کبھی لفظی نقش ونگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشا پرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہو جائے۔ اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہ جائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کرلے۔ میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے آپ کو آقائی کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اس کو مدنظر رہے۔ مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کر سکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے۔ اور وسعتِ نظر اسی انشا پرداز کو نصیب ہو سکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر و مستقبل، اس کے رسم ورواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصے کہانیوں، اس کے علوم وآداب اور اس کی تہذیب و تمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے۔

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہو کر آقاؤں کا ادب ہو جائے۔

(سلامہ موسیٰ مصری) "ادبی دنیا"

کیفیات

کوئی نہیں پچھتانے والا	مرجائے مرجانے والا
محفل میں بیٹھے گا کیوں کر	خلوت میں شرمانے والا
میں روکوں لیکن کیا روکوں	جائے گا گھر جانے والا
صبر مرا بیکار نہ جائے	تڑپے وہ تڑپانے والا
اپنا دل بہلاؤں کس سے	ہے کون آنے جانے والا

وہ نہ ملیں مجھ کو مل جائے	کوئی جی بہلانے والا
ہم نہ کریں گے ترکِ محبت	سمجھا کیا سمجھانے والا
دل وہ شے ہے جس کا شاکی	کھونے والا پانے والا
سب سے مشکل بات یہی ہے	زندہ ہو مر جانے والا
کیا سمجھے اسرارِ محبت	دل دے کر پچتانے والا
جان مری ہے جانے والی	دل ہے اُن پر آنے والا
پھولوں کا مرجھانا، دیکھے	کلیوں پر اترانے والا
کب سنتا ہے میری آہیں	باتوں سے گھبرانے والا
یا میں ہوں یا میرا دل ہے	روز نیا غم پانے والا

نوح مرا کافی یہ پند ہے
وہ طوفان اٹھانے والا

"چمن"

گرمی

کالے کالے بھونرے پھر کنول کے پتوں کے نیچے سے جھانک کر دیکھنے لگے! اور سبز طوطوں کی سرخ چونچوں میں پکے پکے شہتوت نظر آرہے ہیں +

اونچے اونچے پہاڑوں پر اب وہ سبزی نظر نہیں آتی۔ بادامی رنگت کی گھاس اُگی ہوئی ہے۔ جنگلوں کے رسیلے پھولوں پر شہد کی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بکریاں پہاڑوں کے دامن میں سوکھی گھاس چباتی نظر آتی ہے +

گرمی کے دن آگئے! ـــــ وہ دن جو شاعر کے خواب کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں اور مشک کی طرح گرم ہوتے ہیں +

او معبود! معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنیاں پیدا ہونے کے دن ہیں! کہ ہر طرف اک محبوب نور برس رہا ہے!

جیسے درِ فردوس پر برس رہا ہو ✦

گہرے نیلے آسمانوں سے اک روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے ۔ جو سمندر، پہاڑ اور پوری زمین کو چمکا رہی ہے ✦

گرمی کے دن آگئے!

پھر آفتاب بلند ہو ہو کے چمکے گا ۔ پھر جنگلوں میں خرگوش خوش ہو ہو کے ناچیں گے!

دوست! دیکھو ۔ گرمیوں کے شفاف آسمان پر ستارہ کیسا جگمگا رہا ہے جیسے کم سن ہرن کی آنکھ میں روشنی کانپ رہی ہو ۔

خوبصورت پرندوں کے پروں پر آفتاب کی تیز کرنیں کیسی پھسل رہی ہیں! جیسے ہلکی ہلکی برف پہاڑوں پر سے پھسل رہی ہو ۔

گرمی کے دن آگئے ✦

ہر طرف اک نور کا دریا لہریں مار رہا ہے ✦

"تہذیب نسواں"

سمندر کی آخری تان

شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں نا آشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں ہنس بول کر جیتے اور زندگی کو سازِ عشرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حرماں، ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے شیریں بن گئے ہیں ۔ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رو رو کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آنکہ موت بے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے، ہوا کی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز روح پر ٹوٹ جائے" (شبلی)

"مجلۂ عثمانیہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اسلام ۔ یہ کتاب عہدِ حاضر کے مشہور ادیب اور مورخ علامہ محی الدین خیاط مصری کی مستند اور جامع تاریخ اسلام کا اردو ترجمہ ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فلسفۂ تاریخ کی ماہیت، تاریخ کے مآخذ اور رسولِ کریم صلعم کے سوانح درج ہیں۔ دوسرے حصے میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں تیسرا حصہ خلافت بنی امیہ کے حالات میں ہے، چوتھا حصہ خلافتِ بنی عباس اور پانچواں تاریخِ اندلس پر مشتمل ہے۔ ترجمہ مولانا مولوی ابو المحمود محمد حامد خاں صاحب فاضلِ ادبیات نے کیا ہے۔ زبان ایسی سلیس اور عام فہم ہے، کہ عورتیں اور بچے بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اصل کتاب قریب قریب تمام ممالکِ اسلامیہ میں بطورِ نصابِ تاریخ رائج ہے، اور یہ اُس کے مستند اور مفید ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ہر حصہ میں ضروری نقشے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ قیمت مع محصول پانچ روپے مقرر ہے۔ مدارس اسلامیہ اگر بطورِ نصاب رائج کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

اربابِ نثرِ اُردو ۔ ازمولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، قابل مولف نے اسے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ سوا سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ چند ادبا کو اکٹھا کر کے ان سے انگریز اہلکاروں کے لئے آسان زبان میں درسی کتابیں لکھوائی جائیں چنانچہ نثرِ اردو کے یہ ارباب ملک کے مختلف حصوں سے یہاں جمع ہوئے اور انہوں نے قصص، تاریخ، قواعدِ زبان، اخلاق اور مذہب پر ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ اردو نثر کی بنیاد قائم ہوگئی۔ اس تذکرہ میں تقریباً بیس ایسے اربابِ نثر کے حالات اور اُن کے کارناموں کی تنقید درج ہے اور ہمارے خیال میں تاریخ ادبیات اردو کا یہ ایک اہم باب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب بہت اچھی ہے۔ حجم ۳۰۰ صفحات مجلد کی قیمت دو روپے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امدادِ باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے۔

چمنستان ۔ اس نام کا ایک نیا مصور ادبی رسالہ ماہِ اگست سے مولوی محمد افضل خاں صاحب اور سید ظفر ہاشمی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں نظم و نثر کے نہایت شستہ نمونے جمع کئے گئے ہیں، ایک سہ رنگی اور ایک یک رنگ تصویر بھی رسالہ کی زینت ہے، حجم ۴۲ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔ بینجر "چمنستان" امرت سر سے منگایئے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر — بشیر احمد۔ بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر { حامد علی خاں۔ بی، اے
منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۶ — نمبر ۵

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء

تصویر:- داستان گو

رباعیات

(۱)

ہم وہ ہیں کہ خامشی سخن ہے ہم ہیں
خلوت ہی ہماری انجمن ہے ہم ہیں
دنیا سے الگ ہے اپنی دنیائے خیال
ویرانہ ہی ویرانہ وطن ہے ہم ہیں

(۲)

ہاں وحشت ہے کوئی نہ کوئی آبادی
ہر بند سے ہے کوئی نہ کوئی آزادی
پا لیتی ہے داد حق سے جس کی فریاد
ہر جینے میں ہے کوئی نہ کوئی فریادی

(۳)

جب کچھ بھی یہاں ہو تو کچھ ہے موجود
جب کچھ بھی نہیں ہے تو کہاں ہیں معبود
انسان کی روح میں ہے ایک ایک جگہ
کیا کچھ نہیں سب کچھ ہے یہ سب میں مقصود

(۴)

گردش میں ہیں سب جو تو وہ سیارہ بن
اپنے ہی فلک سے ٹوٹ اور تارہ بن
یہ وہ ہے جگہ جس میں کچھ آرام نہیں
منزل پہ پہنچنا ہے تو آوارہ بن

ل ب

جہاں نما

شتاقوا

امریکا کے تعلیمی طریقوں میں ہمیشہ یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو تقویت پہنچائیں اور سب لوگ اس سے مستفید ہوسکیں - ایشیا اور یورپ کے بالمقابل امریکا کو جمہوریت کی نمایاں فوقیت حاصل ہے - یہاں ہندوستان میں ہم جمہوریت کے اُس عظیم الشان کارخانے کا تصوّر بھی اپنے دماغوں میں نہیں لاسکتے جس کے ماتحت مدرسوں کے اُستاد اور ریاست کے عہدہ دار بھی عوام کی رائے سے منتخب ہوتے ہیں - مگر امریکا میں عام انتخاب کا دستور جاری ہونے سے پہلے ہی تعلیم عام ہوچکی تھی - حکومتِ ہند ملک کی تعلیم پر کل ۸۰ لاکھ روپیہ خرچ کرتی ہے لیکن امریکا میں صرف ایک یونیورسٹی پر ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے -

بہت دیر تک امریکا کے تعلیمی طریقے بھی انگریزی امارت کی روایات سے متاثر رہے لیکن امریکا نئے نئے آئین وضوابط کی سرزمین ہے اور وہاں کی جدید جامعات نئی ذہنیت کی پیداوار اور ملک کے جمہوری آئین، روایات اور عادات کا نتیجہ ہیں -

امریکا میں صرف مدرسے اور کالج ہی ایسے ادارات نہیں ہیں جو لوگوں کی تہذیب و تربیت کا کام کر رہے ہیں، بلکہ بیسیوں اَور ایسے طریقے ہیں جن سے امریکا عام تعلیم اور مدنی علم کو اپنے کروڑوں فرزندوں کے لئے پھیلا رہا ہے - ان تمام طریقوں میں شتاقوا غالباً سب سے حیرت انگیز ہے -

آج سے نصف صدی پہلے شتاقوا محض نیویارک کی ایک جھیل کا نام تھا - لیکن آج یہ لفظ اُس زبردست ترین مدنی طاقت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ سے دیہاتی اور قصباتی آبادی کو دنیا کی موجودہ عظیم الشان دماغی ترقیات سے روشناس کرایا جاتا ہے -

نصف صدی گزر چکی ہے کہ امریکہ کے بعض بڑے بڑے معلموں اور شہریوں نے جھیل شتاقوا کے پُرفضا کناروں پر گرمیاں گزارنے کے لئے اپنے خیمے گاڑے - تقریروں، انصابوں اور مختلف قسم کی دلچسپیوں کا انتظام کیا گیا، اور بڑی عمر کے آدمی اور کاروباری لوگ جو اوائلِ عمر میں کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئے تھے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے - تقریریں ہر مضمون کے متعلق ہوتی تھیں اور طالبِ علم کو علم کے جس کسی شعبہ سے دلچسپی

ہوتی وہ اس کا مطالعہ کرسکتا تھا۔ معلمین کا طرزِ بیان نہایت آسان ہوتا تھا اور کتابیں ان تقریروں کا نہایت موزوں و مناسب ضمیمہ ہوتی تھیں۔ رات کو ناچ راگ اور دوسرے کھیل تماشے ہوتے تھے اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق ان میں حصہ لے سکتا تھا۔ بعد میں اسی جھیل کا نام جس کے بلوریں پانیوں کے کنارے یہ لوگ آ جمع ہوئے تھے اس نئی عضویت کو دے دیا گیا۔

امریکن، ہندوستانیوں کے برعکس نئے خیالات کو قبول کرنے میں ہمیشہ تیار رہے ہیں۔ ہر نئی بات انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے چنانچہ شتاقوا کا طریقۂ تعلیم تمام جمہوریہ میں نہایت سرعت سے پھیلا۔ آج جس قصبے اور جس گاؤں میں جاؤ شتاقوا کی روشنی ہزاروں گھروں کو منور کرتی نظر آتی ہے۔

موجودہ شتاقوا ایک مختلف چیز ہے۔ اس نے اب کتابی اور انفرادی تعلیم کی منزل سے گزر کر ایک سالانہ قومی میلے کے خطبات، راگ اور ناٹک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ڈاکٹر سدھندرا بوس اس کے موجودہ مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں:-

"شتاقوا کا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا مقصد قلب کو وسیع کرنا ہے اور اس لئے اس میں اسفار، ادبیات اور سائنس پر خطبات پڑھے جاتے ہیں۔ پھر زندگی کے لطیف رخ کو بھی اس وقت تک نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جب تک دنیا میں موسیقی، شاعری اور آرٹ کا وجود ہے۔ ہر شخص کے لئے یہاں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مذہب، تعلیم، تفریح ان تینوں کا نام شتاقوا ہے۔ لوگ روزانہ زندگی کے بار اور فرائض یک قلم اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور شتاقوا میں آ شامل ہوتے ہیں ـــــــ تفکّر و تدبر کے لئے، سیر اور نظارے کے لئے، تفریح و تبسم کے لئے اور اس طرح وہ اپنے قلب اور جسم کو سکون دینے اور تازہ دم ہونے کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں۔"

جدید شتاقوا کے جلسے مسلسل دس روز تک جاری رہتے ہیں صبح سیاسی، مذہبی اور ادبی موضوعات کی تقاریر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ بچے کھیلتے ہیں تیسرے پہر موسیقی شروع ہوتی ہے اور تمدنی اور بین الاقوامی مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ شیکسپیر کے کھیل، رقص اور دوسری تفریحات رات کے پروگرام میں شامل ہوتی ہیں۔

لیکن امریکا کے رہبرانِ تعلیم نے محسوس کیا ہے کہ صرف ایک یا دو بڑے بڑے مقامات پر ایسی تقریریں اور نمائشیں کافی نہیں ہیں کیونکہ اس طرح جمہور کا ایک نہایت قلیل تناسب ان میں حصہ لے سکتا ہے۔

سو انہوں نے شتاقوا کو ایک قومی تہوار بنا لیا ہے اور شتاقوا کے ہفتے کے دوران میں اتنے ہی جلسے منعقد ہوتے ہیں جتنے جمہوریہ کے قصبے اور شہر ہیں۔

اس ہفتے سے چند دن پہلے تمام قوم کے سینے جوش و خروش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔لوگ نفیس نفیس لباس پہنتے ہیں۔مکان، دوکانیں اور سرکاری عمارات قومی جھنڈوں سے مزین کی جاتی ہیں۔جا بجا بڑے بڑے اور چھوٹے اشتہارات لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔لوگ شتاقوا کے خاص رنگ بٹن اور ٹوپیاں پہنتے ہیں نوجوان موٹروں میں بیٹھ کر ملک کے طول و عرض میں نعرے لگاتے پھرتے ہیں "ہماری شتاقوا!"ہر شہر اور ہر قصبے کے باہر بڑے بڑے خیمے نصب کئے جاتے ہیں۔شتاقوا کے منتظم اور رہنما آتے ہیں۔میر ملد آتا ہے اور ایک برجستہ تقریر میں انہیں شہر کی آزادی کا پیغام دیتا ہے۔یک بیک ہنسی مذاق، اور تہذیب و تعلیم کے ہفتے کا آغاز ہو جاتا ہے۔دوکانیں، بنک، ڈاک خانے سب بند ہو جاتے ہیں۔شہر سنسان ہو جاتا ہے اور سب شتاقوا کے خیموں کی طرف چل دیتے ہیں۔

شتاقوا کے میلوں کو انفرادی شرکتیں منعقد کرتی ہیں۔درحقیقت یہ ایک عظیم الشان تجارت بن گئی ہے اور خیموں میں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔شرکتیں بڑا روپیہ کماتی ہیں لیکن ایک اچھی شتاقوا منعقد کرنے کے لئے بھی بڑے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔

شتاقوا کا سب سے نمایاں پہلو وہاں کی تقاریر ہیں۔ماہر حکما اور سیاس اور بڑے بڑے خطیب اور پروفیسر شتاقوا کے منبر پر آ کر بولتے ہیں۔جھوٹی قابلیت کو وہاں کوئی جگہ نہیں ملتی۔

شتاقوا کی تحریک لیاقت اور قابلیت کا ایک باب مفتوح ہے۔اول اول مقرروں کو ان کی محنت کا نہایت قلیل معاوضہ ملتا تھا لیکن اب اس کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔مسٹر ولیم جننگ براین نے صرف ایک تقریر کا معاوضہ ۵۰۰۰ روپے وصول کئے اور اندازہ کیا گیا ہے اُن کی تقریروں کی سالانہ آمدنی چار لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

غرض کہ شتاقوا ساری قوم کے لئے ایک دماغی کارنیوال ہے۔امریکی جمہوریت کی کامیابی زیادہ تر انہیں تعلیمی تحریکوں کی مرہون منت ہے

یورپی زاہد

ٹائمز آف انڈیا کا ایک نامہ نگار کہتا ہے کہ [illegible]

ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ہر بات میں اُن کے پیشِ نظر حضرت مسیح کا نمونہ ہوتا ہے
ان کی کوئی جائداد نہیں ہے اور وہ اپنی خدمات کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ان کے اخراجات مشترک ہیں اور وہ معاشرہ کے
غریب ترین افراد کے پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، اپنے گھروں کا کام خود کرتے ہیں، جھاڑو دیتے ہیں اور کھانا چن لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کا نام کرسٹا سیوا سنگ ہے اور اس کے افراد بالکل رومن کیتھلک پادریوں کا سا لباس پہنتے ہیں
جو ایک نہایت معمولی کپڑے کا سفید چغہ ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ اس برادری نے جس میں
ہندوستانی بھی شامل ہیں اور یہ سب اکٹھے ایک آشرم میں رہتے ہیں ہندوستان میں جنم لیا ہے اور یہی اس کا گھر
ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ گھرانے بھی ہیں۔ یہ اُن کے مقاصد کے حامی اور اُن کے کام میں مددگار ہیں لیکن انہوں نے
ابھی آخری قسم نہیں اٹھائی۔ ہندوستانی اور یورپی ایک ہی جگہ رہتے سہتے اور اکٹھے عبادت اور خدمت کرتے ہیں۔ سب
سے بڑا بنیادی اعزاز جو اس برادری کے بڑے بڑے ارکان کو ملتا ہے، اور یہ ارکان غیر شادی شدہ ہوتے ہیں، یہ ہے
کہ وہ زعفرانی رنگ کا چغہ پہن سکیں جو ایک طویل امیدواری کے بعد عطا ہوتا ہے۔

صحافت اور خواتین

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے شعبۂ خواتین کا حال ہی میں ایک جلسہ ہر ہائی نس لیڈی آغا خاں کے مکان پر ہوا۔ مسٹر
ایس جیپن نے "صحافت اور خواتین" کے موضوع پر تقریر کی۔ مسز میک کنزی صدر تھیں۔

یورپ اور امریکا کی موجودہ صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جیپن نے بتایا کہ خواتین نے وہاں اخبارات اور
رسائل کی پیداوار میں کس طرح حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تقریباً تمام اخبارات میں بعض خاص باتیں عورتوں کے
پسند کی بھی ہوتی ہیں؛ اور یہ باتیں عورتوں کے لئے عورتوں کی جمع کی ہوئی اور لکھی ہوئی ہوتی ہیں جو صحافت کے تقریباً ہر
شعبہ میں پہنچ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی ایسی وضع و ترکیب سے شائع کئے جاتے ہیں کہ وہ گھر کی مالکہ اور مصارف
کی مختار کو مسحور کر سکیں۔ ہندوستان کی ترقی کے ساتھ بھی ایسی مطبوعات کی مانگ بڑھ جائے گی جو خواتین کے لئے
دلچسپی کا باعث ہونگی، جو امریکا اور یورپ کی مطبوعات سے سبقت لے جائیں گی۔ اور اگلے دس بیس سال میں ہم
دیکھیں گے کہ ہندوستان کے زنانہ رسائل مغرب میں مقبول ہو رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کی صحافت میں خواتین نے
اپنا دخل پیدا کر لیا جیسا کہ انہوں نے مغرب میں کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے اثرات ترقی و تہذیب کے لئے
ممد و معاون ثابت ہونگے۔

داستان گو

CALCUTTA
ART PS WORKS,
LAHORE.
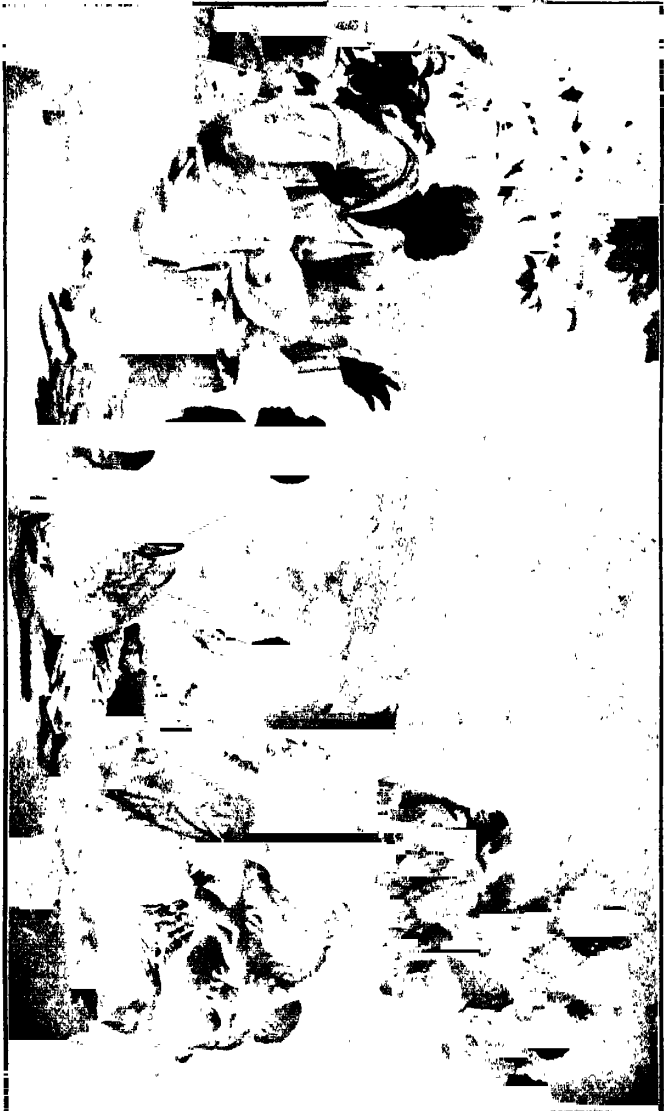
افسانہ

تیری کہانی کسی ایزدی نغمے کی طرح نرم رو ہے —— ہومر

اُس کی کہانی ایسی ہے جو بچوں کو کھیل سے اور بڑوں کو آرام سے روکے رکھتی ہے —— سر فلپ سڈنی

یہ داستان کبھی پرانی نہ ہوگی —— ہنری فیلڈنگ

حقیقت کے رخ سے میں نقاب نہیں اٹھا سکتا،
میں تو تمہیں افسانہ سناتا ہوں کہ میں نے خود اسے یوں ہی سنا ہے —— سر والٹر سکاٹ

افسانہ ادب کی شاعری ہے —— مادام نیکر

افسانہ شاعری اور مصوری کا نچوڑ ہے —— ڈرائیڈن

کم از کم دل کو خوش کرنے کے لئے کہانی سچی معلوم ہونی چاہئے
وہ بر محل، دلچسپ، مختصر اور انوکھی بھی ہونی چاہئے:
اور جب کبھی وہ اِن قوانین سے انحراف کرتی ہے،
عقل مند سو جاتے ہیں اور بیوقوفوں کو واہ واہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں —— سمالٹ فلیٹ

مجھے وہ کہانی سنانے سے نفرت ہے جو ایک مرتبہ کہی جا چکی ہو —— ہومر

منصور احمد

اکبر اعظم

یہ دلچسپ مضمون فرانسیسی مستشرق کرادے وو (Carra de Vaux) کی کتاب "مفکرینِ اسلام" (Les Penseurs de l'Islam) جلد اول (ص ۶۷-۷۴) سے رسالہ ہمایوں کے لئے براہِ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے ہم قبل ازیں چند مضامین رسالہ اردو میں خیام، عطار، سعدی اور حافظ کے متعلق شائع کرا چکے ہیں۔

تاریخ عالم کی بعض شخصیتیں اپنی عظمت وخوبی کے لحاظ سے ہمیشہ مورخین کی جذبِ نظر اور غور وبحث کا مرکز رہیں گی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بادشاہوں میں بلاشبہ یہ رتبہ ہندو عہد میں "اشوک" کو اور اسلامی عہد میں اکبر کو حاصل ہے۔

کرادے وو نے اکبر کو مفکرین کی جماعت میں شمار کیا ہے، اور زیادہ تر اسی نقطۂ نظر سے اُس کی سیرت سے بحث کی ہے۔ اکبر کے متعلق بے شمار اہلِ قلم اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کر چکے ہیں، لیکن کرادے وو کا یہ مختصر مطالعہ بھی خالی از جدت ولطف نہیں ہے (سید حسن برنی)

باعظمت مغلوں میں سب سے عظیم الشان اکبر جس نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک سلطنت کی، فی الواقع ایک مفکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے اپنی سلطنت کے مختلف اقوام ومذاہب کو ایک حکومت اور تقریباً ایک ہی مذہب کے تحت میں لانے کے مسئلہ پر غور کیا تھا۔ اس کام کی دشواری بہت بڑی تھی، جس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں نسل اور ذات کے تعصبات کس قدر قوت رکھتے ہیں۔ اکبر نوجوانی ہی سے اس مسئلہ کے مذہبی پہلو میں نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ تقریباً ہمارے زمانہ کے تھیاسوفی اور جدید عیسائی (Neo-Christians) جماعت کی طرح مذاہب کی تالیف یا کم از کم اتحاد کا خواب دیکھتا تھا جس میں مختلف ملتیں ایک وسیع وبلند تصور کے ماتحت جمع ہو جائیں۔ اس غرض سے اُس نے ایک قسم کی مذہبی مجلس قائم کر رکھی تھی۔ اپنے مستقر فتح پور سیکری میں، جو عمارات کے بہترین نمونوں سے پُر ہے اُس نے مختلف فرقوں کے نمائندوں کو بلایا، اور اپنے سامنے مباحثے کرائے۔ اس نے یسوعی فرقہ (Jesuites) کے عیسائیوں کو بلا کر انہیں اپنے مذہب کے لئے ایک چھوٹا

ساگر جا بنانے کی اجازت دی۔ اب بھی وہ کمرہ موجود ہے جس کے وسط میں ایک ستون اور گوشوں سے آ کر اُس ستون پر مل جانے والی گیلریاں ہیں، جہاں یہ مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس کا نام "عبادت خانہ" تھا۔ مقررین نہایت آزادی سے تقریریں کرتے تھے۔ ایک سیرت نگار کا بیان ہے کہ بادشاہ یہاں متشکک ہو گیا۔ اکبر نے ان مجالس شبینہ پر اکتفا نہیں کی۔ وہ صبح اُٹھ کر دیر تک تنہائی میں عام مسائل زندگی اور خاص فرائض شاہی پر غور کیا کرتا تھا۔

اکبر کا مخصوص مذہب، جو کہ ایک طرح کا مختلف خیالات سے انتخاب کیا ہوا "ہمہ اوستی مسلک" (Pantheisme Eclectique) ہے بہت کم کامیاب ہوا۔ اُسے صرف ایک درجن تبعین نصیب ہوئے جو گھر ہی کے لوگ تھے، اور کوئی فرقہ قائم نہ ہو سکا۔ ہندوستانی اسلام کو البتہ اس منصوبہ سے نقصان پہنچا۔ کلمۂ شہادت سکّہ اور خطبہ سے نکال دیا گیا، بچوں کے نام پیغمبر کے نام پر نہیں رکھے جاتے تھے، مسجدیں خالی ہو گئیں اور بعض میں فوجیوں کے لئے بارکیں بنا دی گئیں، مذہب اسلام کے احکام کے خلاف جو زندہ چیزوں کی تصاویر ممنوع قرار دیتے ہیں، اکبر نے اپنے محل میں ایسے مناظر جو عیسائی اور بدھ مذہب کی روایات سے ماخوذ تھے، نقش کرائے۔ ایلکساندر سیویر (Alexandre Severe) کا بیان ہے کہ اُس نے یسوع اور بدھ کی مورتیں اپنے کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں[۵]۔ سول حکومت میں رواداری و ایتلاف کا اصول زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اکبر کے

---

[۵] اکبر کی لامذہبی اور بدعات کے متعلق یورپین مصنفین بالعموم مبالغہ سے کام لیتے، اور اکثر ناواقفیت یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکبر کا مذہب طویل اور گہری بحث کا محتاج ہے جس کے لئے اس وقت موقع نہیں ہے، لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اکبر کی زندگی میں مختلف مذہبی دور گزرے ہیں۔ ابتداءً وہ ہندوستانی معیار سے (اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معیار چنداں بلند نہ تھا) پکا مسلمان مانا جاتا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کے اثر سے اکبر کے خیالات میں تغیر پیدا ہوا۔ ایک زمانہ آزاد مشربی، تشکک اور ہمہ اوستی و ہمہ دوستی میں گزرا۔ لیکن خود اکبر اور اُس کے مذہبی مرشد و معلم ابوالفضل اور فیضی اسلام کی بندش سے کبھی آزاد نہیں ہوئے، بالخصوص اسلامی تصوف کا ان پر نہایت زبردست اثر رہا۔ اسلامی تصوف کی وسیع مشربی ہی کے تحت میں وہ تمام دنیا کے مذاہب کا خیر مقدم کرتے رہے۔ ابوالفضل فیضی اور اکبر ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً تنگ دل مگر راستباز ملا عبدالقادر) کی نظروں میں ہمیشہ مطعون رہے، اور انہیں لوگوں کے مبالغہ آمیز بیانات نے بعد کے مورخوں میں بہت کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ یورپین مورخوں نے اپنی تخیل کی مدد سے اور بھی رنگ آمیزیاں کیں، جس کی وجہ سے اکبر کی سیرت کے بیان میں صداقت سے انحراف ہو جاتا ہے۔ اخیر عمر میں اکبر کے خیالات میں رد عمل ہو گیا تھا، اور اُس کی موت یقینی طور پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

دوش بدوش اس اصول کی تعلیم اُس کے وزیر اور دوست ابو الفضل نے بھی دی جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

انتظامِ سلطنت میں اکبر نے ایک سابق غیر مغل پادشاہ شیر شاہ کے کام کو جاری رکھا۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر اُس پادشاہ نے ہندوستان میں نہایت دانشمندی کے ساتھ سلطنت کی تھی۔ وہ مغلوں کا دشمن تھا۔ خراجِ شاہی زیادہ عدل کے ساتھ قائم کیا گیا اور مالگذاری مقرر کرنے میں اور ٹکسوں کی نگرانی میں زیادہ انصاف برتا گیا۔ وہی اصول اب تک چلے آتے ہیں۔ ایک راجہ کی لڑکی سے عقد کرتے وقت اکبر نے دو ٹکس جو ہندوؤں کی دل آزاری کا موجب تھے معاف کر دیئے۔ ایک تو وہ ٹیکس جو اُن جاتریوں کو دینا پڑتا تھا جو جاترا کے لئے برہمنوں کے تیرتھ کی جگہوں پر جاتے تھے، اور دوسرا ٹیکس جزیہ تھا، جو اسلامی فقہ کی رُو سے غیر مسلموں کو دینا پڑتا تھا۔ اکبر نے مقامی سکوں کے مسئلہ پر بھی توجہ کی۔ اُس نے مقامی سکّوں کو ممنوع قرار دیا، مروجہ سکّوں میں اصلاحیں کیں، اور رائج الوقت سکّوں کی قیمتیں قائم کیں۔ اخلاقی حیثیت سے اُس نے جنگی قیدیوں پر سختی کرنے کی ممانعت کی اور اپنے ایک رضاعی بھائی کو جو مجرم تھا اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ اُس نے ستی کی رسم کو خلافِ قانون قرار دیا۔

اکبر کا ایک دوسرا بڑا کارگذار ملازم، سپہ سالار ٹوڈرمل تھا، جو ایک لائق فوجی افسر اور ایک ممتاز ماہرِ سیاست تھا۔ اُس نے اس عہد کے انتظامی کام میں بڑا حصہ لیا۔ باغی راجاؤں کے خلاف مسلسل فوج کشیوں کے دوران میں جن میں وہ ہمیشہ کامیاب رہا، اس نے ایک سلسلہ ایسے مالی انتظامات کا سرانجام دیا، جو کہ بہترین ماہرِ مالیات ہی کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ اُس نے املاک کی ایک صحیح فہرست بنائی، جور و تشدد کی دادرسی کے لئے سہولتیں نکالیں بندوبست انیس برس تک کے لئے کیا، اس کا خیال رکھا کہ اس دوران میں لٹیرے یا مقامی عہدہ دار دست اندازی نہ کر سکیں، بعض چھوٹے عہدہ دار کم کئے، کاشتکاروں کے لئے نقد اور غلّہ کی تقاوی مقرر کی، محصّلوں کو ہر سال حساب پیش کرنے کا حکم دیا ہوا حساب خزانچی کو دیا جاتا تھا۔ مصائب مثلاً ژالہ باری و طغیانی کی فوری اطلاع کی جاتی تھی تشخیص سال میں چار مرتبہ ہوتی تھی۔ یہ ہیں وہ خاص خاص انتظامات جن کا نفاذ گویا کسی زمانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسلام سے کبھی دست بردار یا بے تعلق نہیں ہوا۔ اسی وسیع مشربی کے زمانہ میں جب کہ فتح پور سیکری میں عبادت خانہ تعمیر ہو رہا تھا فتح پور سیکری کی شاہی مسجد بھی بنائی جا رہی تھی جو اکبر کے عہد کی بہترین عمارت ہے۔ حکومت کا اسلامی نظام (قاضی، مفتی، امام خطیب) برابر قائم رہا۔ بجز اس کے کہ دربار کے چند آدمیوں کے خیالات میں ہیجان ہوا، ہندوستان کے اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ تصاویر کا رواج عمارات وغیرہ میں پہلے سے بھی تھا۔

حال کے دماغ نے کیا تھا۔

انتظاماتِ ملکی کی عمدگی کے ساتھ ہی اکبر کا عہد فنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے۔ شمالی ہند میں عالی شان تعمیرات موجود ہیں جو اکبر نے بنوائی تھیں۔ آگرہ کا قلعہ جواب بھی ہمارے سامنے موجود ہے، اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اکبر نے صنائع کی طرف بھی خاص التفات کیا۔ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ اُس نے توپوں کو بہتر بنایا، ایک نئی قسم کی گاڑی ایجاد کی اور ایک ڈنڈا توپوں کے صاف کرنے کے لئے بنوایا۔

سلطان جہانگیر نے جو اکبر کا بیٹا اور جانشین اور خود بھی ایک ممتاز شخصیت تھا، ایک تزک یا روزنامچہ چھوڑا ہے، جس کا طرزِ تحریر عالی، سہل و درخشاں ہے۔ اس کتاب میں اکبر کی سیرت اور اُس کے خیالات کے جاننے کے لئے بعض قیمتی مقامات ہیں۔ جہانگیر ابتداءً آگرہ میں اپنے باپ کے بعد اپنے تخت پر بیٹھنے کا حال لکھتا ہے اُس نے ایک سکہ چلایا جس کا مضمون یہ تھا:-

"لئے آگرہ میں مسکوک کیا، خسروِ عالم، محافظِ دنیا، پادشاہ نورالدین جہانگیر بن شاہِ اکبر نے"۔

وہ لکھتا ہے:-

"اس موقع پر میں نے اُس تخت کا استعمال کیا جو میرے والد نے بنوایا تھا، اور جس کی آرائش ایسے شاندار طریقہ پر کی گئی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ میں نے سالِ نو کا جشن منایا اُس وقت آفتاب برج حمل میں تھا۔

اکبر نے ایک نیا سنہ ایجاد کیا تھا، جو کہ اعتدالِ ربیعی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ آگ اور سورج کی تعظیم کرتا تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "پادشاہ کا خیال ہے کہ آگ اور روشنی کی تعظیم کرنا ایک مذہبی فرض ہے"

جہانگیر نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے اکبر کی رواداری کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ علاوہ بعض دیگر کے وہ ایک یہ واقعہ لکھتا ہے کہ اکبر کی زندگی میں راجہ مان سنگھ نے ایک مندر تعمیر کرایا، جس پر پانچ کروڑ چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا! خاص بت کے سر پر ایک تاج تھا جس میں جواہرات جن کی قیمت کل مصارف کا بارھواں حصہ ہوتی تھی لگے ہوئے تھے۔ اس بت کے گرداگرد اور بت بھی تھے جو سونے سے بنائے گئے اور مرصع تاج پہنے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے اکبر سے پوچھا کہ آپ ان بت پرستی کی کارروائیوں کو کیوں نہیں روکتے۔ اکبر نے جواب دیا "اے میرے عزیز بیٹے! میں جانتا ہوں کہ میں ایک نہایت طاقتور بادشاہ ہوں اور دنیا میں خدا کا سایہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی رحمتیں تمام مخلوق پر بلا امتیاز نازل ہوتی ہیں۔ میں اپنے عالی رتبہ کے فرائض میں کوتاہی کروں گا اگر میں اپنی مرحمت و نوازش کو اُن لوگوں سے جو میری حمایت میں ہیں دریغ رکھوں گا۔ میں تمام انسانی اقوام، تمام خدا کی مخلوق کے ساتھ صلح کر چکا ہوں۔ پس میں کس طرح روا رکھ سکتا ہوں کہ ایک دوسرے کو ستائے یا دست درازی کرے"۔

جہانگیر کا بیان ہے کہ جوانی میں اکبر لذائذ دنیا سے مستغنی نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ خدا کی برتر قوت کا ایسا مخلصانہ و منکسرانہ احساس رکھتا تھا کہ باوجود زبردست افواج، بے شمار مہیب جنگی ہاتھیوں، بے نظیر خزائن اور عظیم الشان سلطنت کے جس کی شان پر فوقیت نہیں دی جا سکتی، مالک ہونے کے وہ کبھی اُس بے زوال ہستی کو فراموش نہیں کرتا تھا جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ ہمیشہ یہ الفاظ اُس کی زبان پر رہتے تھے۔

"ہر حال میں اور ہمیشہ تمام انسانوں کے ساتھ صلح رکھ اور ہر حال میں پوشیدہ طور پر اپنی آنکھیں اور اپنا دل اپنے رفیقِ ازلی کی طرف رکھ"۔ اُس کی سیرت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ تمام مذاہب کے ساتھ کامل دوستی رکھتا اور جب موقع ملتا ہر جماعت کے نیک اور روشن دل بزرگوں کی صحبت اختیار کرتا تھا"۔

اکبر فی الواقع ہمارے زمانہ کے تھیاسوفی خیالات کے بانیوں میں سے ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا طرزِ عمل اُس کا نقطۂ خیال حتیٰ کہ اُس کے الفاظ دوبارہ دے لئے گئے ہیں۔ اُس نے مختلف مذاہب کے ایسے جذبات کو جو کہ پاکیزہ و عالی معلوم ہوئے منتخب کر لیا تھا، لیکن عقاید کے متعلق وہ مشکک تھا اور ایسے بیرونی مراسم کی جو اسے نامناسب معلوم ہوتے تھے کھُلی ہوئی مخالفت کرتا تھا مثلاً اسلام کی رسومِ ختنہ اور کتّوں کا ناپاک سمجھا جانا اور ہندوؤں کی رسمِ ستی۔ بلاشبہ اکبر دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ہے جو مذہبی خیالات کے میدان میں پیدا ہوئیں جو خیالات اُس نے ہندوستان میں آج سے تین سو برس پہلے ظاہر کئے تھے وہ ہمارے زمانہ میں بھی ہمیں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

اکبر کا مقبرہ سکندرہ میں ہے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ اکبر میانہ قامت سنہرہ رنگ، سیاہ ابرو، سیاہ چشم تھا۔ اُس کا جسم "شیر کا" تھا، سر بڑا، بازو اور ہاتھ لمبے تھے۔ اُس کی آواز بلند تھی۔ اُس کا اندازِ گفتگو اور اطوار و عادات نہایت شائستہ اور ممتاز تھے۔ ہندوستان کی آبادی نے اُس کی یاد کو محفوظ رکھا ہے ہندوؤں کی قومی شاعری نے اُس کے کام کی وسعت، اُس کی بہادری، اُس کی عالی ظرفی اور اُس حمایت کو جو اس نے اُن کی قوم کے ساتھ دکھائی پیشِ نظر رکھتے ہوئے بطور اپنے ملک کے ایک سربرآوردہ سورما کے اُسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

سید حسن برنی

پیرانِ سالوس

(۱)

مجرم ہیں، ہمیں سزائیں دینے والے
طوفاں میں ہیں جو سفینے کھینے والے
واللہ کہ اک وبا ہیں بندوں کے لیے
ظاہر میں خدا کا نام لینے والے

(۲)

نیکی کی ہمیں راہ بتاتے رہتے
اللہ سے ہر وقت ڈراتے رہتے
تسبیح کی گردشوں میں پیہم مصروف
اور شوق سے مالِ غیر کھاتے رہتے

(۳)

ایماں جو حسینوں پہ فدا کرتے ہیں
شغلِ دل و دو بسہ میں بسا کرتے ہیں
پیچیدہ دلوں سے غافل ہوکر
حیواں کو مریدوں کی تکا کرتے ہیں

(۴)

وہ رشتۂ تسبیح میں ہم پھندے ہیں
ہر ایک وہ بدی کا میں ہم گندے ہیں
دیکھو وہ بغل میں مسجد سے شیخ
سمجھا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

جوش ملیح آبادی

طنزیہ شاعری

سب جانتے ہیں کہ ہماری شاعری کا جزوِ اعظم ہمیشہ سے غزل رہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی ہیں حدیثِ عشق بازناں۔ اس اعتبار سے غزل یا تغزل کی بنیاد جن مضامین پر ہے وہ عموماً وصفِ معشوق، آرزوئے وصال، شکایتِ فراق، رشکِ رقیب، مذمتِ ناصح، زارنالی، شکوۂ چرخ، طنز و تعریض، چھیڑ چھاڑ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ متاخرین نے غزل کو اس قدر ہمہ گیر و وسیع بنا دیا کہ تصوف، فلسفہ، اخلاق غرض کوئی مبحث ایسا نہ تھا جو تنگنائے غزل میں داخل نہ ہو گیا ہو، مگر قدما نے غزل کو اس کے حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا اور خلطِ مبحث سے اجتناب کیا۔ یہ فارسی شاعری کا حال تھا۔ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ فارسی شاعری کے انحطاط کا دور تھا۔ اس لئے شعرائے اردو کے سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی کے شعرائے متاخرین کا کلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کی غزلوں میں (بہ استثنائے بعض) متقدمین شعرائے فارسی کی سادگی، اثر، جوش، صدقِ جذبات کم نظر آتا ہے اور تصنع اور تکلف زیادہ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ امر فی نفسہ اچھا تھا یا بُرا۔ مگر کم از کم غزل میں تغزل کی شان باقی نہیں رہی۔

تغزل کے اجزائے ترکیبی میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ایک چیز طنز و تعریض بھی ہے جو اردو شعرا کے کلام میں شاذ و نادر نظر آتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم اسی موضوع پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔

طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو جلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال دے کر اپنی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرف تو شاعر کی نازک خیالی کی دلیل ہے۔ دوسری طرف اُس کی قدرتِ زبان کا ثبوت۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اساتذۂ اردو میں مومن خاں سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ یہ منجملہ اُن چند خصوصیاتِ شاعری کے ہے جن میں وہ منفرد اور اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہیں۔ چونکہ اُن کے کلام پر رائے لکھنے والوں نے بیشتر اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق میں مومن کی اس خصوصیت پر اجمالی تبصرہ کیا جائے۔

مومن کو قدرت نے غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی روشِ عام پر چلنا پسند نہ کیا۔

نزاکتِ خیال اور ندرتِ اسلوب میں اُن کے ہم عصروں میں صرف غالب اُن کے شریک کہے جاسکتے ہیں اگرچہ شریکِ غالب نہیں ۔ مومن کی غزل حقیقی معنے میں غزل ہوتی ہے ۔ اور تغزل کی محدود جولانگاہ کے باوجود ان کی نادرہ کار طبیعت اس میں وہ نقش آرائیاں کرتی ہے کہ نگارخانۂ چین کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خیر یہ بحث تو کسی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھنی چاہئے، اس وقت ان کے طنزیہ اشعار سے غرض ہے ۔

ملحوظ رہے کہ طنز میں کبھی متکلم حقیقت کو مستہزیانہ انداز میں شکا یتاً پیش کرتا ہے اور کبھی امرِ غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطورِ حقیقت بیان کرتا ہے ۔ ذیل کے اشعار سے طنز کا اندازہ ہوگا

محبوب نے آکر عاشقِ بیمار کو قتل کر دیا ہے ۔ شاعر اس پر یوں چٹکی لیتا ہے ۔

غیر عیادت سے بُرا مانتے ۔۔۔ قتل کیا آن کے اچھا کیا

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا ۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخِ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا ۔ اب گویا تمہارا ستم کرم ہوگیا ۔

رحم فلک اور مرے حال پر ۔۔۔ تو نے کرم اے ستم آرا کیا

لوگ کہتے ہیں کہ اُس (معشوق) نے عاشق کو خاک میں ملا دیا ۔ مومن کو اس سے انکار ہے ۔ دیکھنا کس منہ سے انکار کیا ہے جس میں ہزار طعن و طنز پنہاں ہیں ۔ لکھتے ہیں ۔

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اُس پہ بھی ۔۔۔ کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

ناصح نے کہیں کہہ دیا تھا کہ عشق کا انجام کار وصال ہے ۔ مومن وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

فرماتے ہیں وصال ہے انجامِ کارِ عشق ۔۔۔ کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

دوسرا شعر اور سنئے ،

نامِ وصال سنتے ہی ہوتا ہے مضطرب ۔۔۔ کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

رقیب اپنے لئے عمرِ دراز کی دعا مانگ رہے ہیں ۔ شاعر اپنے تجربہ کے مطابق عمرِ دراز کو طولِ زمانۂ ہجر کا مترادف سمجھتا ہے اور کہتا ہے ۔

عمرِ دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو ۔۔۔ دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرا حال اس قدر زار ہے کہ سنگدل آدمی کے سوا دوسرا سننے کی تاب نہیں لاسکتا

سنگدل یا رقیب ہو سکتا ہے یا معشوق۔ مگر اس بات کو صاف صاف نہیں کہتا بلکہ تعریض سے کام لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں　　　　کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کیلیئے

عاشق نے اتفاق سے ایک دن ناصح کی گفتگو کان دھر کر سن لی۔ چونکہ دورانِ گفتگو میں معشوق کا ذکر آتا تھا جی لگ گیا۔ اس واقعہ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں، عبث　　　　ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

گویا قولِ ناصح صرف اس لئے قابلِ سماعت ہے کہ اس میں کہیں کہیں تذکرۂ یار آجاتا ہے۔ چارہ گر جوشِ جنوں کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ عاشق اس از خود رفتگی کے عالم میں بھی کس مزے سے چٹکی لیتا ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر　　　　لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

یعنی جس طرح بازار میں جنگل کی جستجو جنون ہے اسی طرح میرے جوشِ وحشت کا علاج بھی دیوانگی ہے۔ معشوق کی نظرِ التفات رقیب کی جانب دیکھ کر عاشق رسم وراہِ الفت ترک کر دیتا ہے۔ اتفاق سے کہیں ملاقات ہوتی ہے محبوب رشکِ دشمن کا عذر تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر عاشق کہتا ہے۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے　　　　میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

غرض معمولی تفحص سے مومن کے اشعار کا معتد بہ حصہ ایسا ملے گا جس میں نہایت لطیف نوک جھوک یا چھیڑ چھاڑ سے کام لیا گیا ہے۔ ذیل میں اسی رنگ کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں جن کی تشریح کرتے ہوئے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اُن کی لطافت کا خون نہ ہو جائے اس لئے یوں ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا پسند آئی اپنی جور کشی　　　　چرخ کے انتخاب نے مارا

جو پھر جائے اُس بے وفا سے تو جانوں　　　　کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

کس دن تھی اُس کے دل میں محبت جو اب نہیں　　　　سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

دیکھ مضطر کہیں نہ پھیرے دشنہ پھر　　　　یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق　　　ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے　　　اتنا تو یہاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل　　　ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

طنز و تعریض سے ملتی ہوئی ایک اور طرزِ سخن ہے جس میں کوئی استاد مومن کے قریب کیا معنی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ یعنی اس رنگ کے بھی وہی بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ میں اس طرز کو مکرِ شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس مکر سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے مقصود کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ مخاطب سمجھتا ہے کہ اس میں مومن کا نہیں بلکہ خود میرا فائدہ ہے۔ اس اعتبار سے طنز و مکر ایک حد تک متحد المقصد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شاعر پیچ سے اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔ چونکہ مومن کا تغزل حقیقی تغزل اور اُن کا عشق وارداتِ قلب کا آئینہ ہے۔ اس لئے یہ شوخی اور بھی پُر لطف اور یہ شراب اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

شاعر کی یہ عین تمنا ہے کہ محبوب اُس کی طرف ملتفت ہو مگر وہ کیوں ہونے لگا۔ اس لئے اپنی خواہش کو اس بہانہ سے بیان کرتا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

یعنی قصداً مجھ سے اجتناب کروگے تو غیر تاڑ جائیں گے کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" دیکھنا اس شعر میں کس طرح محبوب کو اشتعال دلا رہے ہیں۔

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　　اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

یعنی میرے شعلۂ دل کو چمک کا دعوٰی ہے، تم اگر جلوۂ رخ دکھاؤ تو اس کا غرور مٹے۔ اسی طرح ایک شعر میں مہرِ درخشاں کو غیرت دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس منہ پہ اُس سے دعوئی حسن، اک ذرا نہیں　　　اے مہر روشنی مرے روزِ سیاہ میں

یعنی اگر تو میرے روزِ سیاہ (بدنصیبی) کو روشنی سے مبدل کر سکے تو دعوئے حسن کرنا بھی تجھے زیب دے۔

اگر محبوب سے عرضِ وصال کرتے ہیں تو حصولِ تمنّا معلوم۔ اس لئے دعوتِ ستم دیتے ہیں اور اس حیلہ سے مطلب برآری چاہتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

چونکہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے، اس لئے اگر مجھے تکلیف دینا مقصود ہے تو وصل سے بہتر ستم اور وصل سے بڑھ کر ایذا میرے حق میں اَور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سہتے سہتے ہجر میں اب اذیت نہیں رہی اثر کو شاعر کی دعا سے دشمنی ہے، اس لئے شاعر نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ سے ہم ہجر کی دعا مانگا کریں گے تاکہ جو مانگیں اُس کے خلاف ملے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی　　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر بندش ذرا سست اور انداز غیر شاعرانہ ہو گیا ہے۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے　　(غالب)

اس رنگ کے اشعار مومن کے کلیات میں بکثرت ملتے ہیں۔ بخوفِ طوالت فرداً فرداً ہر شعر کی توضیح سے قطعِ نظر کر کے چند اَور اشعار نقل کیے جاتے ہیں یقین ہے کہ قارئینِ کرام اس امر میں ہم سے متفق ہونگے کہ یہ شوخ رنگ دوسرے اساتذہ کے کلام میں کہیں نہیں ملتا۔

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم　　　پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

بے جرم پائمال عدو کو کیا گیا　　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا　　　طعنے کیا کیا اُسے اربابِ ستم دیتے ہیں

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　　جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ہجرِ بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر　　　غم پر حرام خوار توکّل نہ ہو سکا

خار بستر پہ شبِ ہجر بچھاؤں کیونکر　　　دل میں تھے ہے وہ گل اندام اگر بر میں نہیں

جلایا آتشِ ہجراں نے دل کو　　　ترے گھر میں لگی لے بے خبر آگ

خو رنجِ رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی　　　اب اَور کچھ نکالئے آزار کی طرح

رحم کر خصمِ جانِ غیر نہ ہو　　　سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

دربان کو آنے دینے پہ پیرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے
گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سنانے کے لئے شعرا نے واسوخت یا واسوز کا میدان تلاش کیا ہے اس کی ایجاد کا سہرا متاخرینِ شعرائے عجم کے سر ہے۔ اساتذۂ اردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور تمام طعن و تشنیع کی قوت اسی محدود موضوع پر صرف کی ہے ۔ مومن جو عملاً عشق (یا ہوس) کی وادیوں میں مدتوں سرگشتہ رہے ہیں کیونکر دوسروں سے پیچھے رہتے ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشائے اصلی کو پورا کر دیا۔ واسوخت تو درکنار ، اُن کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا دھوکا ہوتا ہے ۔ ہم یہاں ان غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں اور صحت و عدمِ صحتِ مذاق کا فیصلہ اربابِ فہم پر چھوڑ کر مضمون کو ختم کرتے ہیں ۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں ۔

اب اَور سے لَو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

دل دے کے اک اَور لالہ رُو کو
پھر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعویٰ مسیحی
مر اَور پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مردے جگائیں گے ہم

بت خانہ چیں ہو گو ترا گھر
مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

دوسری غزل کے چند شعر اور سنتے جائیے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

ٹھیرے ہے کہ زنجیر سے ٹھیرائیں گے دل کو
ہر بر ہمی زلف کا سودا نہ کریں گے

پھر جائے نہ تا چشمِ صنم آنکھ کے آگے
سیرِ چمنِ نرگسِ شہلا نہ کریں گے

ضیاء احمد

مسافر

فلک فرسائیاں کچھ ہو چکیں، جو باقی ہیں سو ہوتی رہیں گی مگر آج ایسے مسافروں کا ذکر مقصود ہے جن کی عالمِ بالا تک قطعی رسائی نہیں۔ یہ شوریدہ سر مسافر ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں، پھیلتے ہیں، جو کچھ ملے اسے چپٹ کر تے ہیں مگر پھر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گویا کبھی آئے نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان مسافروں کی زندگی کا مدار باہمی کشمکش پر ہے جس قدر ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش رہیں اسی قدر ان کی گرم بازاری ہے۔ جہاں ان کا لڑائی ونگا مٹا وہیں یہ خود بھی کس مپرسی کے بوجھ تلے دب مرے۔

یہ مسافر عقائد ہیں۔ عالمِ بالا میں جبرائیل بیچارے کے پر جلتے ہیں توان لڑاکوں کی کیا مجال؟ ۔ وہ جگہ جو تُو تُو مَیں مَیں سے خالی ہو، جہاں جو پہنچے وہ کچھ نہ رہ کر سب کچھ بن جائے عقائد کے جنجال سے آزاد ہے، وہ جگہ جو ہے مگر جس کا ذکر گناہ بر تراز کفر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں، نہیں! میں اپنے قارئین کو وہاں نہ کھینچوں گا۔ جسے وہاں جانا ہو وہ پہلے یہاں کے مسافروں کا حال سنے اور جب ان سے چھٹکارا ہو جائے (قطعی اور کلّی) تو پھر ممکن ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوست! پیارے دوست!! کیا تم نے سمجھا کہ میرا قلم کیوں رکا؟ ۔ یہ بھی اک عقیدہ ہے کہ "عقیدہ نہ ہو" میں ایسی مہلک چیزوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے عقائد سے محبت ہے اور مجھے اچھی طرح علم ہے کہ لنگڑوں کو تیمور ہوتے اور قیصروں کو بے دست و پا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لو اب سنو۔

(۲)

جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو جادو میں اعتقاد خاص لاہور میں کافی زوروں پر تھا۔ ہر شخص کی زبان پر تھا "جادو برحق جادو کرنے والا کافر"۔ اس زمانے میں بہت سی بیماریاں جواب جراثیم کے سر تھوپی جاتی ہیں جادو کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان کا علاج بھی جادو ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ کئی آدمی مشہور جادوگر تھے۔ ان کی خاصی دوکان چلتی تھی۔ مقدموں میں ہار جیت بعض دفعہ جادو کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہی لاہور اب ہے کہ نہ جادوگر ہیں نہ جادو۔ یہ پرانا اعتقاد اب موت کی طرف رینگ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں کہ اس بڈھے کے مرنے پر شادیانے بجانے کی آرزو رکھتا ہو۔

یہ بھی ایک اعتقاد تھا کہ بڈھے کا مرنا خوشی کا موجب ہے۔ اب اول تو کوئی بڈھا مرنا نہیں چاہتا دسول سٹ کے طالب علموں سے اس کا حال پوچھا چاہیئے، اور مرے بھی تو کس امید پر۔ کوئی خوشی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ اعتقاد بھی تپ دق کے تیسرے درجہ میں مبتلا ہے۔ تعویذ باز بھی اپنے پرانے ایمان سے پھرے نظر آتے ہیں جھاڑ پھونک نگنڈے۔ ڈاکٹروں کی چاندی ہے۔ پیروں کے گھر بک رہے ہیں مگر کیا مجال کہ کسی کمبخت آنکھ سے ایک آنسو بھی بہا ہو کہ تعویذوں میں اعتقاد اب بستر مرگ پر ہے۔

ایک سب سے بڑا اعتقاد تھا کہ ہاتھ کا دیا کام آتا ہے۔ کئی خضر نما بزرگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھپ چھپ کر خیرات کرتے تھے کہ اس مولا کے نام کے سودے کا چرچا نہ ہو۔ اب جس چندہ دہندے کا نام میں اخباروں میں نہ چھپے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا احسان فراموش ہے۔ یہ پرانا اعتقاد بھی چل بسا۔ وہ اللہ والے مولیٰ پرست ہی نہیں تو مولا سے سودا کون کرے؟

تعجب ہوتا ہے کہ جب انسان اعتقادوں کے لیئے زندہ ہیں اور اعتقادوں کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن فیشنیبل رہ کر پھر وہ ایسے مرتے ہیں کہ کوئی اُن کا نام لیوا تک نہیں رہتا تو کیوں اس قدر اعتقاد پرستی پر زور ہے؟ کیوں انسان اس قدر بے بس ہیں کہ بجائے اس کے کہ اپنے لیئے زندہ رہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے دماغوں کو مرنے والوں، اعتقادوں کی مزاریں بنائیں؟

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ تین چار پھٹے پرانے کپڑوں والے کمرے میں داخل ہوئے۔ محض عادتاً میں تعظیم کے لئے کھڑا ہوا اور ان حضرات سے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ بیٹھتے بیٹھتے ان لوگوں نے رسم تعارف ادا کی۔ ایک صاحب بولے "مجھ مسکین کا نام **خیرات** ہے"۔ دوسرے بزرگ بولے "اس عاجز کو **پیری مریدی** کہا جاتا تھا"۔ تیسرے پرانے نے دبی زبان سے کہا "مجھ خاکسار کو **جادو** کے نام سے یاد کیا جاتا تھا"۔ چوتھے صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا، "حضرت تعارف تو ہوتا ہی رہے گا آپ بیٹھیئے تو سہی مسلمان کا گھر ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اس قدر تکلف کیوں فرماتے ہیں؟" یہ جملہ چونکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو ان بزرگوں کے چہرے پر کچھ رونق سی نظر آئی۔ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ مجھ بدنصیب سے آج تک کوئی نیک کام نہ ہوا تھا۔ شاید یہی نیکی کام آجائے کہ میں ان لوگوں سے اچھی طرح ملا ہوں۔

تھوڑی دیر تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گردش ایام کی نسبت فقرے چسپت ہوئے۔ غرض کے بندوں کو بُرا بھلا کہا گیا۔ لوگوں کے ظاہر باطن کا پول کھولا گیا مگر آخر کار یہ وفد اپنے اصل مطلب پر آیا۔

جادو۔ سنئے مسٹر۔ ہم جو مخل ہوئے ہیں تو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اپنا وقت اچھا یا برا ہم لوگ گذار چکے۔ نیا دور دورہ ہے اور اگر ہم لاکھ معقول وجہ بھی آپ کی سائنس کے برخلاف پیش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ہم ہزار دفعہ کہیں کہ "طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم" مگر ہماری سنتا کون ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں خر خر ہی نہیں بلکہ براق ہے ان سے بحث فضول ہے۔ ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ ہماری اترن سائنس کے ذیب سر ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کے لئے پنشن بھی میسر نہیں ہوسکتی تو آپ کم از کم یہ تحریک تو کریں کہ ہماری تجہیز و تکفین تو ایک معقول طریقے سے کردی جائے۔ اس سے زیادہ ہمارا کچھ مطلب نہیں۔ ہم اہل دنیا کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ خود اپنے آپ سے تھک گئے۔ ہم اب چلتے بھلے مگر کیا آپ کی خودداری اس امر کی اجازت دے گی کہ آپ کے بزرگوں کے ہم نوالہ ہم پیالہ اس غیر حالت سے مریں کہ ع

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

میں۔ (رسمی طور پر) بندہ پرور للہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہئے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں وہ میرے دل پر نقش ہیں اور کافر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہوچکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا۔

خیرات۔ آپ ہم مسکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں۔ ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دام تزویر پھیلائے جاتے ہیں

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں۔ معاف کیجئے۔ آپ کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمائیے کہ قوم بچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی اور وہ لوگ پیسے کے پیر ہیں اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے؟

پیری مریدی۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ جس باوفا نے آپ لوگوں کو لندن اور پیرس میں نہ بھلایا جس نے

وہاں سفید ہاتھوں پر بیعت کی ہو اور جو اخضر آنکھوں کے جادو سے نہ بچا ہو وہ آپ سے کیا بے اعتنائی کریگا مگر آپ ہی ارشاد کیجئے کہ اب صورت ہو تو کیا ہو؟

جادو، خیرات، پیری مریدی۔ (یک زبان ہو کر نہایت مایوسی کے لہجے میں) کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان ایسے گئے گذرے ہو گئے کہ ہمارے نام سے بھی بیزار ہیں۔

میں ۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آپ یہ نہ فرمائیے۔ اب بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو آپ کا دم بھرتے ہیں مگر رفتارِ زمانہ کو تو دیکھئے۔

سب۔ تو ہم آپ سے کیا امید رکھیں؟

میں ۔ مجھ بے بس کا زور چلے تو آج آپ سب کو مثلِ سابق تخت نشین کردوں اور میری قوم کو بھی شاید عذر نہ ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذاہب وہابی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مکّے مدینے میں لوگ وہابی ہوگئے تو لاہور بچارے پر کیا گلہ۔

سب ۔ بڑی مشکل ہے۔ مرنے آپ نہ دیں جینے کے یوں لالے، ہم کریں تو کیا کریں۔

میں ۔ حضرت۔ قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو رحلت ہی کرنی ہوگی اور وہ بھی خفیہ خفیہ مگر شرطِ ایمان تو یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا ۔ ممکن ہے کہ آپ کے دن پھریں اور پھر آپ اور میری قوم شیر وشکر ہو کر رہیں۔

سب ۔ آپ نے رہا سہا بھی ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ گو ہم تھک گئے ہیں مگر ہم اب چلیں گے۔ رونا صرف یہی ہے کہ اگر ہم کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ مسلمان بھی ہم سے غداری کریں گے تو ہم آج سے کئی سو سال پہلے اس قوم سے پہلو تہی کرتے۔ افسوس ہے تو بس اس قدر کہ آپ نے بھی حقِ صحبتِ دیرینہ ادا نہ کیا۔ لیجئے۔ خدا حافظ

وہ بزرگ تو چل دیئے مگر ان کا آخری جملہ تیر کی طرح کھٹکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا کہ انہیں بلاؤں، گلے سے لگاؤں اور یقین دلاؤں کہ اوروں کا تو ذمہ لینا مشکل ہے مگر جہاں تک میرا دم ہے ان کی عزت حرمت میں فرق نہ آئے گا۔ مگر وہ تھکے مسافر بلا کے گرم رفتار نکلے۔ یونہی جھلک سی دکھائی دی کہ وہ اسی گروہ میں مل گئے جس میں پرانے مصری فرعونی اعتقاد۔ پرانے یونانی اعتقاد۔ پرانے رومن اعتقاد۔ پرانے تورانی اعتقاد تھے بہت دیر تک کلیجہ مسوسا کیا مگر آخر شکر کیا کہ اب مسلمانوں کو بھی موقع ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ کیا تھا، یہ سوچیں کہ کیا ہو۔ مگر میرا شکر قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ جونہی میں مڑا تو پہلو سے ایک ناگوار قہقہہ کی

آواز آئی اور وہ بزرگ جن کو اپنا تعارف کرانے سے میں نے ٹوک دیا تھا تضحیک آمیز لہجہ سے فرمانے لگے "آپ نے اُس وقت میری بات نہ سنی۔ مجھ ہیمیدان کا نام رواج ہے۔ آپ چند بوسیدہ اعتقادوں کے ٹھکانے لگ جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟ ابھی تو میرا تسلط قائم ہے۔ جب تک شادی بیاہ، ترکہ، میراث اور روزانہ میل جول میں پرانے رسم و رواج قائم ہیں تب تک کیا ہو گی تدبیر عبث ہے۔ مشرقی انڈوں سے مغربی مرغے پیدا ہو چلے مگر میں آپ کو وعظ سنانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔ میں جو ان جوانمرگوں کے ساتھ مل کر آپ کے پاس پہنچا تو اس کی علت غائی صرف یہ تھی کہ آپ کو اس خطرہ سے آگاہ کروں جو ذاتی طور پر آپ کو درپیش ہے۔ ایک دفعہ آپ میرا مقابلہ کر کے زک اٹھا چکے ہیں۔ اب آپ کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غازی کمال پاشا کے خیالات کی توسیع ہو اور دعویٰ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے یہ خیالات اُس وقت سے ہیں جب ابھی کسی نے غازی پاشا کا نام بھی نہ سنا تھا۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ قوم کے لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملاتیے اور اپنی مشرقی لکڑیوں کوں کو جاری رکھئے۔

(۳)

جب یہ بڈھا اپنی بک بک ختم کر چکا تو مجھے خیال ہوا کہ رواج مذہبی عقائد سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جو چند مستورات اس بڈھے کا گلا دبانے میں مصروف ہیں وہ اسے مذہب کے پھندے سے پھانسی دینا چاہتی ہیں حالانکہ رواج کی جان یہ ہے کہ جہاں اس سے لڑو وہیں وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہی ہر روحانی روزانہ اخبار میں ایک اشتہار روانہ کیا۔

"ضرورت ہے سخت ضرورت ہے۔ فوراً ضرورت ہے۔ ایسے خندۂ پیہم کی جو ایک بڈھے کو ہنساتے ہنساتے اس کا دم نکال دے۔"

سائنس کی طرف سے جواب آیا کہ جناب من میرے کارخانے میں اور سب کچھ ہے مگر ہنسی کی ساخت شروع نہیں ہوئی۔

مذہب کی طرف سے جواب آیا "کار خیر میں بھی ہنسی سے امداد طلب کرنا مذہب کی توہین ہے۔"

اس جواب پر تو لاحول پڑھا اور پھر شیطان کا خط شوق سے کھولا۔ لکھتے ہیں۔

"حضرت میرے ایک چیلے سے میرے دوسرے چیلے کو قتل کرانا چاہتے ہو! بڑے اُستاد ہو کہ مولویوں کے کام میں ابلیس کی اعانت کے مدعی ہو۔"

جب ابلیس سے بھی مایوس ہوا تو عقل کے پوسٹ کارڈ پر نظر پڑی۔ بڑی بی نے صرف ایک

جملہ لکھا۔

"تم تو سودائی ہو"

(۴)

مگر مجھے اس بڈھے مسافر کو ضرور اگلے جہان کا ٹکٹ لے کر دینا ہے۔ اور اس ٹکٹ کے دام وہم ہیں یعنی خندۂ پیہم۔ اس قدر اس بڈھے پر ہنسا جائے، اس قدر اسے ہنسایا جائے کہ جہاں پیری مریدی کی قبر ہے وہیں اس کی بھی مڑھی بن جائے۔

فلک پیما

یاد

مجھے یاد کرنا جب میں یہاں سے چلا جاؤں
دور دراز کے خاموش اور سنسان ملک میں۔
جب تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے سکو گی
اور نہ میں جاتے جاتے مڑ کر پھر رک سکوں گا۔
مجھے یاد کرنا جب وہ دن گذر کر دور ہو جائیں گے
جب ہم تم اپنے مستقبل کے لئے لطیف منصوبے باندھا کرتے تھے۔
صرف مجھے یاد کرنا تم جانتی ہو
کہ اس وقت مدد اور التجا کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔
لیکن اگر کچھ عرصہ کے لئے میری یاد فراموش ہو جائے
اور اس کے بعد میں پھر یاد آجاؤں، تو رنج نہ کرنا۔
اگر موت کی تاریکی اور قبر کے ڈراؤنے تغیرات کے خیالات
میرے گذشتہ جذبات کا ایک شمہ بھی تمہارے دل میں باقی چھوڑیں
تو کہیں بہتر ہے کہ تم مجھے بھلا کر مسکرا دو
بجائے اس کے کہ مجھے یاد کر کے رنجیدہ ہو۔

(روزیٹی)

محسن عبداللہ

درسِ عمل

علّامہ سر اقبال

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ۔۔۔ ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت ۔۔۔ ہستم اگر میروم، گر نہ روم نیستم

ترجمہ از آزاد انصاری

کسی کنارۂ ساکن نے بحر سے یہ کہا ۔۔۔ اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گذریں

مگر ہنوز عجب گومگو کا عالم ہے ۔۔۔ نہ زندگی ہی مسلّم، نہ موت ہی کا یقیں

سنا جو موج نے لہرا کے یہ جواب دیا

"اگر رواں ہوں تو زندہ سمجھ، نہیں تو نہیں"

حکیم آزاد انصاری

مبادیٔ سیاسیات

باب ۸

حکومت کا حیطۂ اقتدار

اس سے پچھلے باب[۱] میں یہ دکھایا جاچکا ہے کہ عملی انتظامِ مملکت میں نہ تو مجرد انفرادی نظریہ سے ہی کام نکل سکتا ہے نہ مکمل اشتراکی نظریہ سے، بلکہ جب کسی ملک میں کوئی فریق برسرِ اقتدار ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُسے غالیت اور انتہا پسندی کو خیرباد کہہ دینا پڑتا ہے اور مملکت کے حسبِ حال حکومت کرنی پڑتی ہے۔ اسی باب میں یہ بھی سرسری طور پر دکھایا گیا تھا کہ آج کل اُن ملکوں میں جہاں انفرادی اصول پر حکومت ہوتی ہے، ایسے اشتراکی انتظامات جیسے ریل، تار، ڈاک اور سرپرستیٔ مصنوعاتِ ملکی نظر آتے ہیں، اور اس کے برعکس روس جیسے ملک میں جہاں اشتمالیت کا دور دورہ ہے، اب حکومت اپنے اصل اصول سے ہٹ کر خانگی تجارت اور بیع وشریٰ کی اجازت دے رہی ہے۔ موجودہ باب میں اس موضوع پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے گی اور دونوں قسم کے ممالک میں حکومت کا دائرۂ اقتدار متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مملکت کا مطمحِ نظر۔ اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو انفرادی حکومت ہو یا اشتمالی، اس کا سب سے اہم، بلکہ بعض کے نزدیک تو شاید واحد کام یہی ہے کہ وہ حتی الامکان افرادِ مملکت کے سود و بہبود کی کوشش کرے بلاشبہ یہ مقصد یعنی بہبود کی کوشش نہایت ہی مبہم ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مملکت والوں کے فائدہ کا تعین کون کرے گا۔ اس مسئلہ پر تو آئندہ بحث کی جائے گی، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ حکومت خواہ کسی اصول پر کاربند کیوں نہ ہو، اُس کا ظاہری مقصد ملک والوں کی بہتری کی تلاش ہے، اور یہ فرق جو انفرادیت، اشتراکیت، اشتمالیت، تراج اور اتحادیت کے مابین نظر آتا ہے، دراصل مقصدِ آخری کا فرق نہیں

---

[۱] رسالہ ہمایوں، ستمبر ۱۹۲۹ء۔

بلکہ محض طرزِ کار کا فرق ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ملک کا مفاد اسی میں مضمر ہے کہ افراد کے خانگی معاملات میں حکومت کی دسترس ہو تو دوسرا یہ کہتا ہے کہ ملک والوں کے لئے بہترین طرزِ کار یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جائے، بلکہ شاید مناسب یہی ہے کہ سِرے سے حکومت ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بہر نہج اس موجودہ باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ آج کل کی حکومتیں کن کن امور کو اپنے حیطۂ اقتدار میں سمجھتی ہیں، اور ساتھ ہی مختلف انفرادی اور اشتراکی حکومتوں کی مثالیں دی جائیں گی۔

مملکت کی شیرازہ بندی ۔ حکومت[۵۲] کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حتی الامکان مملکت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دے۔ اس کے لئے دو مختلف النوع فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ایک تو اندرونی امن و امان اور تہذیب، دوسرے بیرونی دشمنوں سے ملک کو مامون و مصئون رکھنا۔ گو ان دونوں مقاصد کے لئے ایک ہی قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دو فرائض دراصل مختلف النوع ہیں، اور غور کیا جاتے تو اندرونی حفاظت کا کام بیرونی حفاظت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی حملوں سے بچاؤ کا انتظام ایک محض میکانی کام ہے یعنی اگر حکومت کو فوج کی ایک خاص تعداد یکجا کرنے پر دسترس ہو اور اس کے پاس کافی سامانِ حرب بھی موجود ہو تو وہ ایک بڑی حد تک بیرونی خطرات سے محفوظ رہے گی۔ لیکن مملکت کو اندرونی بغاوتوں کا شکار نہ ہونے دینا اور خود اپنی بقا کی تدابیر کرنا یہ اس لئے مشکل ہے کہ حکومت مملکت کی خادم ہے[۵۳]، اور مملکت جملہ باشندگانِ ملک کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جس میں بے چین اور شورش پسند عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فی نفسہٖ امن و امان اور ترتیب و تنظیم کوئی آخری مقصد نہیں بلکہ دراصل کسی آخری مقصد کے حصول کی تدابیر ہیں، اور وہ مقصد مملکت کے وقتی مطمحِ نظر کا حصول ہے۔ "جس طرح کسی چڑیا خانے میں ایک قسم کی تنظیم، جیل خانے میں دوسری قسم کی تنظیم، مدرسے میں تیسری طرح کی تنظیم، اور گھرانے میں چوتھی طرح کی تنظیم ہوتی ہے[۵۴]۔ اسی طرح اگر ملک کسی غیر قوم کا دست نگر ہو تو ایک طرح کی تدابیرِ امن، اور اگر آزاد ہو تو دوسری طرح کی تدابیرِ امن کی ضرورت لاحق ہوتی ہے"۔ تنظیم کے معنی مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ دست نگر ملک میں تنظیم اور امن و امان سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے تحت ملک پر آسانی سے حکومت کی جا سکے، درآنحالیکہ کسی آزاد ملک میں اس سے مراد وہ صورتِ حال ہے جس میں باحسن وجوہ مفادِ عامہ کے حصول کی کوشش ممکن ہو۔

---

۵۲ باب ۲ ۔ ہمایوں، مارچ ۱۹۲۸ء

۵۳ میک آئیور مملکت حالیہ Mac Iver: The Modern State حصہ ۲، باب ۵، جزو ۳۔

الغرض حکومت اپنی حفاظت کی جو تدابیر عمل میں لاتی ہے اور اُس کے لئے افراد کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسی وقت حق بجانب سمجھی جا سکتی ہیں جب اُن سے اُن کے مخصوص مطمحِ نظر کے حصول میں سہولت پیدا ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حکومت خواہی نخواہی افراد کے ہر نوع کے خیالات و اقوال کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس افراد کی بہت سی ایسی حیثیتیں ہیں جنہیں انفرادی حکومت علی العموم چھوتی بھی نہیں، مثلاً رسم و رواج، اخلاق و عادات، گو اُسے ان میں بھی مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ عام طور پر اس کا کام یہ ہے کہ ہر فرد کو دوسرے افراد اور مجموعوں کی بے جا دست برد سے محفوظ رکھے، اس کے ذاتی امور میں بے جا دست اندازی سے باز رہے اور مملکت کو دوسرے ممالک سے آزاد رکھے۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر حکومت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اُسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ مملکت کی اس کم از کم مداخلت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مختلف افراد کے باہمی تعلقات کا تعین معمولی دیوانی و فوجداری قوانین کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعین دستوری و فوجداری قوانین کی مدد سے اور مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کا تعین قانونِ بین الاقوام کے ذریعے سے کیا جاتا ہے لیکن حکومت ان ہی امور میں مداخلت کرنے پر قانع نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اپنا دائرۂ عمل وسیع کرتی رہتی ہے۔ حکومت کو ایک طرف مملکت سے گہرا تعلق ہے، اور دوسری جانب وہ ہیئت حاکمیہ کی ساختہ پرداختہ ہے[۵۴] اور اپنے جملہ فرائض کی انجام دہی میں اس سے مدد لیتی رہتی ہے، چنانچہ ملک کے تمام وسائل و پیداوار عملاً اسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جن سے ملک والوں کی حالت بہتر ہو جائے، اور انہیں اپنے ذاتی کاروبار میں مدد مل سکے۔ افراد کی بہ نسبت اس کے پاس روپیہ بدرجہا زیادہ ہوتا ہے، اس لئے وہ صنعت و حرفت، زراعت، تحقیقات و تفحص میں طرح طرح کے تجربے کر کے ان کی مدد سے پیداوارِ دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے، نیز چونکہ وہی سکہ سازی کا انتظام کرتی ہے اور محاصل درآمد و برآمد اور چنگی کا محصول وصول کرتی ہے اس لئے اگر چاہے تو ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کر سکتی ہے۔

فوج۔ بہر نہج ملک کی حفاظت و انتظام کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری اور لابد ہیں، ایک فوج، دوسرے روپیہ۔ علاوہ بعض مستثنیات[۵۵] کے آج کل کے زمانے میں تمام متمدن ممالک کی فوجیں خود اس ملک کے باشندوں

---

۵۴ باب ۵، ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء

۵۵ بعض ممالک (مثلاً فرانس) میں ایک "غیر ملکی رسالہ" ہوتا ہے جس میں وہ غیر ملکی بھرتی کئے جاتے ہیں جنہیں اس ملک کے خارجی طرزِ عمل سے ہمدردی ہو۔ فرانس کا غیر ملکی رسالہ جنگِ ریف میں فرانس کے دوش بدوش لڑا۔

پر مشتمل ہوتی ہیں، اور دو ممالک خواہ سیاسی معنے میں کتنے ہی آپس کی دوستی و ہوا خواہی کا دم کیوں نہ بھرتے ہوں کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک دوسرے کے شہریوں کو اپنی اپنی فوجوں میں شریک ہونے دیں۔ سو برس پہلے یہ معمولی بات تھی کہ کسی ملک کے شہری دوسرے ملک میں جائیں اور تنخواہیں مقرر کرا کر فوج میں بھرتی ہو جائیں، لیکن آج کل کی عام بین الاقوامی معاشی و سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی ملک کسی دوسرے ملک والے کو اپنے معمولی رسالوں میں بھرتی نہیں ہونے دیتا۔ بعض ممالک میں تو فوجی خدمت پر محض شہریت کے علاوہ دوسری شرائط بھی لگائی جاتی ہیں، مثلاً روس میں کوئی شخص جب تک اپنے ذاتی کسب سے براہ راست دولت میں اضافہ نہ کرتا ہو اُس وقت تک اُسے ملک کی حفاظت میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اکثر ممالکِ حاضرہ میں صرف ملک والوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح روس میں صرف وہی باشندے قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں جو مملکت کے بنیادی اصول پر عمل کرتے ہوں، یعنی جو خود اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر اپنا پیٹ پالتے اور ملک کی دولت میں اضافہ کرتے ہوں۔ یہی کیفیت عروجِ دولتِ اسلام کے زمانے میں شرعِ مروجہ کی تھی جس کے مطابق فوجی خدمت کے لئے صرف مسلمانوں ہی کو مجبور کیا جاتا تھا اور اہلِ ذمہ (یعنی غیر مسلموں) کی حفاظت اور فوجی خدمت سے معافی کے معاوضے میں ان سے جزیہ لینے پر کفایت کی جاتی تھی[۵۶]۔ اکثر قدیم متمدن ممالک میں یہ قاعدہ رائج تھا کہ خطرے کے وقت حکومت جس کسی شہری کو چاہتی مملکت کی حفاظت کے لئے طلب کر لیتی، اور چونکہ قواعد، تنظیم و ترتیب کا آج کل کی طرح رواج نہ تھا، اس لئے حکومت کو اس میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ آج کل کی مرتب و منظم افواج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ملیں گے جن میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ جاری ہے، مثلاً فرانس میں ہر ۲۱ سالہ شہری کو ایک یا سوا سال کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اور حکومت جب چاہے ۴۵ سال تک کے شہریوں کو باضابطہ فوجی خدمت کے لئے طلب کر سکتی ہے، اسی طرح جاپان میں ہر شہری کو جس کی عمر ۱۷ سال سے تو متجاوز ہو لیکن ۴۰ سال سے بڑھ نہ گئی ہو حکومت ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قانوناً طلب کر سکتی ہے۔ سلطنتِ

---

۵۶ جزیے کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کا تعین یا تو عہدنامے کے ذریعے سے ہوتا تھا ورنہ خلیفۂ وقت اس کا تعین کرتا تھا۔ بہر حال یہ محصول درحقیقت اہل الذمہ یعنی غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے میں عائد کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فوجی خدمت لازمی تھی اور غیر مسلموں پر معاف تھی، چنانچہ اول الذکر پر ملک کی حفاظت کا پورا بار پڑتا تھا۔ جزیے سے عورتیں، بچے، اندھے، مریض اور تارکانِ دنیا بری تھے۔ دیکھو عبدالرحیم: اصولِ قانونِ اسلامی Abdur Rahim: Muhammadan Jurisprudence باب ۱۱ و ۱۲۔

برطانیہ اور ممالکِ متحدۂ امریکہ دو ایسی سلطنتیں ہیں کہ ان میں فوجی خدمت لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے، گو پچھلی جنگِ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ میں بھی چند سال کے لئے فوجی خدمت لازمی کردی گئی تھی۔

روپیہ۔ ملک کا انتظام چلانے کیلئے دوسری ضروری چیز روپیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کاروبار کی انجام دہی کیلئے باشندگانِ ملک پر محاصل عائد کرے۔ ان محاصل کی نوعیت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ ہندوستان قدیم میں یہاں ہندوؤں کے عروج کے زمانے میں سرکاری آمدنی کے ذرائع محاصلِ درآمد و برآمد کے علاوہ زر و جواہر، جنگلات، پیداوار باغات، پیداوارِ خورونوش، اور سرکاری اراضیات پر مشتمل تھے[57]۔ شیوعِ اسلام کے بعد عہدِ خلافت میں مسلمانوں سے عشر، زکوٰۃ و خمس، اور غیر مسلموں سے جزیہ لیا جانے لگا[58]۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم نہیں تھی جتنی آج کل پائی جاتی ہے، اور اکثر شاہانِ مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت، پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعے سے (جنہیں واپس دینے کا خیال بھی نہ ہوتا تھا) روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے[59]۔ زمانۂ حال کے متمدن ممالک کی آمدنی کا دارومدار عام طور پر علاوہ محاصلِ درآمد و برآمد و محصول چنگی کے محاصلِ وراثت، اور محاصلِ آمدنی، زمینداری و مکانات پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہوجاتا ہے، مثلاً ڈاک، تار، ٹیلیفون، کاغذِ مہور وغیرہ، اور آج کل پیٹنٹ کے جو قوانین رائج ہیں انہیں دراصل قدیم اجارہ فروشی کے باقیات تصور کرنا چاہیئے۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیا کے بنانے اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے۔ جیسے فرانس میں سگریٹ اور دیا سلائی، اور ہندوستان میں افیون۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں وفاقی حکومت رائج ہے، عام طور پر بعض محاصل مرکزی اداراے کے سپرد کردیئے جاتے ہیں اور بعض ریاستی ادارت کو تفویض کردیئے جاتے ہیں، مثلاً ممالکِ متحدۂ امریکہ میں محاصلِ درآمد و برآمد، محصولِ آمدنی و دیگر ہم جنس محاصل کے عائد

[57] دیکھو ارتھ شاستر، مترجم انگریزی ڈاکٹر شام شاستری حصہ ۲، باب ۶

[58] اسلامی محاصل کے لئے دیکھو عبدالرحیم حسب بالا، باب ۱۱ عشر اس اراضی کی آمدنی کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو مسلمانوں کی ملک ہو۔ اور خمس اس اراضی کی آمدنی کا پانچواں حصہ جو غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہو۔ خریہ کے لئے دیکھو حاشیہ نمبر ۶ بالا خراج اُن ممالک سے وصول کیا جاتا تھا جو غیر مسلموں کے قبضے میں چھوڑ دیئے گئے ہوں۔

[59] "پیش کش"، "جبری قرضوں" وغیرہ کے لئے دیکھو گرین، "تاریخ اہلِ انگلستان" مترجمہ قاضی تلمذ حسین، (مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن) یا کوئی دوسری تاریخِ دستورِ انگلستان۔

کرنے کا اختیار مرکزی ادارات کو حاصل ہے، اور محاصلِ مملوکات و دیگر براہِ راست محاصل کو ریاستوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔
برطانوی ہند میں مرکزی اور صوبہ داری مالیات کا دارومدار دونوں ادارات کی باہمی تقسیم کار پر ہے، چنانچہ
مرکزی ادارات درآمد و برآمد، آمدنی، ریل، تار، ڈاک اور نمک پر محاصل عائد کرنے کے مجاز ہیں، اور صوبہ جات
مالگذاری، آبکاری، زراعت، جنگلات، کاغذ ممہور اور تسجیل کی مدات سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ لیکن یہاں
یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ محصولِ آمدنی میں جو اضافہ ہوتا ہے اس میں سے ۲۵ فی صدی اس صوبہ کے حوالہ کر دیا
جاتا ہے جہاں کی آمدنی میں وہ اضافہ ہوا ہو۔ ۱۹۲۸ء سے پہلے ہر صوبہ کو ایک خاص رقم مرکزی حکومت کی نذر کرنی
پڑتی تھی، لیکن اب مرکزی محاصل میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

تنظیم۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مملکت ایک ایسا فطری ارادہ ہے جو ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک ہے اور
اس کی ضرورت سب سے زیادہ اس لئے پیش آتی ہے کہ مختلف افراد کے مابین اور نیز ان کی اجتماعی اور انفرادی
خواہشات کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے اور اس سے معاشرۂ انسانی کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اُس
کا انسداد کرنے[1]۔ افراد اور مجموعوں کو مرتب و منظم کرے اور ایسے قوانین بنائے جن سے اس تصادم کا کم سے کم
اندیشہ باقی رہ جائے، نیز اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دے۔ اس ترتیب و تنظیم کے لئے سب سے
پہلے تو ملک کے حدودِ اربعہ کا تعین اور ملک کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا کام ہوتا ہے جس کے
بغیر کسی حکومتی ادارے کے لئے اپنے دائرۂ اقتدار کا تعین ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر
انسان کے جان و مال کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے لئے قواعد بنائے جائیں اور ایسی سزائیں تجویز
کی جائیں جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت، اور ساتھ ہی (بشرطِ امکان) خود مجرم کے لئے باعثِ تنبیہ ہوں۔
ایسے محکمہ جات کا قیام بھی لازمی ہے جو ان قواعد یا قوانین کی خلاف ورزی یا افراد کے باہمی تصادم کی صورت
میں حکم یا پنچ کا کام کرے اور ان قواعد کے مطابق تجویز کر کے اس کا نفاذ کرائے۔

امورِ مفصلۂ بالا سے معلوم ہوا کہ حکومت کے فرائض سہ گانہ ہیں، یعنی ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی بے
چینی سے محفوظ رکھنا، افراد کی بیش از بیش آزادی، مملکت کے حصول و قیام کی غرض سے خاندانی تعلقات، جان
و مال، تجارت و حرفت کے لئے قوانین بنا کر انہیں نافذ کرنا، اور ایسی عدالتیں قائم کرنا جو ان قوانین کے مطابق
ان افراد سے بازپرس کر کے ان لوگوں کو پاداش کو پہنچائے جنہوں نے قوانینِ مروجہ کی خلاف ورزی کی ہو۔

---

[1] ملاحظہ۔ باب ۵۔ ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جن کے بغیر حکومت ملک کا انتظام چلا ہی نہیں سکتی۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے[۱] آج کل کے زمانے کا عام رجحان یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کا دائرۂ اقتدار روز بروز وسیع ہو رہا ہے، چنانچہ ان ممالک میں بھی جہاں انفرادی طرز پر انتظام کیا جاتا ہے، بہت سے ایسے امور حکومت کے دائرے میں آ گئے ہیں جو نصف صدی قبل اس سے باہر تھے۔ انہیں آسانی و سہولت کی خاطر اختیاری فرائض کہنا مناسب ہوگا تاکہ ان کا لازمی فرائض حکومت سے امتیاز کیا جا سکے۔ اختیاری فرائض دو قسم کے سمجھے چاہئیں، ایک میں تو وہ امور شامل ہیں جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بروئے کار آنے ہی نہیں اور دوسرے جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بھی انجام پا سکتے تھے لیکن جن کا تعلق ایسی حالت میں افراد سے ہوتا۔ ثانی الذکر امور میں مداخلت گویا اشتراکیت نما ہوگی، اور اول الذکر امور کی نگرانی نیم اشتراکی۔

نیم اشتراکی فرائض۔ سب سے پہلے نیم اشتراکی فرائض حکومت یعنی اُن فرائض کو لیجیے جو حکومت کی مداخلت کے بغیر غالباً پورے نہ ہو سکتے یا کم از کم زیادہ وسیع پیمانے پر انجام کو نہ پہنچتے۔ آج کل کے زمانے میں حکومت نے اپنا فرض اس کو سمجھ لیا ہے کہ حتی الامکان باشندگانِ ملک کو بہتر بنانے اور ان کی معاشی حالت کو درست کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ اب شاید مشکل سے کوئی ایسا عقیدہ پرست انفرادی نکلے گا جو ہربرٹ سپنسر کی طرح کلیتہً بقائے اصلح کے مسئلے پر اعتقاد رکھتا ہو۔ آج کل کی انفرادی حکومتیں بھی اس کی کوشاں رہتی ہیں کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین وسائل بہم پہنچائیں، ان کی تندرستی کی نگہداشت رکھیں، گاؤں گاؤں حفظانِ صحت کا انتظام کریں، جگہ جگہ شفاخانے کھولیں، تحقیقات و حکیمانہ تجسس کی خاطر مناسب مقامات پر عجائب خانے اور نوادر خانے کھولیں اور کوشش کریں کہ ملک کے صنعتی حرفتی و زراعتی وسائل میں اضافہ ہو۔ نیز متمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں اعداد و شمار کا محکمہ بھی قائم کرتی ہیں تاکہ مختلف شعبوں اور محکموں کو ملک کی موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اس حالت کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جو زمانۂ حال کی متمدن انفرادی حکومتوں نے اپنے سر لے لیے ہیں، اور اگر ان کی انجام دہی میں وہ کوشاں نہ ہوں تو یہ امور شاید سرے سے انجام ہی نہ پائیں، اس لئے کہ افراد کے وسائل اس قدر بڑھے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کا حلقۂ اثر اس قدر وسیع ہے کہ وہ ان سب باتوں کو فرداً فرداً یا باہم متفق ہو کر بھی بڑے پیمانے پر پورا کر سکیں۔ بلا شبہ امریکہ اور مغربی یورپ میں پچھلے چند سالوں میں بعض نہایت عظیم الشان

---

[۱] باب ۷، ہمایوں، ستمبر ۱۹۲۹ء

رشتیں اور کاروباری جتھے قائم ہو گئے ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کا ہے، تاہم ان میں سے ایک صرف ایک مخصوص تجارت سے متعلق ہے، اور اس کا نصب العین مملکت کا مفاد نہیں بلکہ حصہ داروں فائدہ اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہے، چنانچہ یہ بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے جو حکومت کے ان نیم اشتراکی بعض سے دست بردار ہونے پر پیدا ہو گی۔[۵]

اشتراکی فرائض اس کے علاوہ حکومت نے اپنے سپرد ایسے کام بھی کر رکھے ہیں جو بالکلیہ اشتراکی ہیں ی جو مجرد انفرادی اصول کے مطابق حکومت کی دسترس میں نہیں رہنے چاہئیں بلکہ افراد ہی کو انجام دینے ہئیں۔ اس زمرے میں سب سے پہلے ذرائع حمل و نقل آتے ہیں جیسے ریلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستی، ڈاک تار کا انتظام، ٹیلیفون کی نگرانی وغیرہ۔ آج کل کے زمانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کارآمد اور ضروری سائل ترقی کو حکومت اپنے حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ اکثر ممالک میں تو یہ سب حکومت کے حیطۂ اقتدار میں آگئے ں، اور بعض میں حکومت نے ان پر اپنی نگرانی ہی رکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ تمثیلاً ریلوں کو لیجئے۔ یورپ اور ہندوستان میں عام رجحان یہ ہے کہ ریلیں مملکت ہی کی ملک ہوں، چنانچہ پچھلے پانچ سال میں ہندوستان تین بڑی بڑی ریلیں، یعنی ایسٹ انڈین، گریٹ انڈین پینن سولا، اور اودھ و روہیلکھنڈ، اپنی اپنی پنیوں سے نکل کر حکومت کے قبضے میں آگئی ہیں۔ انگلستان میں اس کے برعکس ریل کی مختلف شرکتوں کو مدغم کے بڑی بڑی شرکتیں بنائی جا رہی ہیں اور حکومت ان پر براہ راست نگرانی رکھتی ہے؛ جرمنی میں ریلیں بالعموم حکومت ہی کے قبضے میں ہیں۔ ریلوں کے علاوہ ملک کے قدرتی وسائل میں ترقی کے سامان بہم پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے، چنانچہ اگر ملک میں کوئی خاص صنعت یا کسی حصۂ ملک میں زراعت میں کمی یا کم ہو تو حکومت خزانۂ سرکاری سے روپیہ خرچ کرتی ہے، کاشتکاروں کو تقاوی دیتی ہے، آبپاشی کے سامان بہم کرتی ہے اور جگہ جگہ نمونے کے کھیت اور کارخانے قائم کر کے لوگوں کو بہترین ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

سب سے آخر میں وہ فرائض ہیں جو بالخصوص مزدوروں اور غربا کے مفاد کی غرض سے حکومت پر عائد سمجھے جاتے ہیں اور یہ وہ ہیں جن پر اشتراکیت کا پرتو خاص طور پر نمایاں ہے۔ پکے انفرادی بھی اس واقعہ کا

---

۵ زمانۂ حال میں یورپ اور امریکہ کے تجارتی ارتقا کی تاریخ دراصل کاروباری جتھوں کی تاریخ ہے۔ اس کے لئے دیکھو ج، و، جنکس "کاروباری جتھوں کا مسئلہ" J. W. Jenks: The Trust Problem باب ۱۲ و ضمیمہ د

انکار نہیں کر سکتے کہ مزدوروں اور محنتیوں کی حالت عام طور پر نہایت زبوں ہے، اور وہ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ملک کی عام مرفہ الحالی میں اضافہ کرتے ہیں، انہیں اس کا صحیح معاوضہ آرام و آسائش کی شکل میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے فلاکت زدہ طبقے کی حالت سدھارنا اور مزدوروں کی آسائش کا انتظام، دونوں باہم ترقی یافتہ حکومتوں نے اپنے ذمہ کر لی ہیں، اور جبری بیمہ، وظائفِ معمرین، ارزاں آرام دہ مکانات کی تعمیر[13] قوانینِ کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے غریب اور نیچے درجہ کے طبقے کا معیارِ زندگی بڑھایا جاتا ہے۔ جبری بیمے کا قاعدہ ۱۸۸۳ء میں جرمنی میں شروع ہوا اور اس کا اتباع ۱۹۰۸ء میں انگلستان میں کیا گیا۔ وظیفۂ معمرین کا قاعدہ آسٹریلیا میں مدت سے جاری ہے، اور اس کے مطابق ہر درخواست گذار شہری کو جس کی عمر کم سے کم ۶۵ برس کی ہو اور جو کم از کم ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں رہتا ہو، اس شرط پر وظیفہ دیا جاتا ہے کہ درخواست گذار کی کل آمدنی کی مقدار گیارہ سو روپیہ سالانہ سے متجاوز نہ ہو جائے۔ آج کل کی انفرادی حکومتوں کو مزدوروں کے آرام تندرستی اور معیارِ زندگی کا اس قدر خیال ہے کہ بعض انفرادی ممالک (مثلاً انگلستان و جرمنی) میں اس کے لئے ایک وزیر مختص کر دیا گیا ہے، اور انجمنِ اقوام کے زیرِ سایہ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مختلف مملکتوں سے مزدوروں کے آرام و آسائش کی تدابیر کی سفارش کی جاتی ہے[14] اور حکومتیں حتی الامکان ان پر کاربند ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز آج کل کے اکثر متمدن ممالک میں کارخانوں اور اورگرنیوں کے مزدوروں کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار گھنٹوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ اپنے کام سے ان پر زیادہ بار نہ پڑے اور ان کی زندگی و تندرستی برقرار رہے[15]۔

اشتمالی روس پر انفرادی اثرات۔ اوپر کے پاروں میں ان اشتراکیت نما امور کو واضح کرنے کی

---

[13] اس قسم کے مکانات منجملہ دوسرے ہندوستانی شہروں کے بمبئی اور فرخندہ بنیاد حیدرآباد دکن میں بھی بنوائے گئے ہیں۔

[14] دیکھو "سالنامہ مدبرین" Statesman's Year Book ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۲ جہاں پچھلے دس سال کے اجتماعوں کی قراردادیں دی ہوئی ہیں۔

[15] کارخانوں کے متعلق ہندوستان میں جو قواعد رائج ہیں وہ قانونِ کارخانہ جات نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۱۱ء پر مبنی ہیں۔ انگلستان کے قانونِ کارخانہ جات کے لئے دیکھو ہالسبری: قوانینِ انگلستان Halsbury: Laws of England جلد ۱۴، حصہ "کارخانہ جات" Factories دفعہ ۳۲۲ و ۳۲۳ و ۳۲۴۔

کوشش کی گئی ہے جو زمانۂ حال کی انفرادی حکومتیں انجام دیتی ہیں[۵۱۵]۔ اب اس باب کے آئندہ حصہ میں اسی طرح یہ دکھایا جائیگا کہ دنیا کی واحد اشتمالیت پسند مملکت، یعنی روس، مجرد اشتمالی عقیدے سے کس قدر ہٹ گئی ہے اور وہاں کون کون سے انفرادی اصول کو اختیار کرلیا گیا ہے ہمیں اس موقع پر وہ سیاسی واقعات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئے، چنانچہ اس وقت یہ بیان کردینا بالکل کافی ہوگا کہ مارچ ۱۹۱۷ء سے آٹھ ماہ بعد تک روس میں مختلف سیاسی فریق یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے، اور اس ملک کی سیاسیات کو اُس وقت تک استقلال نصیب نہیں ہوا جب تک، نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن کے قبضے میں تمام حکومتی پرزے نہیں آگئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ انتہائی اشتمالی اصول کی ترویج کا زمانہ ہے، اشتمالی گروہ کو ایک عظیم الشان ملک اپنے تجربات کے لئے مل گیا تھا، چنانچہ ابتدا میں انہوں نے خوب دل کھول کر اپنے اصول کی ترویج کی[۵۱۶]۔ تمام اراضی ضبط کرلی گئی اور اسے کاشتکاروں میں تقسیم کردیا گیا۔ کاشتکاروں کو صرف اسی قدر پیداوار رکھنے کا حق دیا گیا جتنے کی انہیں ضرورت تھی، باقی تمام پیداوار حکومتی کھتیوں میں جمع ہونے لگی، گرنیاں۔ تماشاگاہیں، کارخانے، مختلف دھاتوں کی کانیں، ریلیں، قہوہ خانے غرض جس قدر سامانِ ضرورت و سامانِ تعیش تھا سب پر حکومت قابض ہوگئی اور اپنی طرف سے اس کا انتظام کرنے لگی۔ ۱۹۲۰ء کا زمانہ اس انتظام کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، لیکن یہی وہ دور ہے جب ملک کی پیداوار میں کمی، ضروریاتِ زندگی کی گرانی اور ملک میں عام افلاس کی کیفیت صریحًا نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس غالی اشتراکی طرزِ عمل کی وجہ سے بحران کی جو کیفیت رونما ہوئی اس کا فوری سبب ایک تو یہ تھا کہ زراعت کو ایک بڑا دھکا

---

[۵۱۵] ل، س، لاین L.S.Lyon کی کتاب موسومہ "پیشے کا انتخاب" Making a Living کے صفحات ۴۲۵ و ۵۲۴ پر دو نہایت نفیس جدول دیے گئے ہیں۔ جن میں سے اول الذکر میں ممالکِ متحدۂ امریکہ کی مرکزی حکومت کے کاروبار کو اور دوسرے میں وہاں کی ایک ریاست یعنی منے سوٹا کی حکومت کی مساعی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان جدولوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی انفرادی حکومتیں کس حد تک افراد کی بہبود کے واسطے کوشاں ہیں۔

[۵۱۶] بولشوی اصول کے ارتقا کے لئے دیکھو فارب مین: "لینن کے بعد" Farbman: After Lenin حصہ ۱ و ۲؛ نیز "رجسٹر سالانہ" Annual Register. بابت سالہائے ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۵ء۔ اس کے مختصر حالات کے لئے "پُرواقعات سال" These Eventful Years. جلد ۲، باب ۳۸ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

لگا تھا، اور زراعتی پیداوار میں قلت اور اس کی گرانی کی وجہ سے اس کے اور مصنوعاتِ دستکاری و میکانی کی قیمتوں کے مابین ایک عظیم الشان تفاوت پیدا ہوگیا تھا، ساتھ ہی اس کے سکے یعنی کاغذی روبل کی قیمت تقریبًا صفر رہ جانے سے بھی ملک کے مصائب میں گونہ اضافہ ہوا۔ بہرحال ان سب باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ طبقہ جو جدید حکومت کا گویا پشت پناہ بنا ہوا تھا (یعنی مزدور و کاشتکار) حکومت کے مخالفین میں شامل ہوگیا اور حکومت کو جبرًا و قہرًا اپنا طرزِ عمل بدل دینا پڑا۔ آخرکار سنہ ۱۹۲۱ء کے ابتدا ہی میں لینن کے خاص ایما سے "جدید معاشی طرزِ عمل" کی بنیاد پڑ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ طرزِ عمل کی اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی نظر آ رہے تھے، اور خود لینن ملک کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دسویں اشتراکی کانگریس میں لینن نے ایک زوردار تقریر میں یہ تحریک کی کہ بجائے غلّہ کے دستی کھتیوں میں جمع ہونے کے کاشتکاروں کو اس کی قیمت (یعنی دوسرے الفاظ میں ایک مقررہ لگان) ادا کرنا مناسب ہوگا، اور اپنی مقبوضہ پیداوار کے مبادلہ و انتقالِ ملکیت کا اختیار خود کاشتکار کو ہونا چاہیئے، چنانچہ ۲۱۔ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء کو یہ تحریک قانون کی شکل میں منظور ہوگئی، اور کاشتکاروں کو غلّہ منتقل کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یہی وہ قانون تھا جسے "جدید معاشی طرزِ عمل" کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک لینن کا شاید سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ اُس نے بھانپ لیا کہ عالی اشتراکی طرزِ عمل کا رواج بالکل ناممکن ہے، چنانچہ اُس نے جان بوجھ کر سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ "حضرات، ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے ریاستی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں"[1]

۵۔ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء کو ایک قدم اور بڑھایا گیا، یعنی کارخانے اور کرینیاں مختلف شرکتوں اور افراد کو ٹھیکے پر دی گئیں۔ اس کے بعد پہلے تو انجمن ہائے امدادِ باہمی کو روپیہ کام میں لانے کی اجازت دی گئی اور رفتہ رفتہ تدریج کے راستے سے جملہ رکاوٹیں اٹھا دی گئیں، چنانچہ اب روسی معاشی اصول اور انفرادی معاشی طرز میں بہت کم فرق باقی رہ گیا۔ روپیہ کی ترویج کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا از سرِ نو احیا ہوگیا، دوکانیں کھل گئیں اور از سرِ نو خرید و فروخت کی کیفیت تین سال بعد نظر آنے لگی۔ ۹۔ جولائی کو ریلوں پر سفر کرنے کا کرایہ لیا جانے لگا، پنجم اگست کو ڈاک اور تار کا محصول عائد ہوگیا، ۵ ستمبر کو پانی، بجلی اور گیس خرچ کرنے کا معاوضہ مانگا جانے لگا، ساتھ ہی کئی سال بعد ٹراموے کا کرایہ اور کپڑوں کی دھلائی لی جانے لگی۔ ستمبر اور اکتوبر میں اراضی، گودام

---

[1] لینن کی تقریر ۶ مئی سنہ ۱۹۲۱ء، دیکھو رجسٹر سالانہ Annual Register سنہ ۱۹۲۱ء صـ ۱۹۳

اور دوکانوں کے کرایہ کا طریقہ دوبارہ رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ ہر ایک چیز کی قیمت یا اجرت روس میں پہلے کی طرح ایک معمولی بات ہوگئی۔ سرمایہ داری کی طرف یہ میلان برابر جاری رہتا ہے تاآنکہ ۱۹۲۵ء میں دوازدہ سالہ پٹے کے ذریعے سے اراضی منتقل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور مزدوروں کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کرنے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی غیر ممالک کے سرمایہ کو روس کی طرف منتقل کرنے کے طرزِ عمل کی ابتدا ہوتی ہے جس کا اولین مظاہرہ یہ ہے کہ اسی سال "شرکتِ معدنیاتِ زرِ دریائے لینا" کو از سرِ نو سونے کی کانوں کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔

الغرض جہاں زمانۂ حال کی انفرادی حکومتیں انتہائی انفرادی اصول سے ہٹ کر بہت سے ایسے کام کرتی ہیں جنہیں افراد بھی آسانی سے انجام دے سکتے ہیں، وہاں روس جیسے اشتمالیت پسند ملک کو، جس میں جملہ قدیم آثارِ انفرادیت کو بالکل نابود کرکے اشتمالیوں نے گویا ایک جدید باب کی ابتدا کردی تھی، اپنے مرغوب اور چہیتے اصول سے بہت کچھ ہٹ جانا پڑا ہے۔ اگر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انفرادیت، اشتراکیت اور اشتمالیت یہ سب مملکت کے حقیقی مقاصد کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریقوں کا تعین مختلف ممالک کی تاریخ ان کی جغرافی کیفیات اور وہاں کے باشندوں کی عادات واطوار پر منحصر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا سیاسی طرزِ عمل دریافت نہیں ہوا جو یکساں جملہ ممالک پر حاوی ہو۔ وہی حکومت بہترین ثابت ہوگی جو مملکت کے مقاصد کی ترویج میں حتی الامکان کوشاں ہو، اور مملکت کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں، اس پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۸

اجارہ	Monopoly	انجمنِ اقوام	League of Nations
اجتماع	Convention	انجمنِ امدادِ باہمی	Cooperative Society
اعداد و شمار	Statistics	بقائے اصلح	Survival of the fittest
اکائی	Unit	پارہ	Paragraph

پیش کش	Benevolence	عشر	Tithe
تسجیل	Registration	غیر ملکی رسالہ	Foreign Legion
تنظیم	Organization	کاروباری جتھے	Trusts & Pools
جدید معاشی طرزِ عمل	New Economic Policy (Nep.)	کاغذِ مہور	Stamped Paper
چنگی	Excise	مبادلہ	Barter
حکیاتی	Scientific	محاصلِ وراثت	Death Duties
خمس	Fifth	محصولِ آمدنی	Income Tax
شرکت	Company	میکانی	Mechanical
شرکتِ معدنیاتِ زرِ دریائے لینا	Lena Gold Fields Company	نوادرخانہ	Museum
		وفاقی حکومت	Federal Government

شاعر

دور بہت دور، آسمانوں میں، موسمِ خزاں کے وقت بجلیاں چمک چمک کر آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں۔

آندھی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے، وہ زور زور سے سائیں سائیں کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہے اور اکثر اپنے خوفناک پروں اور طویل بازوؤں پر، دور افتادہ مسافر کی دھیمی دھیمی کراہوں اور آہ و فغاں کی دردناک صداؤں کو لئے ہوئے اڑا کرتی ہے

اور جب تمام دنیا پر ایک وحشتناک سکوت طاری ہو جاتا ہے اور رات کی تاریکی اپنا سیاہ برقعہ اُسے اُڑھا دیتی ہے تو شاعر، غمگین اور متفکر شاعر باہر آتا ہے۔ ویران، سنسان اور غیر آباد راستوں پر چلنے لگتا ہے اور اُن برائیوں پر نظر ڈالتا ہے جن کی طرف جانے کے لئے زندگی نے بہت سے دروازے کھول دیتے ہیں۔

خطرات سے مستغنی، جا بجا ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے اور ہر ظاہرہ برائی سے غافل رہتا ہے تاہم اکثر اس کا سینہ پُر دل کا مسکن بن جاتا ہے اور اکثر اس کے افسردہ رخساروں پر بڑے بڑے آنسو جمع ہو جاتے ہیں۔

آہ یہ آنسو دماغی اور روحانی تکلیف کا ثبوت ہیں، جن سے اس کا دل روز بروز زخمی ہوتا جاتا ہے اور جو اُسے اس کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

(ترجمہ)

محشر عابدی

تقاضائے وفا

گئے وہ دن کہ دل میں سوزِ غم تھا گئے وہ دن لبوں پر جب تھیں آہیں
تھی ہر دم دید کی دل میں تمنّا نظارہ جو ہمیشہ تھیں نگاہیں
کسی کی گردنِ نازک میں ہر دم محبت سے حمائل تھیں یہ باہیں
کوئی نازو ادائے جاں فزا سے بتا تا تھا مجھے جینے کی راہیں

مگر وہ عہدِ زرّیں ہو چکا ہے نہیں باقی وہ اُن کی جلوہ گاہیں
ہوئیں محروم اب کیفِ اثر سے نگاہیں! آہ وہ جادو نگاہیں!!

دماغ اب تو ہمیں بھی یہ نہیں ہے کہ ظالم گیسوؤں والوں کو چاہیں
کہاں سے آئے دل میں شوقِ سجدہ نہیں ہیں حسن ہی کی بارگاہیں
ہو رنج، اگر جانکاہ، روئیں اگر چوٹیں لگیں دل پر، کراہیں

غرض دنیا ہی اپنی اور ہے اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اُن کی نگاہیں

مگر بااین ہمہ چپکے سے کوئی یہ دل میں کہہ رہا ہے پھر بھی چاہیں
تقاضائے وفا اکبرؔ یہی ہے
محبّت ہو نہ ہو لیکن نباہیں

اکبر سروری لکھنوی

جزیرۂ جاوا

بحرِ ہند میں جزیرۂ جاوا ایک سرسبز و شاداب زمردین خطۂ زمین ہے۔ گرد و نواح کے تمام جزیروں میں یہ سب سے زیادہ زرخیز ملک ہے۔ اس جزیرے پر ڈچ قوم کی حکومت ہے اور یہ اُن کا بڑا بیش قیمت مقبوضہ ہے کوہِ آتش فشاں کا سلسلہ جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری ہے۔ اکثر پہاڑ ہمیشہ آگ برساتے رہتے ہیں۔ دریا یہاں بے شمار ہیں اور زمین کا چپہ چپہ زرخیز ہے۔ چونکہ سطحِ سمندر سے یہاں کی زمین بہت بلند ہے اس لئے باوجود خطِ استوا پر واقع ہونے کے یہاں کی آب و ہوا نہایت معتدل و خوشگوار ہے۔ جو سطحِ زمین آٹھ سو فٹ سے زیادہ بلند ہے وہاں سرد ملکوں کے پودے اور درخت پائے جاتے ہیں۔ وادیوں اور میدانوں میں مختلف قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، کافی، چاء، نیل وغیرہ۔ گنّے اور یہاں کے مخصوص مصالحوں کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ضروریاتِ زندگی اس قدر افراط کے ساتھ قدرت نے مہیا کردی ہیں کہ باوجود اس کے کہ ملک کا بیشتر حصہ اب تک جنگل ہے یہاں کی آبادی جس کا شمار دس لاکھ سے زائد ہے پچاس ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے جزیرے کا طول تقریباً چھ سو میل اور وسط میں اُس کا عرض تقریباً ساٹھ میل ہے۔

یہاں کی آبادی میں ملائے قوم کا عنصر غالب ہے، جو مغربی کوہستانی علاقہ میں سنڈین کے نام سے موسوم ہے یہ قوم اب تک غیر ملکی لوگوں میں مخلوط ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ مشرقی علاقہ میں مادوری ایک قوم آباد ہے یہ لوگ بڑے مضبوط اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں ہندو فتوحات کے زیرِ اثر وسطِ جزیرہ کی آبادی نسبتاً مہذب و متمدن ہوگئی تھی۔ اس دورِ تمدن کے آثار اب تک بکثرت شکستہ مندروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں، جن سے اُس زمانہ کی معاشرت و صنعت و فنون کا پتہ چلتا ہے، کہ یہ لوگ بھی اسی قدر ذہین اور کاریگر تھے جس قدر کہ وہ لوگ جنہوں نے اہرامِ مصری تعمیر کئے تھے۔ پندرھویں صدی میں مسلمانوں نے اس جزیرے پر حملہ کیا تھا۔ ان کے تسلط سے یہاں کے قدیم مذہب اور خصوصیاتِ ملکی پر بڑا اثر پڑا۔

یہاں کے باشندے عموماً ذہین ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور لب و لہجہ میں اور ان کی رسوم وغیرہ میں مذہبی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے پاس ان کی قدیم زبان میں جو سنسکرت سے بہت مشابہ ہے ایک مقدس کتاب

ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ادب وعلوم قدیمہ کا کچھ اَور ذخیرہ بھی اس زبان میں اب تک محفوظ ہے۔ یہاں خوشخطی کا بڑا رواج ہے۔ اہلِ جاوا کی تحریر کی خوبصورتی اور خوشنمائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ زیب وزینت، رنگ ونفاست کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعت وحرفت کشتی سازی، کاسہ گری، چرم سازی، پارچہ بافی، کشیدہ کاری، رنگ سازی ہے۔ یہ لوگ کپڑوں پر تصویریں بنانے اور ہتھیاروں اور برتنوں پر نقش ونگار بنانے میں بڑے ماہر ومشاق ہیں۔ اس کے علاوہ زراعت بھی یہاں کا مرغوب پیشہ ہے۔ کاشتکار بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔

اہلِ جاوا عموماً خوش اطوار وعافیت پسند ہوتے ہیں۔ فرمانبرداری ان کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈچ حکومت کے زیرِ اثر یہ لوگ نہایت امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں اہلِ چین، اہلِ ہند، اہلِ عرب اور دوسرے ملکوں کے لوگ بسلسلۂ تجارت وہاں آکر آباد ہوگئے ہیں اور اصلی باشندوں کے ساتھ مخلوط ہوگئے ہیں۔ کیونکہ اہلِ جاوا بہت آزادی کے ساتھ دوسری اقوام سے شادی بیاہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اہلِ چین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے یہ لوگ اپنے ملک سے اپنی عورتیں ساتھ لاتے ہیں۔

ابتدا میں جب یورپ نے یہاں نو آبادیوں کا سلسلہ قائم کیا تو سب سے پہلے پرتگالی یہاں آئے لیکن اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہاں کی سرزمین میں قدرت نے کیسے کیسے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ سولھویں صدی کے آخر میں ڈچ قوم نے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اسی درمیان میں انگریزوں کی آمد ورفت بھی شروع ہو گئی۔ لیکن ایک صدی کے بعد انگریز تو یہاں سے چلتے بنے مگر ڈچ لوگ اپنا ڈیرہ ڈالے رہے اور جنگی محاربوں کے ساتھ رفتہ رفتہ تمام ملک پر انہوں نے اپنا قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک جاوا پر انگریزوں کا تسلّط تھا لیکن صلحِ عام کے بعد انگریزوں نے یہ نوآبادی ہالینڈ کو دے دی۔ اب یہاں ہالینڈ کی دوعملی حکومت ہے کچھ تو ایسی ریاستیں ہیں جن پر ملکی شہزادے حکمران ہیں لیکن اُن کے مشیر کارِ ڈچ ریزیڈنٹ ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہر گاؤں میں ایک سردار یا سرگروہ منتخب کرلیا جاتا ہے اور وہی ان پر حکومت کرتا ہے۔ اہلِ جاوا کی طینت میں غلامی کا مادہ سرایت کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اُن کو ڈچ حکومت کی ماتحتی میں کوئی ملازمت مل جائے۔

جزیرہ جاوا میں سُربیا ایک نہایت آباد تجارتی شہر ہے اور بڑا عالی شان بندرگاہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں جزیرہ مدورا واقع ہے۔ اس بندرگاہ سے ایک ریلوے لائن سولو تک جاری ہے شہر سولو جزیرے کے

اندرونی حصے میں واقع ہے اور یہاں کا دارالحکومت ہے۔ ایک ملکی شہزادہ یہاں برائے نام بادشاہ ہے۔ ورنہ در اصل عنانِ حکومت ڈچ ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ سولو ریلوے لائن کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ جزیرے میں ہر چہار طرف یہاں سے ریلوے لائن جاری ہے۔ جزیرے کے اس حصے میں جوکجوکارتا ایک اور دارالسلطنت ہے۔ یہاں کا رئیس سلطان کے لقب سے موسوم ہے۔

یہاں اکثر شہر بارونق اور آباد ہیں ریلوں کی کثرت سے ان میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ہیں۔ دیہاتوں کی سڑکیں بہت عمدہ اور سایہ دار بنی ہوئی ہیں۔ دریاؤں پر کثرت سے پل بنائے گئے ہیں یا کشتی کے پلوں کا انتظام ہے۔ شہروں میں خوب ہل چل رہتی ہے۔ سڑکیں ہمیشہ آدمیوں سے بھری رہتی ہیں۔ لوگ طرح طرح کے رنگین اور بھڑکیلے لباس پہنے چلتے پھرتے اچھے معلوم ہوتے ہیں مردوں کی ٹوپیاں چھاتے سے ملتی جلتی پٹاری کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ چپٹی دار اور مختلف رنگوں کی بنائی جاتی ہیں۔

دیہاتوں میں کثرت سے کیلوں اور بانسوں کے کنج سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں یہاں تمام سال ہر موسم میں تخم ریزی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ فصلیں کٹتی رہتی ہیں۔ زمین کا ایک ایک بسوہ کارآمد بنا لیا گیا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ ہرے بھرے لہراتے ہوئے دھانوں کے کھیت ان پر چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پہاڑیوں کا نظارہ نہایت دلفریب و دلکش معلوم ہوتا ہے۔

موسم کی حالت تمام سال یہاں ایک سی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ بہار جیسا سماں رہتا ہے۔ اس لئے قدرتی مناظر میں ایک دائمی حسن پیدا رہتا ہے۔ قدرتی مناظر میں جس قدر رنگوں کی افراط اور گوناگونی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی اس قدر کہیں اور ہو۔ مارچ سے اکتوبر تک البتہ آسٹریلیا کے ریگستان سے خشک آندھیاں اس جزیرے کے شرقی حصہ میں کچھ دنوں کے لئے خزاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں پھر ملک سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ شاذو نادر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانی متواتر کئی کئی سال تک نہیں برستا خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور خلقِ خدا تباہ و برباد ہونے لگتی ہے۔ لیکن جیسے ہی پانی برسنا شروع ہوا تمام ملک میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ساری فضا خوشحالی اور فراغ بالی کے ترانوں سے گونج اٹھتی ہے۔ بارش عموماً سہ پہر کو ہوتی ہے۔ اور اس قدر پابندی اور التزام کے ساتھ ہوتی ہے کہ گویا کہیں بارش کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر روز وقت معینہ پر اُس کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور بادل اُٹھ کر پانی برسا جاتے ہیں۔

محمد عبدالحی

میں حیران ہوں!

میں یہ سوچتا ہوں کہ آج سے چھ سات ہزار سال پہلے جب آدم نے پہیے کو ایجاد کیا تو اُس نے کیا خیال کیا ہوگا! —— اُس نے ایک ایسے عقدہ کو حل کیا جس کے طفیل اس نے اپنے زمانے کو باربرداری، سواری اور دیگر ضروریات کے لئے بیل گاڑی جیسی کارآمد چیز دی۔ اور پھر ساتھ ہی کمہار کو چاک جیسی مفید شے مل گئی جس سے برتن اور دیگر اشیا بننے لگیں۔ چرخا بنا، آدمی کاتنے، بننے، کپڑا پہننے لگا۔ دنیا کا وہ اولین محسن جو چکّر کا موجد ہے اجس نے وہ چیز نکالی جو آج کل موٹریں، ریلیں، ہوائی جہازیں رونما ہے اپنے زمانہ کا ایڈیسن ہوگا۔ اُن دنوں لوگ اپنے آباؤاجداد سے اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر جانتے ہونگے۔ اُس وقت کے لوگ یہ کہتے ہونگے کہ اس "جدید زمانے" میں بھی لوگ کتنے جاہل ہیں کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں۔ وہ حیوانوں کے مشابہ ہیں، ان میں "ابھی تک" بربریت، بہیمیت اور سفاکی پائی جاتی ہے۔ جوان آدمی کہتے ہونگے کہ ابھی تک لڑکیاں اُن سے جھینپتی ہیں، ان سے بچتی ہیں اور محبت کو نہیں جانتیں۔ نوخیز، پختہ کاروں کو ابلہ، سٹھیایا اور بہترا کہتے ہونگے۔ لوگ تانبے، پیتل کے برتن، ہتھیار، سازوسامان اور زیورات کے استعمال میں پھولے نہ سماتے ہونگے۔ وہ ازمنۂ حجریہ کے باشندوں کو کتنا حقیر جانتے ہونگے اور بزعم خود دنیا کے افضل ترین، اشرف ترین اور افہم ترین انسان ہونگے۔

اس کے بعد زمانۂ جدیدیہ کے لوگ اور بھی مغرور، طاقتور اور لائق ہونگے۔ پیتل تانبے کے زمانوں کو وہ بہت نیچا گردانتے ہونگے۔ پچھلے لوگوں کی باتوں، قصوں اور روایتوں پر خوب ہنستے ہونگے۔ ان کے کھنڈروں اور دیگر آثار کو دیکھ کر وہ لوگ کون جانے کن کن خداؤں کی درشتی اور غیض وغضب سے تھرّاتے ہونگے۔ اُن دنوں ایسا جو بعد میں یہودہ۔ جیہوواہ (Jehovah) جوپیٹر (Jupiter) جوو (Jove) اور God بنا دنیا پر اور لوگوں کے دماغوں پر متمکن تھا۔ ان دنوں ہر خارجی طاقت ذی روح تھی، ان دنوں خدا لوگوں کے بہت نزدیک تھے اور بہت مغلوب الغضب تھے۔ وہ قہاریت، جبروت اور ہیبت سے عالم کو منظم کرتے تھے۔ ان دنوں آدم بہت پست تھا کیونکہ خداوندتا نے اور مٹا نے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ مگر لوگوں کے دل وسیع تھے کیونکہ وہ ایک خدا کا تصور اپنے باقی ماندہ خداؤں کی بے حرمتی شمار کرتے تھے۔ اِخناٹن بیچارا وہ فرعون مصر جو توحید کا

پہلا مُبلّغ تھا مصریوں کے غصّہ کا شکار ہؤا اور اپنی سلطنت تک کھو بیٹھا۔ مگر لوگ خداوندانِ عالم کی اُسی تمہد، ذلّت اور خوف سے پرستش کرتے رہے۔ آدم جب بھی اپنے زمانے کی بہترین مخلوق تھا۔

اسیریوں، بابلیوں اور کلدانیوں کی دنیا جو دجلہ و فرات کے منبع سے لے کر خلیج فارس تک لمبائی میں اور ایران سے لے کر مصر تک چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنہوں نے علم النجوم کی بنیاد ڈالی، جنہوں نے پہلے پہل قانون مرتب کئے، وہ جنہوں نے اول اول گھوڑوں کا استعمال کیا اور جنہوں نے اپنی تہذیب کو مصری پیوند دے کر حطیوں کو ورثہ میں چھوڑا، اُن کا آدم دنیا کا اکمل ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

حطّی، کریطی، ایجی اور ڈوری اقوام پے بہ پے مہذب ہوئیں، بڑی بڑی سلطنتوں کی موسس ہوئیں تمدن کی راہ میں کئی ایک قدم بڑھیں علم التعمیر میں انہوں نے رنگ رنگ کی اختراعات کیں۔ کتنی چیزیں نوریا بہتر ہوئیں علم میں، دولت میں، طاقت میں ترقی ہوئی سان دنوں جب کناسس کے محلات میں منوئی بادشاہ لڑکیوں کا ناچ اور سرکس کے کھیل دیکھا کرتے تھے، جب آدم کا دماغ ما قبل سے کئی درجہ اونچا تھا۔

یونانیوں میں آدم بہت بڑھا پھولا، ان کی تخم ریزی لوگ اب تک نہیں بھولے، ان کے آثار ابھی تک تحسین کا خراج لے رہے ہیں۔ اور معلوم نہیں ان کی آبیاری کتنی دیر تک پھل لاتی رہے گی۔ ان دنوں جب سقراط دنیا کا اجمل ترین اور اعقل ترین شخص تھا، وہ زمانہ کیا تھا؟ جب حسن کی تعظیم میں آدمی بلند ترین مقاموں تک جا پہنچا۔ جب قضا و قدر کے مسائل نے ادیبوں کو رفعت دی۔ جب فلسفی حقیقت کو بے نقاب کر رہے تھے۔ جب وطنیت کے جذبات محترم سمجھے جانے لگے، جب شہبازی اور شہامت لوگوں میں معزز اور موقر بن گئی، جب دلاور، شاعر، عالم و فلسفی ابطالِ زمان ہو گئے، جب دنیا کو غور و فکر کی عادت پڑ گئی تب آدم کا سر بادلوں سے بھی بلند ہونے لگا۔

پھر جب یونانیت پر رومیت حاوی ہوئی اور رومیت جہانگیر ہو گئی، جب زمین افواجِ روما سے لرزنے لگی، جب قیصری صولت خدائی کی دعویدار ہوئی جس وقت عیسٰی کے عاشقوں سے اُس کا تصادم ہؤا اور جب انہیں عیسائیوں نے سیرزی کبر و نخوت اور دعوائے خدائی کو خلافتِ خدائی میں تبدیل کیا اس وقت عربستان میں ایک ہیجان پیدا ہؤا اور ایک عظیم ہستی کا ظہور ہؤا جس کے نور کی کرنوں نے ازمنۂ مظلمہ کو روشن کر دیا۔ اس وقت جب عربی عظمت نے یونانی علم و فضیلت کو سینا و فارابی، ابنِ رشد اور ابنِ طفیل جیسے چار چاند لگائے، جب بغداد و قرطبہ دنیا کے مکتب تھے، ان دنوں زمانہ جدید کی بنیاد پڑی، جب لوگ اس آنے والے دور کی دھندلی

تصاویر دیکھنے لگے اس وقت آدم فضائے بسیط میں اُڑنے لگا۔

اور اب جس وقت لاسلکی کے ذریعہ سے عکاسی ہو رہی ہے اور روحانیات اور دوراحساسی کے مسائل ابعادِ ربعہ کی باریکیوں کے ساتھ ہمارے دماغوں میں کھولے جارہے ہیں، جب آدم نیچر کو تسخیر کر رہا ہے، جب ہم دس ہزار سال کی سعیِ پیہم کے جائز وارث سمجھے جاتے ہیں، جب ہم مستقبل کو جوان نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جب ہمارے خون میں حدت ہے، دل میں جوش ہے، دماغ میں بصیرت ہے اس وقت میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ میرے آباواجداد میں کوئی آج سے ہزار، دوہزار، دس ہزار سال پہلے بھی سوچ رہا ہوگا کہ وہ کتنا ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن ہے۔ وہ ماضی کی سطح سے کتنا اونچا اور اُس کی فکر کتنی رسا ہے۔

اور جب میں خیال کرتا ہوں کہ آج سے دوہزار سال بعد میری اولاد یہ سوچتی ہوگی کہ بیسویں صدی میں دنیا ابھی صغرسن تھی اور لوگ کورانہ خیالات رکھتے تھے، وہ کس قدر توہم پرست تھے ان کے ابصار وافکار کتنے طفلانہ تھے تو چالیسویں صدی کا آدم مجھے یہ کہتا سنائی دیتا ہے "میں کتنا اعلیٰ اور برتر ہوں"۔ میں یہ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں!

فیاض محمود گیلانی

---

(۱) کام میں تیزی نہیں بلکہ خوبی مدنظر رکھو کیونکہ لوگ کام کی مدت نہیں پوچھتے وہ تو عمدگی کو دیکھتے ہیں

(۲) جب اقبال آتا ہے تو خواہشیں عقل کے تابع ہوجاتی ہیں اور جب ادبار آتا ہے تو عقل خواہشوں کی مطیع ہوجاتی ہے۔

(۳) درگذر ادنیٰ کو اتنا ہی بگاڑتی ہے جتنا اعلیٰ کو بناتی ہے۔

(۴) شریف کے حملہ سے بچو جب وہ بھوکا ہو اور کمینہ سے جب وہ آسودہ ہو۔

(۵) آدمی کو جب اپنی بساط سے بڑھ کر دنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ برا ہوجاتا ہے۔

(۷) فتح شریفوں کے پاس گنہ گاروں کی سفارش ہے۔

(۸) آدمی کا دل جب مضبوط ہوتا ہے تو وہ عقل پر بھروسا کرتا ہے اور جب کمزور ہوتا ہے تو تقدیر پر۔

(۹) اپنا دل اپنی عقل کے سوا کسی کو نہ بخشو ورنہ بُرے کو اس کا مالک بناؤ گے۔

سید دبیر حسین دبیر حیدرآبادی

جامِ صہبائی

(۱)

جامِ مئے لالہ گوں کہاں سے لاؤں
درمانِ غمِ دروں کہاں سے لاؤں
ناکامیِ اضطراب غارتگرِ زیست
پیچیدگیِ سکوں کہاں سے لاؤں

(۲)

تاریکیِ شب میں روح گھبراتی ہے
پیغامِ طرب مگر سحر لاتی ہے
مستی میں پیا جو گذرتے نو آفات بھی ہے
جب سب کی گذرنے گذر جاتی ہے

(۳)

گذری ہے جگر سے زخم سہتے سہتے
زہرابِ الم سے جام پیتے پیتے
سو بار آرزو کہ وہ غم سے بھی ملے
گذران ہے بھی جھک کی جیتے جیتے

(۴)

جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں
لذت جو کشمکش و تردد میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظرِ زندگی کہ امواج میں ہے
کشتی میں نہیں سکونِ ساحل میں نہیں

اثر صہبائی

دیوار پر چہرہ

گزشتہ شام ڈیبنی کے ہاں ایک واقعہ پر مجھے اتنی خفت اٹھانی پڑی کہ اب تک میں سخت منفعل ہوں، ہاں اتنا اطمینان ہے کہ اِس انفعال میں بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے شریکِ حال ہیں،

مرگِ انبوہ جشنے دارد

فوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع جس قدر لاحاصل ہے اسی قدر دلفریب بھی ہے۔ چنانچہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا لیکن ان بیانات سے سننے والے کچھ بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ جن لوگوں سے میری شناسائی نہ تھی اُن میں مختصر سے قد و قامت کا ایک زرد رو شخص بھی تھا جو بشرے سے بہت متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص کو رڈسن وائٹ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کا بیان نہایت توجہ سے سنتا رہا لیکن اپنی زبان کو اُس نے مطلق جنبش نہ دی۔ پھر اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کے لئے ڈیبنی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو، کوئی ایسی داستان جس کا کوئی حصہ ناقابلِ توجیہ ہو!"

اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا "اچھا تو پھر سنئے مگر یہ کوئی داستان نہیں، یعنی داستان کا لفظ عرفِ عام میں جس مفہوم کا حامل سمجھا جاتا ہے اس کا اطلاق میرے بیان پر نہیں ہو سکتا۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے محض سنی سنائی باتیں بیان کی ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حقیقت افسانہ کے مقابلہ میں نہ صرف بدرجہا تحیر خیز ہوتی ہے بلکہ بدرجہا زیادہ دل آویز بھی ہوتی ہے۔ میری داستان آپ بیتی ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی سہ پہر کے وقت یہ داستان تکمیل کو پہنچی"۔

ہم نے بہ اصرار اس سے داستان شروع کرنے کی درخواست کی۔

اس نے کہا "سال یا دو سال قبل میں نے "گریٹ آرمنڈ سٹریٹ" میں ایک قدیم مکان کے چند کمرے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ سونے کے کمرے کی دیواروں پر کسی سابق کرایہ دار نے رنگ کرایا تھا لیکن چونکہ جگہ سیلی تھی اس لئے دیواروں پر جابجا رنگ کے چٹخنے سے بڑے بڑے نقش بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک، جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے ہوبہو انسانی چہرے سے مشابہ تھا اور یہ مشابہت معمول سے بہت زیادہ

تو یہی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونکا دینے والی تھی۔ صبح کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے اور بیٹھے اُٹھتے یہ چہرہ دمبدم میری آنکھوں
کے سامنے رہتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے ایک حقیقی چہرہ معلوم ہونے لگا اور میں اسے اپنا شریکِ خانہ سمجھنے لگا۔
تعجب یہ تھا کہ دیواروں پر اس قسم کے دوسرے تمام نقوش بڑھتے اور اپنی ہیئت تبدیل کرتے رہتے تھے لیکن ہمیشہ
بالکل غیر متغیر اور ہمیشہ بالکل ویسے کا ویسا رہتا۔

''اسی زمانے میں مجھ پر نزلہ اور بخار کا ایک شدید حملہ ہوا اور مرض نے کسی قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ میں
دن بھر بستر پر لیٹا مطالعہ اور سوچ بچار میں مستغرق رہتا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ انہیں دنوں وہ چہرہ
میرے دل و دماغ پر اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ مستولی ہونے لگا۔ میں اُسے روز بروز زیادہ حقیقی اور روز بروز زیادہ جاذبِ توجہ
پاتا تھا بلکہ وہ دن اور رات ہر وقت میرے خیالات پر حاوی رہتا تھا۔ ناک کی ایک نرالی وضع اور پیشانی کے ایک
مخصوص جھکاؤ کی وجہ سے اس چہرے میں انفرادیت کا امتیاز بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے ہم
ہزارہا انسانوں میں سے صاف الگ پہچان سکتے ہیں۔

صحت پانے کے بعد بھی میرے خیالات اس چہرے کی قید سے آزاد نہ ہونے پاتے۔ میں بازاروں میں اس
کے ہم صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں ایسا ایک حقیقی شخص بھی
ضرور موجود ہے اور میرا اس سے ملنا ناگزیر ہے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں اپنی اور اس کی ملاقات کو
کیوں اٹل سمجھتا تھا، مجھے صرف اتنا یقین تھا کہ کارفرمایانِ قضا و قدر نے کسی پُراسرار طریقہ سے میری اور اُس کی
ذات کو باہم وابستہ کر رکھا ہے۔ میں عام اجتماعات میں کثرت سے آنے جانے لگا۔ سیاسی مجالس، فٹ بال وغیرہ
کے مقابلوں اور ریلوے سٹیشنوں پر میری جستجو پرور نگاہیں ہر طرف دیوانہ وار پھرا کرتی تھیں —— بالخصوص صبح
کے وقت، جب مضافاتی ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ کر انسانوں کو انبوہ در انبوہ اُگل دیتی تھیں، اور پھر شام کے وقت،
جب وہ انہیں دوبارہ نگل جانے کے لیے آن موجود ہوتی تھیں۔ لیکن میری یہ تمام تگ و دو بالکل بے حاصل
ثابت ہوئی۔ یہ حقیقت اس سے قبل مجھ پر کبھی اتنی واضح طور پر نہ کھلی تھی کہ انسانی چہرے کی اس قدر کثیر التعداد
مختلف صورتیں ہیں، اور پھر اس قدر کم! کیونکہ اس اختلاف کے باوجود ہم ان کو از روئے اصطفات اتنے قلیل
التعداد گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ اُن کا شمار ہاتھوں کی انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔

''یہ جستجو میرے لیے ایک سودا بن گئی اور میں بجز اس جستجو کے دوسری ہر بات سے غافل ہو گیا۔ میں بیع بیوپار
کی منڈیوں اور عام گزرگاہوں میں لوگوں کی بھیڑ پر نظر جمائے برابر پہروں کھڑا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے

لگے ۔ ڈسکوالی کی توجہ میری طرف منعطف ہوگئی اور وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ نسوانی چہروں سے میری غلط انداز نگاہیں کوئی واسطہ نہ رکھتی تھیں ۔ بس مواد صرف مرد ہی میری نظربازی کا مرکز تھے ؟"

احساسِ کوفت کی شدت کے باعث اُس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا اور پھر اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "آخر میں نے اُسے دیکھ لیا وہ ایک ٹیکسی میں سوار تھا جو پکیڈلی میں مشرقی سمت کو جا رہی تھی ۔ میں دفعۃً مڑا اور کچھ دور تک اُس کے ساتھ بھاگا ۔ پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی ۔ میں نے ڈرائیور سے ہانپتے ہوئے کہا اس ٹیکسی کا تعاقب کرو اور خود اچھل کر اس میں سوار ہوگیا ۔ ڈرائیور نے اس ٹیکسی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا ۔ آخر ہم چیرنگ کراس پہنچے اور میں ٹیکسی سے اترتے ہی پلیٹ فارم کی طرف بھاگا ۔ وہاں میں نے اُس شخص کو دو خاتونوں اور ایک ننھی بچی کے ساتھ کھڑا پایا ۔ وہ دو بج کر بیس منٹ کی گاڑی سے فرانس کو روانہ ہونے والے تھے ۔ میں اس کے ساتھ ایک آدھ بات کرنے کا موقع پانے کے لئے اس کے قریب اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی ۔ بہت سے اور لوگ بھی اُسے رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر آپہنچے تھے اور وہ اُن کے درمیان گھرا ہوا گاڑی میں سوار ہوگیا پھر میں نے بھی جلدی سے فوکسٹن کا ٹکٹ خرید لیا ۔ مجھے امید تھی کہ وہاں جہاز کے روانہ ہونے سے قبل میں اس سے مل سکوں گا ۔ لیکن فوکسٹن میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھ سے قبل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوگیا ۔ جہاز کے اس حصے میں اُس نے متعدد کمرے اپنے لئے مخصوص کرا رکھے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی نہایت متمول شخص ہے ۔

"مجھے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس پر میں نے بھی سمندر کو عبور کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جہاز کا سفر شروع ہونے کے بعد وہ خاتونوں کو تنہا چھوڑ کر عرشے پر ٹہلنے کے لئے باہر آئے گا ۔ میرے پاس اُس وقت بولون تک صرف ایک طرف کے کرائے کی رقم تھی لیکن ان باتوں سے میرا عزم کہاں متزلزل ہونے والا تھا ۔ میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی بیٹھ کر انتظار کی ساعتیں گننے لگا ۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا لیکن چھوٹی بچی اس کے ساتھ تھی ۔ میرا دل نہایت زور سے دھڑکنے لگا ۔ مجھے اس کے چہرے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوئی تھی ۔ ایک ایک خال اور ایک ایک خط اسی دیوانے والے چہرے کا تھا ۔ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر عرشہ جہاز کے بالائی حصے پر جانے کے لئے ایک بغلی راستے کی طرف ہولیا ۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر اب بھی میں ناکام رہا تو پھر مجھے کامیابی سے ہمیشہ کے

ملئے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ ہی دیا "معاف فرمایئے میں جا رہا ہوں لیکن اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ عنایت فرمایئے۔ میں نہایت اہم وجوہ کی بنا پر آپ سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں۔"

"وہ یہ سُن کر کچھ متحیر سا رہ گیا لیکن اُس نے میری درخواست قبول کرلی چنانچہ نہایت دلجمعی کے ساتھ اُس نے جیب میں سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے میرے حوالہ کرکے خود بسرعت تمام بچّی کی معیّت میں آگے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے مجھے دیوانہ خیال کیا اور یہی زیادہ مناسب سمجھا کہ میری خواہش پوری کردی جائے۔

"میں کارڈ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کر اُسے پڑھنے کے لئے جہاز کے ایک تنہا گوشے میں چلا گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں اور میرا سر چکرانے لگا جب میں نے کارڈ پر اُس کا نام پڑھا: مسٹر آرمنڈ وال، پٹس برگ، ریاستہائے متحدۂ امریکا۔ اس کے بعد مجھے اَور کچھ یاد نہیں۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو بولون کے ایک شفاخانے میں پایا۔ وہاں میں ہفتوں خراب وخستہ حالت میں پڑا رہا اور اب مجھے وہاں سے واپس آئے بہ مشکل مہینا بھر گزرا ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔

ہم سب فرطِ حیرت سے کبھی اُس کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اس شام ہم نے جس قدر باتیں سنی تھیں وہ اس چھوٹے سے زرد رُو آدمی کی داستان کے مقابلہ میں بالکل ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے کہا "میں نے گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں واپس آکر اس امریکن کے حالات کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع کیا جس کی زندگی میں بعض پُراسرار اتفاقات نے مجھے یوں دخل انداز کردیا تھا۔ میں نے پٹس برگ میں لوگوں کو خطوط لکھے، امریکن ایڈیٹروں سے مراسلت کی اور لنڈن میں جو امریکن مقیم تھے اُن سے میل ملاقات شروع کی لیکن مجھے بجز اس کے اور کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ ایک کروڑپتی ہے اور اس کے والدین انگریز تھے جو لنڈن میں رہا کرتے تھے۔ یہ مجھے باوجود انتہائی کوشش کے معلوم نہ ہوسکا کہ لنڈن میں اُن کی جائے سکونت کس مقام میں تھی۔

مگر دوسرے صبح تک حالات بدستور رہے۔ میں رات کو معمول سے زیادہ تھکا ماندہ لیٹا تھا اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ جب میں بیدار ہوا کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ میں نے حسبِ عادت سب سے پہلے دیوار پر جو

دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل مل کر دیکھا اور خوف و ہراس سے کانپ گیا تھا۔ چہرے کے محض دھندلے سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ گزشتہ ہی شب چہرہ حسب سابق بالکل صاف صاف نظر آتا تھا بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیا ہی چاہتا ہے لیکن اب صرف ایک ہیولیٰ سا باقی رہ گیا تھا۔

میں افسردہ و سراسیمہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ صبح کے اخبارات چھپ کر بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آ چکے تھے۔ فہرستِ مضامین کے اشتہاروں میں میری نظر اس عنوان پر پڑی: "امریکن کروڑپتی کو موٹر کا حادثہ" آپ سب نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا۔ میں نے فوراً اخبار خرید لیا اور جو خبر مجھے پڑھنی چاہئے تھی پڑھی:۔ "پٹس برگ کے کروڑپتی مسٹر آرمنڈ وال متعلقین کے ساتھ ایک موٹر کار میں سپیزا سے پیسا کو جا رہے تھے کہ ان کی موٹر ایک چھکڑے سے متصادم ہو کر الٹ گئی۔ مسٹر وال کی حالت نازک ہے۔"

میں اسی سراسیمگی کی حالت میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دیوار پر چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسی حالت میں چہرہ دفعتہً بالکل غائب ہو گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضربات کی شدت کے باعث مسٹر وال غالباً ٹھیک اسی وقت جاں بحق ہو گئے تھے۔"

اس کے بعد وہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب نے فرداً فرداً مختلف کلمات سے اظہارِ تعجب کیا اور فی الواقع یہ مقامِ استعجاب تھا۔

پھر اجنبی نے کہا "مجھے اس واقعہ میں تین باتیں نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لنڈن کے ایک مکان کی دیوار کے پھٹنے سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی صورت بن گئی جو امریکا میں تھا بلکہ یہ صورت اُس شخص کی زندگی کے ساتھ نہایت گہرا ربط بھی رکھتی تھی اس واقعہ کی توجیہ سائنس سے فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کا نام بھی اسی مقام سے ایک نسبت رکھتا تھا جہاں کسی پوشیدہ قوت نے ایک عجیب و غریب طریقے سے اس کی صورت بنا دی تھی۔ یقیناً آپ کو بھی ان واقعات پر حیرت ہوئی ہوگی۔"

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا اور پھر ہم لوگوں کے درمیان فوق الفطرت مظاہر کے متعلق دوبارہ وہی بحث پہلے سے دوچند جوش و خروش کے ساتھ چھڑ گئی۔ اس اثنا میں وہ اجنبی شخص اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ ابھی وہ دروازے ہی میں پہنچا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص نے (مقامِ مسرت ہے کہ وہ میں نہیں تھا) اُس سے

اس دلچسپ واقعہ کے متعلق تیسری حیرت انگیز بات دریافت کرکے ہمیں اپنی گرماگرم بحث کے محرک کی طرف دوبارہ متوجہ کیا سپینٹن نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے تین حیرت انگیز باتیں کہی تھیں۔

اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ہاں وہ تیسری بات، میں اِسے بھول ہی رہا تھا۔ تو اس داستان کے متعلق وہ تیسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے اسے نصف ہی ساعت قبل تصنیف کیا تھا۔ لیجئے خدا حافظ"

ہوش وحواس درست ہونے کے بعد ہم نے رڈسن وائٹ کو تلاش کیا جو اس مارِ آستین کو محفل میں لے کر آیا تھا لیکن وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا۔

(ترجمہ) حامد علی خاں

دیہاتی گیت

۱۔ میری بارہ برس کی عمر میں میرے پران ناتھ پردیس گئے۔ بارہ برس کے بعد لوٹے تو باغ میں ڈیرا ڈالا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کی چال ڈھال کیسی ہے۔

۲۔ گاؤں والوں نے کہا آپ کی بیوی بڑی نیک ہے اُس کے چہرے سے روحانیت برستی ہے وہ عالی خاندان اور نہایت [illegible]

۳۔ باغ سے اٹھ کر شوہر اپنے دروازے پر آیا اور اُس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے؟

۴۔ خادمہ نے جواب دیا "مالک! آپ کی بیوی انگوٹھا دبا کر چلتی ہے۔ گھونگھٹ کاڑھ کر قدم اٹھاتی ہے وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں (ننہال۔ ددھیال اور سسرال) کی عزت کو برقرار رکھا ہے۔

۵۔ شوہر اب اپنے گھر میں داخل ہوا اُسے دیکھتے ہی ماں نے چوکی بچھا دی اور بہن پانی لے کر دوڑی۔

۶۔ اُس نے ماں سے پوچھا کہ میری بیوی کا چال چلن کیسا ہے۔ ماں نے کہا۔ بیٹا! تیری بیوی تیری محبت میں مگن ہمیشہ نیچی نظر کرکے چلتی ہے

۷۔ میرے لختِ جگر! میری بہو کا بدن تو سوکھ گیا لیکن اس کے چہرہ پر شوہر کی غیر فانی محبت چمکتی رہتی ہے۔ وہ شریف خاندان کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خاندانوں کی عزت کا خیال رکھا ہے۔

۸۔ شوہر اب اپنی خوابگاہ میں پہنچا اس کی بیوی وہاں سو رہی تھی۔ اُس نے جگا کر اُس کو چھاتی سے لگا لیا اور پوچھا کہو کیسی ہو؟ بیوی نے جواب دیا "میرے سرتاج! آپ کے بغیر نہ تو میں نے پان کھایا اور نہ چھالیا کتری۔

۹۔ آنگن تو میرے لئے بیابان جنگل اور مسحورانہ خواب خیال تھا آپ کی جدائی میں مجھے سیج کالی ناگن کی طرح کاٹتی تھی۔

اعظم کریوی

غزل

یہ کاوش باوجودِ سعیِ امکانی نہیں جاتی
محبت کی خلش دل سے بآسانی نہیں جاتی

نظر آیا تھا اک دن جلوۂ رُخ بے حجابانہ
اُسی دن سے تصوّر کی پریشانی نہیں جاتی

طلسمِ رنگ و بُو کی سب حقیقت کھُل گئی پھر بھی
سرابِ زندگی! تیری درخشانی نہیں جاتی

شعاعِ حُسن سے پھر جگمگا دے خلوتِ غم کو
دلِ ویراں کی ہیبت ناک ویرانی نہیں جاتی!

کہیں بھُولے سے حرفِ آرزو اک دن جو نکلا تھا
لبِ فریاد کی اب تک پشیمانی نہیں جاتی

غمِ جاناں اُڑا لایا ہے مجھ کو اس بلندی پر
جہاں سے حسن کی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

دکن چھوڑے زمانہ ہو گیا ذوقیؔ مگر اب تک
دلِ برباد کی آشفتہ سامانی نہیں جاتی

ذوقیؔ

نیند کا غلبہ

رات کا سناٹا ہے۔ تیرہ برس کی نوعمر ملازمہ کریمن پالنے کو آہستہ آہستہ جھلا رہی ہے اور نہایت مدھم آواز میں گنگناتی جاتی ہے۔

آ جا ری نندیا آ جا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کمرے میں ایک چھوٹی سی ہری ہری لالٹین جل رہی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک ایک سوت کی رسی بندھی ہے۔ جس پر بچے کے ننھے کپڑے، مالک کی قمیصیں اور مالکہ کی ساڑھیاں لٹک رہی ہیں۔ چھت پر روشنی کا ایک بڑا سا سبز دھبا جھلملا رہا ہے۔ پالنے کا نصف حصہ، کریمن اور الگنی کے کپڑے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں جب قندیل کی لَو جھلملانے لگتی ہے تو چھت کے سبز دھبے اور کپڑے کے سایوں میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ جنبش کرنے لگتے ہیں۔ کمرے میں گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ باورچی خانہ سے گندے پانی اور باہر جوتے کی دوکان کی بدبو اندر داخل ہو رہی ہے۔

بچہ رو رہا ہے۔ روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا ہے۔ بے دم ہو گیا ہے مگر اب بھی اس کا رونا برابر جاری ہے۔ خدا معلوم کب چپ ہوگا۔ کریمن کو نیند آ رہی ہے، اس کا سر جھک گیا ہے آنکھیں مندی جا رہی ہیں، بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ اکڑ گئی ہے، اُس کی گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے، اس میں آنکھیں کھولنے کی طاقت نہیں، اس کے ہونٹوں کی قوت سلب ہو چکی ہے، اس کی آواز لڑکھڑا رہی ہے، مگر پھر بھی وہ گنگنا رہی ہے۔

آ جا ری نندیا آ جا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چولہے سے ایک جھینگر کے بولنے کی مبہم آواز آ رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں مالک اور بیوی پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ گہوارے سے "چر چوں" "چر چوں" کی کراہ نکل رہی ہے۔ کریمن کی آواز رات کی فرحت فزا سنسناہٹ سے ہم آہنگ ہے۔ اُسے اب اپنی لوری سے اذیت پہنچ رہی ہے۔ اس سے خود اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر اسے سونا نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس کی آنکھ لگ جائے۔ مالک کی بید اس کے لئے تیار ہے۔

قندیل جھلملا رہی ہے چھت کا سبز دھبا اور کمرے کے سائے حرکت کر رہے ہیں اور خواہ مخواہ کریمن کے چہرے اور آنکھوں پر ناچ رہے ہیں۔ اس کے نیم خفتہ دماغ پر دھندلی دھندلی مبہم تصویریں صورت پذیر ہو رہی ہیں وہ آسمان

بے رنگ برنگ کے بادلوں کو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے اور بچوں کی طرح چیختے چلاتے دیکھ رہی ہے۔ لیکن ہوا چلنی شروع ہوتی ہے۔ بادل آسمان پر بکھر کر غائب ہو جاتے ہیں۔ کریمن کی نظر ایک وسیع سڑک پر پڑتی ہے جو کیچڑ اور پانی سے لبریز ہے۔ یہاں سے وہاں تک سڑک پر لدی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ بھاری بھاری بوجھ پیٹھوں پر لادے ہوئے، لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ ان کے سائے اُن کے پیچھے پیچھے ناچ رہے ہیں، ہوا کُہر آلود ہے۔ سڑک کے دونوں جانب جنگل دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے، یک بیک سڑک پر سب لوگ کیچڑ پانی میں گر پڑتے ہیں اور بالکل ساکت ہو جاتے ہیں۔ "اللہ ہائے یہ کیا ہو گیا" کریمن تعجب سے پوچھتی ہے "ہمیں نیند آ رہی ہے، ہم سوئے جا رہے ہیں" لوگ یک آواز ہو کر جواب دیتے ہیں۔ وہ سب گہری نیند میں سو جاتے ہیں اور مزے سے سوتے رہتے ہیں۔ صبح ہو جاتی ہے۔ وہ اب بھی پڑے سوتے ہیں۔ درختوں کی پھلنگیوں پر سے قسم قسم کے پرندے بچے کی طرح چیخ چیخ کر انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ......

دفعتاً اس کا سر پالنے سے ٹکرا جاتا ہے وہ چونک کر آنکھیں کھولتی ہے اور اوندھو اوندھو کر گنگنانے لگتی ہے

آ جا ری نند یا آ جا ری آ ۔۔۔۔ بابے کی آنکھوں میں گھل مل جا

کریمن ایک تنگ و تاریک کمرے میں ہے۔ اُس کا مرحوم باپ کلّن فرش پر لوٹ رہا ہے اور وہ اسے دیکھ نہیں سکتی، صرف اس کے لوٹنے اور کراہنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی ہیں۔ "ہائے ہائے میری انتڑیاں پھٹ گئیں" وہ چلاتا ہے اور شدتِ درد سے اس کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ اُس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کے دانت کٹ کٹ بج رہے ہیں گویا وہ سردی سے کانپ رہا ہے۔ اُس کی ماں اپنے مالک کو خبر کرنے گئی ہے کہ میرا خاوند مر رہا ہے۔ اسے گئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب اُسے واپس آ جانا چاہئے۔ کریمن جاگ رہی ہے اور چولہے کے پاس بیٹھی اپنے باپ کی کراہ سن رہی ہے۔

دروازے پر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوتی ہے۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اس میں سے اترتا ہے اور اندر داخل ہوتا ہے۔ اندھیرے میں وہ دکھائی نہیں دیتا۔ دروازے کی چوُل بجتی ہے اور اس کے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی ہے "کوئی چراغ تو جلاؤ" ڈاکٹر کہتا ہے

"ہائے میں مرا۔ میں مرا" ڈاکٹر کے حکم کا اس کے باپ کی کراہ جواب دیتی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں دوڑ کر چولہے کے پاس آتی ہے۔ دیاسلائی جلا کر ٹوٹے ہوئے چراغ کی تلاش کرتی ہے۔ چراغ میں تیل نہیں ہے۔ ایک لمحہ خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جیب سے ٹٹول کر دیاسلائی کی ڈبیہ نکالتا ہے۔ کمرے میں اجالا ہو جاتا ہے

"حضور میں ابھی آئی۔ ابھی آئی" کہتی ہوئی اُس کی ماں باہر چلی جاتی ہے اور چند منٹ بعد پڑوس کے گھر سے ایک موم بتی کا ٹکڑا لئے ہوئے پھر واپس آتی ہے۔

اُس کے باپ کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اس کے رخسار انگارے کی طرح سرخ ہیں وہ سب کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظریں ڈاکٹر اور دیوار دونوں کو پار کرتی ہوئی باہر کسی چیز کو دیکھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر اس کی طرف مڑتا ہے "کیا کر رہے ہو۔ کس خیال میں غرق ہو"؟ وہ پوچھتا ہے "کیا کر رہا ہوں؟" اُس کا باپ جواب دیتا ہے "مر رہا ہوں میرا وقت آگیا۔ میرا شمار اب زندوں میں نہیں ہے"۔

"خرافات مت بکو۔ میں تمہیں اچھا کر لوں گا"۔ ڈاکٹر تسلی دیتا ہے۔

"شکریہ، شکریہ حضور بہت بہت شکریہ" اس کا باپ کہتا ہے "مگر میرا وقت آگیا ہے [illegible] کر رہی ہے۔ وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے!"

پندرہ منٹ تک ڈاکٹر مریض کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی والدہ کو ایک طرف لے جا کر کہتا ہے۔

"آہ۔ بہت مشکل ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ شفاخانے چلو، وہاں ہم سب کچھ کر دیکھیں گے۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔ بہت دیر ہو گئی سب کے سب سو گئے ہوں گے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ میں رقعہ لکھے دیتا ہوں۔ کچھ سُن رہی ہو؟ ——"

"مگر بندہ پرور" اس کی ماں جواب دیتی ہے "جائیں گے کا ہے پر ہم لوگوں کے پاس سواری بھی نہیں ہے"۔

"اس کی فکر نہ کرو" ڈاکٹر کچھ سوچ کر کہتا ہے "میں تمہارے مالک سے کہتا ہوں، اس کا گھوڑا لے لینا"۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ موم بتی بجھ گئی۔ پھر وہی "آہ آہ" کی دلدوز آوازیں آ رہی ہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک گاڑی آتی ہے۔ کرمین کا باپ تیار ہو کر شفاخانے جاتا ہے۔

اب صبح کی روشنی تمام دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ماں مکان پر نہیں ہے، شفاخانے میں اُس کے باپ کی تیمارداری کر رہی ہوگی۔ کسی گھر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے اور کوئی کرمین کی آواز کے ساتھ گا رہا ہے۔

آ جا ری نندیا آ جا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

اُس کی ماں واپس آتی ہے۔ خاموشی سے بیٹھ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے۔

ٹوٹنے جانے میں بہت وقت لگ گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی خدا مغفرت کرے ——"

اُس کی ماں رو رہی ہے مگر اُسے رونے سے منع کر رہی ہے۔

"بیٹی اب رونے دھونے سے کیا ہوگا! صبر کر بیٹی صبر کر۔ تیری قسمت میں یہی لکھا تھا —— ہائے میری بچی یتیم ہوگئی" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

کریمن باہر چلی جاتی ہے اور وہاں خوب دل کھول کر روتی ہے۔ اتنے میں کوئی بڑے زور سے اس کی پیٹھ پر گھونسا مارتا ہے۔ وہ گرتی ہے، درخت کا سہارا لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہ درخت ہے نہ جنگل۔ وہ تو اس کی کٹیا! اس کا مالک اُسے تیوری چڑھائے گھور رہا ہے۔

"نامعقول، ہڈحرام کہیں کی۔ بچہ کب سے چیخ رہا ہے اور آپ پڑی خراٹے لے رہی ہے۔ ابھی میں تجھے سونے کا مزہ چکھاتا ہوں" اور بید لے کر سڑاک سڑاک دو رسید کرتا ہے۔ کریمن آنکھ ملتی ہے۔ گہوارے کو ہلاتی ہے اور سسکیاں لیتی ہوئی گاتی ہے۔

آ جا ری نندیا آ جا ری آ —— بابے کی آنکھوں میں گھل مل جا

چھت پہ روشنی کا سبز دھبا اور دیواروں پر کپڑے کے سائے پھر ناچنے لگتے ہیں۔ پھر اُس کا دماغ معطل ہونے لگتا ہے۔ اسی وسیع کیچڑ والی سڑک پر وہ پھر چل رہی ہے۔ لوگ اسی طرح میٹھی نیند میں پڑے سو رہے ہیں۔ اُس کا بھی پڑ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر اُس کی ماں اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی اور کہہ رہی ہے۔ "بیٹی شہر چلنا ہے۔ کہیں نوکری چاکری ڈھونڈیں گے۔ آخر کب تک بھوکوں مریں گے۔"

"بال بچوں کی خیر، بابا" اُس کی ماں راہگیروں سے کہتی ہے "تین دن کا فاقہ ہے۔ میری بچی بھوک سے بے دم ہو رہی ہے —— خدا کی راہ پر کچھ دو بابا ——"

اس کے جواب میں کوئی مانوس آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے "بچے کو مجھے دے" ایک لمحہ کے بعد اس آواز کی پھر تکرار ہوتی "بچے کو مجھے دے —— مار کھانے پر بھی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، امیر زادی کہیں کی۔ بچے کو چھوڑ کر بے ہوش پڑی سو رہی ہے!"

کریمن چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہے۔ کہاں کی ماں؟ کہاں کی سڑک، کہاں کے راہگیر؟ اُس کی مالکہ پالنے کے پاس کھڑی غصے سے اُس کی چوٹی کھینچ رہی ہے!

مالکہ بچے کو چمکار کر دودھ پلا رہی ہے مگر کریمن کھڑی انتظار کر رہی ہے کہ بچہ دودھ پی چکے تو مالکہ سے لے۔ کھڑکی سے اندر آنے والی ہوا اب خوشگوار ہے۔ چھت کی سبز روشنی اب زردی مائل ہوتی جا رہی ہے۔ بہت جلد اب صبح ہو جائے گی۔

"لے بچے کو" مالکہ سلوکے کے بٹن لگاتے ہوئے کہتی ہے "منع کرتی ہوں کہ بچے کو باہر گھمایا کر۔ آخر نظر لگ گئی تیرا کیا بگڑ گیا۔ تکلیف تو ہمیں ہو رہی ہے۔ بیچارہ رات بھر چلاتا رہا ہے ——"

کریمن نے بچے کو گہوارہ میں لٹا دیا ہے پھر اُسے آہستہ آہستہ ہلا کر اپنی لوری سنا رہی ہے۔ روشنی کا سبز دھبا اب بالکل غائب ہو گیا ہے۔ پکھڑوں کے سائے معدوم ہو گئے ہیں صبح کی روشنی کمرے میں آنی شروع ہو گئی ہے۔ مگر اُس کی پلکوں پر نیند کا خمار اب بھی متحرک رہا ہے۔ وہ اپنا سر پالنے پر رکھ دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سارے جسم کو جنبش دیتی ہے کہ کمبخت نیند کسی طرح تو اس کا پنڈ چھوڑے۔ مگر اُس کا سر چکرا رہا ہے۔ نیند اس کی پلکوں کو گوند کی طرح جوڑے دے رہی ہے۔ ...

"کریمن چولہا جلا" اس کے مالک کی آواز آتی ہے۔

ہاں پھر کام کاج کا وقت آ گیا۔ غریب چھوکری دوڑ کر ایک کمرے میں لکڑی لانے کے لئے جاتی ہے۔ وہ خوش ہے۔ جب انسان چلتا پھرتا ہے تو اُسے نیند سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ایک جگہ ساکت بیٹھنے سے!

وہ چولہا جلاتی ہے۔ اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح سخت نہیں ہے۔ اس میں پھر نرمی آ چلی ہے۔ اس کے سر کا چکرانا بند ہو رہا ہے۔ اس کے خیالات اب اتنے پراگندہ نہیں ہیں۔

"کریمن چائے تیار کر" اُس کی مالکہ اپنے کمرے سے آواز دیتی ہے۔ اُس نے ابھی کیتلی آگ پر نہیں رکھی کہ ایک دوسرا حکم صادر ہوتا ہے۔

"کریمن اپنے مالک کے جوتے صاف کر ڈال"

وہ زمین پر جوتے صاف کرنے کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ ایک بڑے سے جوتے میں سر ڈال کر سو جانا کس قدر آرام دہ ہوگا۔ یک لخت جوتا بڑھنا شروع ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے کمرے کے برابر ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ جاتا ہے۔ مگر فوراً وہ اپنا سر ہلاتی ہے اور سب چیزوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا شروع کرتی ہے تاکہ اُن کا بڑھنا بند ہو جائے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ناچیں۔

"کریمن، اندر بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ سیڑھیاں جھاڑ ڈال گاہک دیکھیں گے تو کیا کہیں گے" اس کی مالکہ کہہ رہی ہے۔

کریمن پھر چھلکے کو پانی سے صاف کرتی ہے کہ کیسے میں ڈال دیتی ہے پھر چولہا جلاتی ہے اور مسالہ کر دہکان ملاتی ہے۔ کام پر کام نکلتے چلے آرہے ہیں سانس تک لینے کی فرصت نہیں ہے۔

نعمت خانے میں ایک مقام پر بیٹھ کر آلو چھیلنا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس کا سر زمین میں گڑا جا رہا ہے۔ آلو اس کے سامنے شعبدہ بازکے گیندوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑتا ہے۔ مالکہ جو آستینیں چڑھائے برابر کمرے میں ٹہل رہی ہے اُسے گھور کر دیکھتی ہے اور اس زور سے چلاتی ہے کہ کریمن کے کان دیر تک گونجتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد دسترخوان بچھانا، کھانے کے وقت حاضر رہنا، برتن مانجنا، بچے کے گندے صاف کرنا اور پھر سینا پرونا بھی وبال جان ہے۔ کریمن کا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر فرش پر پڑ کر سو جائے اور کئی دن تک سوتی رہے۔

دن گذر جاتا ہے۔ شام کی تاریکی ہر شے پر مسلط ہو جاتی ہے۔ کریمن اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور خدا معلوم کیوں خود بخود مسکراتی ہے۔ شام کا دھندلکا اُس کی مخمور آنکھوں کو گہری نیند کا پیغام دیتا ہے!

رات کو اس کے مالک کے دوست احباب اور ملنے جلنے والے آتے ہیں۔ کریمن کو چائے بنانے کا حکم ملتا ہے، چھوٹی سی کیتلی ہے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ اُسے پانچ پانچ سات سات مرتبہ چائے بنانی پڑتی ہے۔ چائے کا دور ختم ہو جاتا ہے مگر کریمن وہیں کھڑی ہے۔ مالک اور اس کے دوستوں کو اس سے سو کام ہیں۔ وہ وہاں سے کیونکر ٹل سکتی ہے۔

”کریمن دوڑ کر ایک پیکٹ سگریٹ تو لیتی آ“

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوکان پر جاتی ہے۔ تیز چلنے سے شاید نیند بھاگ جائے۔ ”کریمن پان بنا کر لا۔ کریمن حقہ بھر لا۔ کریمن عبداللہ کو لیتی آ۔ کریمن یہ کر ڈال۔ کریمن وہ کر ڈال“۔ احکامات کا تانتا بندھا ہوا ہے!

لیکن اب مہمان جا چکے ہیں۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں۔ گھر میں خاموشی ہے۔ مالک اور مالکہ اپنے خانگی کمرے میں جا چکے ہیں۔ ”کریمن بچے کو جھولا جھلا“ آخری حکم مل چکا ہے۔

چولہے میں جھینگر بول رہا ہے۔ روشنی کا سبز دھبا پھر چھت پر نمودار ہے، کپڑوں کے سائے پھر اس کی آنکھوں میں ناچ رہے ہیں۔ پھر اس کا دماغ معطل ہو رہا ہے۔ پھر وہ پالنے کو ہلا ہلا کر گنگنا رہی ہے۔

آجا ری نندیا آجا ری آ   بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا

بچہ پھر چلانا شروع کرتا ہے اور روتے روتے بے خود ہو جاتا ہے۔ پھر کریمن ایک کیچڑ اور پانی سے لبریز سڑک پر اپنی ماں اور باپ کو دیکھ رہی ہے۔ سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ سب کو پہچان رہی ہے۔ مگر اس نیم بیداری نیم خواب کے عالم میں یہ

سمجھنے سے قاصر ہے کہ کونسی قوت اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالے ہوئے ہے۔ کونسی طاقت اُس کے سینہ کو پتھر سے دبائے ہوئے ہے اور اُس کی زندگی کو دوبھر کئے ہوئے ہے!

وہ نظریں پھیر کر چاروں طرف دیکھتی ہے کہ اگر اس طاقت کا پتہ چل جائے تو اس سے نکل کر بھاگ جائے یا اسے زیر کرنے کی کوشش کرے مگر اُس کی تلاش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

انتہائی اور آخری کوشش کے بعد وہ آنکھیں کھول کر سب چیزوں کو دیکھنے میں کامیاب ہوتی ہے بچے کی چیخ سنتی ہے۔ روشنی اور تاریکی کا آنکھ مچولا دیکھتی ہے اور اس روشنی اور تاریکی میں اُس دشمن کی تلاش کر لیتی ہے جو اُسے مار ڈالنے پر تلا ہوا ہے!

وہ دشمن گہوارہ میں پڑا ہوا طفلِ شیر خوار ہے!

وہ ہنستی ہے۔ اُسے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سلیس اور آسان سی بات اُس کی سمجھ میں اس سے پہلے کیوں نہ آئی۔ روشنی کا سبز دھبا کپڑوں کے سائے اور چولہے میں بولتا ہوا جھینگر سب کے سب اُس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔

اُسے پھر طلسمی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اُس کی آنکھ اسے دھوکا دینے لگتی ہے مگر اب کی بار وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ اُسے ایک خیال آچکا ہے۔ وہ خوش ہے کہ بہت جلد وہ اس سنگِ راہ سے نجات حاصل کر لے گی!

"بچے کو مار ڈال اور پھر سو جا۔ آرام سے گہری نیند میں سو جا" ہوا کی سائیں سائیں اُسے تعلیم دیتی ہے۔

کریمن ہنستی ہے۔ روشنی کے سبز دھبے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے اور دبے پاؤں جا کر پالنے پر جھک جاتی ہے۔

اور جب وہ بچے کا گلا گھونٹ چکتی ہے تو چپکے سے بلا کچھ سوچے ہوئے زمین پر دراز ہو جاتی ہے۔ اُسے ملال نہیں ہے۔ اُسے تاسف نہیں ہے۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہی ہے کہ اب وہ گہری نیند سو جانے کے لئے آزاد ہے!

اور اب وہ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت بڑی گہری نیند میں سو رہی ہے!!

(چیخوف)

سید
ممتاز اشرف
قادری

ترانۂ گویا

پوچھو نہ مری سوزشِ پنہاں کو ابھی
جلنے دو چراغِ تہِ داماں کو ابھی

دیکھا ہے گلِ چاک گریباں کو ابھی
سمجھے ہی نہ تھے رنگِ گلستاں کو ابھی

پوچھو نہ مآلِ گلِ خنداں کو ابھی
دیکھو تو ذرا رنگِ گلستاں کو ابھی

روداد چمن پھول سی! اے صبح غضب!
کیوں توڑ رہی ہے دلِ مہماں کو ابھی

توحید جبھی تک ہے کہ باقی ہے "دوئی"
رہنا ہے یونہی فرقِ دل و جاں کو ابھی

ہے دَور تو ہاتھ آئے گا جام اپنے کبھی
سمجھیں نہ برا گردشِ دوراں کو ابھی

تا صبح جسے یاد کیا ہے شبِ غم
کیا بھولیں گے اس شمعِ شبستاں کو ابھی

وہ آنکھ کہ جو منکرِ دیدار ہوئی
پہنچی ہی نہیں جلوۂ پنہاں کو ابھی

ہر اشک ہے اِک گوہرِ دریائے نظر
معلوم نہیں دیدۂ گریاں کو ابھی

اے یاس! ابھی امید ہی سے دل کی بہار
برباد نہ کر میرے گلستاں کو ابھی

اے نورِ سحر پردۂ شب چاک نہ کر
محجوب نہ کر شمعِ فروزاں کو ابھی

ایمان جبھی تک ہے کہ نادیدہ ہے وہ
پردے ہی میں رکھ حاصلِ ایماں کو ابھی

قائل ہوں اگر اس کا کہ ناظر ہے خدا
ظاہر نہ کروں میں غمِ پنہاں کو ابھی

گویاؔ ہے اسی در سے تو امیدِ نظر
رہنے دو یونہی چاکِ گریباں کو ابھی

گویاؔ جہان آبادی

دولت یا محبّت؟

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محبت کرنا روپیہ کمانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ روپیہ تو ایک احمق بھی پیدا کرسکتا ہے لیکن ایک ایسا آدمی نہایت ہی کمیاب ہے جو اپنے کلبۂ احزان میں پڑا پڑا دم توڑ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور شاید کسی کلبی ہی کو اس پر اصرار ہوگا کہ کوئی بیوقوف بھی محبت کرسکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہمیں دنیا کا شیرازہ منتشر نظر نہ آتا۔ آپ عدالت ہی میں جاکر طلاقوں کی فہرست دیکھ لیجے کہ کتنوں نے اپنی حماقت سے محبت کو مکدر کر دیا ہے۔

آلیور ہیل بران ایک کامیاب مصنف ہے جو اپنے پُرتکلف دار المطالعہ میں بیٹھا ایک ناول کے ابتدائی ابواب اپنی ٹائپسٹ جیسیکا کاکس سے لکھوا رہا ہے۔ ہیل بران اپنی عمر کے ساٹھ برس گزار چکا ہے مگر محبت کے افسانوں کا اثر ہے کہ اس کا دل ابھی جوان ہے، کامیابی کی گرمی اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی ہے اور وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے پچیس ناول لکھ ڈالتا ہے۔ اُس کے رقیب جو ابھی نوجوان ہیں اس پر غش بھی کھاتے ہیں مگر تخیل کی رسائی پر کس کا زور چلتا ہے۔

جیسیکا کاکس صرف اکیس برس کی ہے، مگر چونکہ سترہ برس کی عمر سے کمانے کا بار اُس کے سر پڑ چکا ہے اس لئے اب وہ اچھی خاصی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یتیم ہے ہمیشہ اکیلی رہی ہے اور اُس کی واقفیت بہت کم ہے۔ اُس کا جسم مختصر سا ہے مگر اُس میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت ہے، اور اس کی ایک خاص ادا ہے جو بعض اوقات اسے بے اندازہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔

ہیل بران نے کہا "میری یہ کہانی پہلی تمام کہانیوں سے مختلف رنگ رکھتی ہے"،

تجربہ کار جیسیکا نے جواب دیا "ہاں، سب مصنّف یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ میں نے جس کسی کی کتاب بھی لکھی ہے اُسے اسی زعم میں دیکھا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صدی کی بہترین کتاب ہے"

مصنف نے کہا "مگر یہ کہانی اُس مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں لوگ ختم کرنے کا خیال کر رہے ہوتے ہیں"۔

جیسیکا نے کاغذ کے صاف تختے پر موٹے حرفوں میں "پہلا باب" لکھا اور کہنے لگی "اچھا، تو میں تیار ہوں"

آپ شروع کیجئے"

ہیل بران نے کہا "افسانے کا نام ہے "نوکرانی یا محبت" ہیروئن ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تصویر کھینچنے میں میرے مدِ نظر تمہاری ذات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

جیسیکا نے رنجیدہ آواز میں جواب دیا "نہیں بالکل نہیں۔ اب مجھے ان باتوں کی کچھ عادت سی ہوگئی ہے، اور جب تک مجھے ہر جمعہ کے دن اپنی مزدوری مل جاتی ہے میں نے ایسی باتوں کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے"

"آؤ پھر لکھنا شروع کریں"

"بہت اچھا"

ہیل بران نے لکھوانا شروع کیا "دوپہر کا وقت تھا باغ میں تپتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی کا سر سونے کی طرح چمک رہا تھا سٹیفن بریسٹ نے حریص نظروں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ایک آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیا پارہ، یکایک وہ اُس کی طرف مڑا "گلوریا مجھے تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت، تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے۔ تم دنیا میں اکیلی ہو، مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو۔ گلوریا، تم مجھ سے شادی کروگی؟" "نہیں" اُس نے جواب دیا "تم مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کرسکتی"۔"

مس کاکس نے جو خاموش لکھ رہی تھی پنسل ہاتھ سے رکھ دی اور ہیل بران کی طرف دیکھنے لگی "معاف کیجئے گا لیکن آپ حقیقت سے ذرا دور چلے گئے ہیں۔ ایک لڑکی جو مجھ جیسی بے یار و مددگار ہو ——— گلوریا جیسی ——— وہ شادی کے پیغام کو اس آسانی سے رد نہیں کرسکتی۔ یہ فطرت کے خلاف ہے"

ہیل بران وقت ضائع نہیں کیا کرتا تھا مگر بولنے سے پہلے اُس نے کوئی دس سیکنڈ تک جیسیکا کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے کہا "عام طور پر محبت کے متعلق کچھ کہنے کا حق جوانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے میرا شمار اب بوڑھوں میں ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہؤا کہ محبت کی نسبت میرے خیالات کو غلط سمجھا جائے ——— گو لوگوں نے اب نئے نئے انداز اختیار کرلئے ہیں اور تہذیب بھی بہت ترقی کر گئی ہے"

جیسیکا کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

اُس نے جواب دیا "بڑھاپے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن آپ کے خیالات ضرور دقیانوسی ہیں۔ آج کل ہم لوگ زندگی کو تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ـــــ ہر شخص اور ہر چیز آج کل دنیا میں ایک مالی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ لڑکیاں محبت کی بجائے دولت پر زیادہ فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

ہیل بران نے آہستہ سے کہا "کلبیت۔"

لڑکی نے جواب دیا "کلبیت ہی تو تہذیبِ حاضر کا پروانہ ہے۔"

ہیل بران نے کہا "میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس بات کا صرف نظریاتی پہلو ہے اور عملی نکتۂ نظر سے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس زمانے کی لڑکی بھی کسی کروڑپتی سے شادی کا فیصلہ کرنے میں اُسی قدر متامل ہوگی جتنی آج سے دو پشت پہلے کی لڑکی ہوتی تھی، بجز اس کے کہ اُسے اُس سے محبت ہو۔"

"میں آپ کے اِس دعوے سے متفق نہیں جب آپ مانتے ہیں کہ نظریاتی پہلو سے میں درست کہتی ہوں تو آپ کو یہ بھی ماننا چاہیئے کہ گلوریا یقیناً سٹیفن کو بغیر کسی غور کے قبول کر لیتی۔"

ہیل بران نے پُر غرور انداز سے کہا "میرے افسانے حقیقی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے ناولوں کی بنیاد نظریوں پر ہو تو وہ بِک نہیں سکتے۔ گلوریا، جیسا میرا اُس کا ـــــ تمہارا ـــــ تصور ہے، کسی شخص سے محض اس لئے شادی کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتی کہ وہ اتفاق سے بڑا امیر ہے۔"

جیسیکا نے جواب دیا "آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ آپ مجھے اس افسانے میں گھسیٹ رہے ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی بدصورت سے بدصورت آدمی بھی شادی کرنے کو کہے تو میں انکار نہ کر سکوں بشرطیکہ اُس کے الفاظ کی پشت پر چوکھا سونا کھنکھنا رہا ہو۔"

ہیل بران نے کہا "کچھ بھی ہو تمہارا خیال غلط ہے۔"

"نہیں، غلط نہیں ـــــ کام، کام، کام ـــــ اور کس لئے؟ کیا میں اتنا کما لیتی ہوں کہ زندگی کا لطف اٹھا سکوں؟ میں آپ کو ایسی لڑکیاں دکھا سکتی ہوں جو عسرت کے مصائب سے تنگ آ کر آرام کے اُن اوقات کی حسرت دل میں رکھتی ہیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے۔"

ہیل بران نے مایوسانہ لہجہ میں کہا "دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دولت نہیں خرید سکتی۔"

جیسیکا نے کہا: "سچ ہے، مگر موجودہ حالت میں میرے پاس کیا ہے ——— حالانکہ روپیہ ہو تو ———"

"بعض ایسے انکار بھی ہو سکتے جن کا فی الحال تمہیں علم نہیں!"

جیسیکا نے ہنس کر کہا "ایک وقت میں میں ایک ہی خاوند سے شادی کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بالکل کافی ہے"

ہیل بران لڑکی کے اس سبک سرانہ طرز گفتگو پر چیں بہ جبیں ہو گیا، پھر یکایک اُس کے چہرے کی کیفیت بدل گئی، وہ اس کی طرف بڑھا اور اُس نے جیسیکا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"مس کاکس ——— جیسیکا ——— جو کچھ تم کہہ رہی ہو مجھے اس میں امید کی ایک کرن جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے ——— بے اندازہ محبت ——— تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے ——— تم دنیا میں اکیلی ہو ——— مجھے اپنی تنہائی کا مونس بنالو ——— جیسیکا، تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اُس نے یہ الفاظ نہایت پُر ارمان نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کئے، اور اُس کی آواز میں ایک غیر معمولی تڑپ تھی۔

"شادی کروں؟" جیسیکا نے گھبرا کر کہا۔ پھر بولی، "نہیں، آپ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہیں مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ سے محبت نہیں ——— ایک طرح مجھے آپ سے محبت ہے ——— مگر میں جوان ہوں اور آپ بوڑھے ہیں ——— اور ——— اور سخت . . . . . ." اور اُس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ہیل بران نے بے تاب ہو کر کہا "سٹیفن برلیسٹ بھی ایسا ہی تھا۔ چلو اب لکھو۔ کھانے سے پہلے پہلے میں افتتاحی باب ختم کرنا چاہتا ہوں۔

منصور احمد

ترجمہ

غزلیات

۱

مر کے کیا قبر میں راحت ہوگی　　آنکھ کھلتے ہی قیامت ہوگی
دل کو یہ کہہ کے تسلّی دی ہے　　بعد تکلیف کے راحت ہوگی
ذکرِ جنت ہے نہ فکرِ دوزخ　　آج واعظ کہیں دعوت ہوگی
اک نگاہِ غلط انداز سہی　　دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی
سو گئے گھر مرے آتے آتے　　نیند اُن کی مری قسمت ہوگی
اشک کس نے سرِ بالیں ٹپکائے　　میری شمعِ سرِ تربت ہوگی
وصل کی شب نہ بڑھا دو زیور　　سادگی اَور قیامت ہوگی
تم اُٹھے اور مرا دم نکلا　　تم سے پہلے مری رخصت ہوگی

گلِ معنی بھی کھلیں گے صفدرؔ
کچھ شگفتہ جو طبیعت ہوگی

صفدر مرزاپوری

۲

نشاطِ روح کو جو گا رہا ہے　　محبت کا فرشتہ گا رہا ہے
ذرا دیکھوں تو مجھ میں کیا رہا ہے　　زمانہ آئنہ دکھلا رہا ہے
سنائی آنے کی کوئی چمن سے　　دل آپی آپ بیٹھا جا رہا ہے
قفس میں آ تو یوں دنیا سمجھے　　سفر سے لوٹ کر گھر آ رہا ہے
مری فطرت مجھے رلوا رہی ہے　　زمانہ ابھی گا رہا ہے
ذرا چہرہ تو دیکھو نا خدا کا　　کوئی طوفان جیسے آ رہا ہے
بڑی جنت بھی ہے تو ہو رضی　　وگرنہ خلد میں کیا رہا ہے

[illegible]

۳

اس خزاں کو بہار ہونا تھا　　گل چراغِ مزار ہونا تھا
کشتۂ انتظار ہونا تھا　　آپ سے شرمسار ہونا تھا
حسن کی پردہ پوشیاں کب تک　　عشق کا رازدار ہونا تھا
بے نیازی نے موت کی ہارا!　　جبر پہ اختیار ہونا تھا
کیوں بھلا بیٹھے وعدۂ فردا　　حشر کیا بار بار ہونا تھا

آنکھ ساقی کی کھل چکی ہے تپشؔ
تجھ کو بھی ہوشیار ہونا تھا

عبداللطیف تپش

۴

بے اختیار چھیڑ دیا اُن کو پیار میں　　وہ کون ہے کہ جس کے ہو دل اختیار میں
بھر کر نگاہ دیکھتا اُن کو مری مجال　　پنہاں تھا آفتاب حجابِ غبار میں
میں جانتا ہوں لذتِ خمرِ وصالِ دوست　　یہ کیف وہ نہیں ہے جو ہے انتظار میں
میں اور بزمِ غیر میں جاؤں محال ہے　　یہ جرم گر ہوا تو ہوا شوقِ یار میں
جمعیتِ سکونِ دلِ مبتلا گیا　　تم کیا گئے کہ جان گئی اضطرار میں

میدانِ شاعری کے نہیں مردِ ہم شہابؔ
کچھ بات ہے کہ آ گئے اس کارزار میں

مہر محمد خان
شہاب
[illegible]

محفلِ ادب

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو تکلم کا واسطہ بنایا اور اوزاروں کے ذریعہ سے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف انہیں معدودے چند سہل المخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنہیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات وجذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن جوں جوں انسان کو آلاتِ گویائی کے استعمال میں مہارت ہوتی گئی، وہ حسبِ ضرورت انہیں چند سہل المخرج اصوات کو اونچے نیچے سروں میں ادا کر کے یا اُن میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا اُن کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کرتا گیا۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کا خیال ہے کہ شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو ادائے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو انہوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو منضبط کیا جنہیں ہم اعراب یا حرکاتِ ثلاثہ کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔ یہ تینوں آوازیں یعنی اَ اِ اُ وہی ہیں جو زمانۂ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آئی تھیں اور سہل المخرج ہونے کے سبب ہر شخص سے بآسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہو جایا کرتی تھیں یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا دریا کی موجیں، ہوا کی نہریں، گنبدوں کی گونجیں، اترنے کی سیڑھی، چڑھنے کا زینہ، اور اپنے پیاروں کو پکارنے کی ندا، ہر قسم کی صدا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، شیروں کی دھاڑ، اور بادلوں کی گرج، جھنجھیری کی جھنجھناہٹ، مگس کی تنین، قریب اور بعید کی چیزوں کے اشارے، دنیا کے ابتدائی دھندے، ان ہی تین آوازوں یعنی آ، اِ، اُ میں موجود تھے۔ اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہو جاتی تھی لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ مختلف خیالات، جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا متکلم کے منشا کو معلوم کر لینا بعید از قیاس ہے۔ ننھے بچے بھی مندرجہ بالا حرکاتِ ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل المخرج آوازیں بولتے ہیں۔ جیسے: ما، بابا، دادا، اہا وغیرہ۔ لہذا انسان بھی عہدِ رمزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرتا ہوگا۔ لیکن "عہدِ صوتی" میں ضروریات واحتیاجات، خیالات ومعلومات میں اضافہ ہو جانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی۔ چونکہ طویل مدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصۂ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشوونما ہو گئی تھی اور اُس کے ساتھ آلاتِ گویائی مثلاً ہونٹ، ناک، منہ، زبان، تالو، حلق، دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہو گئی تھی، اس لئے انسان کو ان کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت

واقع ہوئی۔ انسان نے آوازوں کو اس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملا کر، کسی کو تالو سے، کسی کو حلق سے، کسی کو زبان کی نوک سے، کسی کو ناک کی شرکت سے نکالا۔ اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں۔ پس مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا۔ لیکن روزافزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئیں۔ لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے تمام اشیا کے نام رکھے جانے لگے۔ اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اس کی مناسبت سے اسما بنائے گئے۔ کیونکہ یہ طریقہ سہل اور قدرتی بھی تھا۔ جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم، کتے کے بھونکنے کو بھوں بھوں، بلی کی بولی کو میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا۔ اسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگر، اور ٹرٹر کرنے والے کا ٹرو، بھن بھن کرنے والے بھونرا، جھر جھر بہنے والے پانی کا نام جھرنا پڑا۔ جس شے کے ساتھ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی، اس کا جو کچھ مناسب سمجھا گیا نام رکھ دیا گیا۔ اس طرح ایک معقول تعداد اسما کی تیار ہو جانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لئے یہ اصول رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیا کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اس شے کا ایک نیا نام تجویز کرنے کے بجائے اشیاءِ معلومہ کے اسما کی آمیزش سے مرکب لفظ بنا لیا جائے (مثلاً 'کنسلائی' اس سلائی کے مانند باریک کیڑے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو۔ 'کنکھجورا' اس کیڑے کا نام پڑا جو کھجور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھ جائے۔ "اجگر" (اج۔ بکرا + گر۔ نگلنے والا) اس اژدھے کو کہنے لگے جو بکرے کو نگل جائے۔ اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسما کا مجموعہ قرار پایا مثلاً شتر مرغ، گاؤمیش، فیل مرغ، شتر گاؤ پلنگ (زرافہ) وغیرہ۔ بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے۔ مثلاً 'ہاتھی' یعنی ایک ہاتھ والا جانور، سونڈ ہاتھ کی بجائے سمجھی گئی۔ 'چیتا' وہ درندہ جس کی کھال پر چتیاں ہوتی ہیں۔ 'سمندر' (سام۔ آگ + اندر۔ درمیان) اس کیڑے کا نام پڑا جو آگ میں رہے۔ بعض چیزوں کے نام ان کے افعال کے باعث رکھے گئے، مثلاً مارخور، چوہے مار، چڑی مار، نیولا (نیو یعنی بنیاد، کھودنے والا) وغیرہ۔ الغرض ان ہی اصول پر تمام اشیا کے اسما قرار دیئے گئے۔ اوپر کی تمام مثالیں فرہنگِ آصفیہ سے دی گئی ہیں۔ لیکن مندرجۂ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ابتدائی دورِ تمدن میں اشیا کے وہی نام تھے جو اوپر بیان کئے گئے اور دورِ بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا۔ محض اصول سمجھانے کے خیال سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے، جو اوپر بیان ہوئے۔ یہی وہ ابتدائی زینے تھے جن پر رفتہ رفتہ گامزن ہو کر زبان نے اعلیٰ زینے تک صعود کیا۔ واضح رہے کہ الفاظ کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی

مناسبت سے رکھے گئے ۔ مثلاً بھونکنا، گڑگڑانا، غرّانا، کھنکھنانا وغیرہ۔ جہاں قدرتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا ۔ اکثر افعال کے نام اسمائے اشیا سے بنائے گئے ۔ ہتھیانا یعنی کوئی شے ہاتھ میں لینا اور اس پر قابض ہوجانا، برفانا یعنی کسی شے میں بجلی گذارنا وغیرہ ۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی اس کے بعد اسمامیں باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کئے گئے ۔ جب اسماء افعال اور روابط مقرر ہوچکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھیر تیار ہوگیا ۔ رفتہ رفتہ اس کالبد کی مناسب عضوبندی ہوتی رہی ، یہاں تک کہ بالآخر ایک چلتا پھرتا اسڈول جسد تیار ہوگیا اور علم وفن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی ۔ تشبیہ و استعارہ کا نقاب ہٹانے سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی ، احتیاجات کے اضافے ، ضروریات کے ہجوم ، معاملات کی پیچیدگی ، زندگی کی کشاکش کے زیرِ اثر زبان صوتی ، دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی ، ذخائرِ الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں ۔ جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیائے مادی ومحسوس ومتعارف تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں مجردات کا تصور نہیں ہوتا ، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی ۔ لیکن تمدن کی ترقی اور ارتقائے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیزگی آتی گئی اور مجردات وتوصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے ۔ رفتہ رفتہ ادائے مطلب کے لئے عمدہ پیرایۂ بیان اور اظہارِ خیالات کے لئے حسنِ اسلوب کی جانب ذہن انسانی رجوع ہوا ۔ چنانچہ بمرورِ زمانہ ایک مرتب اور باقاعدہ زبان کی مستقل حیثیت قائم ہوگئی ۔ آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی گئی ۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا پچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر منجھتے ، صاف ہوتے اور گھل گھل کر سلیس ہوتے گئے ۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ سے الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر تراش خراش پاتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زبان میں شستگی ، حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی لیکن تقریری زبان میں اس حد تک ترقی ہونے پر بھی رسم الخط و طرزِ تحریر ہنوز پردۂ خفا میں تھی ۔ الفاظ وخیالات ابھی ضبطِ تحریر میں آکر پابندِ سلاسل نہیں ہوئے تھے ۔ دیوتاؤں کے بھجن ، پیشوایانِ دین کی تعلیم ، دانشمندوں کے اقوال ، راجاؤں اور سورماؤں کے کارنامے عرصۂ دراز تک محض زبانی طور پر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہے ۔

"اردو"

مشاہدات

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح — کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یوں ہی اک بیدار کن گہری خراش — ڈال دیتی ہے شبِ مہ میں پپیہے کی پکار

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفلِ صبیح
ہوگیا دل دیکھنے والوں کا شاد و باغ باغ
اور اس نرمی سے جیسے بتکدے کے طاق میں
جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ!

شب کو اکثر کھو کھلی تاریکیاں میدان کی
روح پر کرتی ہیں طاری اس طرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوئی
جس طرح کُرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں

سب سے پہلے عشق کی شب میں دلِ عشاق کو
چٹکیوں میں یوں ستاتا ہے خیالِ روئے یار
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد
کمسنی کی پھول سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار!

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
نزی "نگاہ" ہے، یا وہ "خیالِ دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز!

جوش ملیح آبادی
"نگار"

نغمۂ الفت

"مجھے اگر تو میرے "حسن" کی خاطر چاہتا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
آفتاب، شاندار حسین آفتاب سے الفت کر
اُس کی ضیا مجھ میں کہاں؟
میری "جوانی" پر اگر تو فدا ہوا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بہار کو دیکھ اس کے شباب کو ہر سال نئی بقا ہے
میری طرح اُسے فنا نہیں!
"دولت" کے لئے اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
بے بہا نایاب گوہر سمندر میں پوشیدہ ہیں
پھر تو انہیں کیوں نہیں چاہتا؟
اگر تو مجھے محض "محبت" کی خاطر چاہتا ہے
تو پیارے مجھ سے الفت رکھ!
میرا دل جو سورج سمندر اور بہار سے کم نہیں
ہمیشہ کے لئے تیرا ہے!

"نظام کالج اردو میگزین"

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہے یہ،
ایک نقیض ہے ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دونا رات چوگنا بوجھ
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اُس کی بے رنگ بے رنگی پر،
اور وہ مجھ کو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو اور سمجھتے ہو
کہ تمہارے ہٹنے بچنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکرانے کی آوازوں سے شیریں تر ہیں۔
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں۔
سنے تم نے یہ گیت؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ،
اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے۔
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے۔

"جامعہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر سورۂ فاتحہ۔ یہ کتاب علامہ محمد عبدہٗ مفتی اعظم مصر کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے۔ علامہ موصوف ایک بلند پایہ مفسر تھے اور اُن کی تصانیف تمام عالمِ اسلام میں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔ چونکہ سورۂ فاتحہ ام الکتاب ہے یعنی اس میں سارے قرآن مجید کے معارف بشکلِ اجمال موجود ہیں اس لئے علامہ عبدہٗ کی تصانیف میں اس کتاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے تنزل اور انحطاط کا سبب، اُن کی قرآن کی تعلیمات سے غفلت ہے اور اگر وہ پھر قرآن کو اپنا دستور العمل بنالیں تو اپنے شاندار ماضی کی روایات کو تازہ کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب بصیرت اور بیداری پیدا کرنے والی ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ حجم ۱۰۸ صفحات اور مجلد کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ منیجر اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۳ لاہور سے طلب فرمائیے۔

اسرار الاطبا جلد سوئم مولفہ حکیم عبدالمجید صاحب عتیقی ادیب عالم۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں آفتاب حکمت حکیم عبدالعزیز صاحب کاملؔ مرحوم کے تمام وہ مجربات ہیں جو اُن کے اپنے مطب کے لئے مایۂ ناز تھے اور دوسرے حصے میں مشہور اطبائے ہند کے معمولات درج ہیں۔ کتاب میں کل ۴۸۰ نسخے ہیں جن میں سر سے لے کر پاؤں تک کے تمام امراضِ بدن کا علاج بتایا گیا ہے۔ نسخوں کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہمیں اس فن سے واقفیت حاصل نہیں البتہ ہم اُن باکمال اطبا کے ناموں کو اس امر کی کافی ضمانت خیال کرتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں حصہ لیا ہے۔ اسرار الاطبا یقیناً ایک بیش بہا تالیف ہے۔ اور ہمیں اہلِ فن سے توقع ہے کہ وہ اس کی پوری پوری قدر کریں گے۔ حجم پونے چار سو صفحات کے قریب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے اور اطبا کی آٹھ عکسی تصویریں کتاب کی زینت ہیں۔ مجلد کی قیمت چار روپے دس آنے مقرر کی گئی ہے۔ کارپردازانِ کامل بک ڈپو لاہور سے منگائیے۔

"حکمت" ماہِ جون ۱۹۲۹ء سے یہ طبی رسالہ زبدۃ الحکما حکیم سید نوازش علی صاحب کے زیرِ ادارت مکلّف شائع ہوا ہے۔ اس میں طبِ قدیم اور تحقیقاتِ جدیدہ کے متعلق نہایت مفید اور کار آمد مضامین شائع ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ بڑے بڑے حکما کے مجرب صدری نسخے بھی درج کئے جاتے ہیں۔ اس وقت تک ہم اس کے پانچ نمبر دیکھ چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ثابت ہوگا۔ حجم ۵۰ صفحات اور سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے ہے نمونہ مفت بھیجا جاتا ہے پتہ منیجر رسالہ حکمت دار الاسرار، حویلی نتھراں والی، موچی دروازہ لاہور

آپ کی بیبیات کیلئے لاجواب تحفہ

کشیدہ کاری کی اصلی مشین

یہ وہی بے نظیر مشین ہے جس کی نسبت اخبار تہذیب نسواں میں ایک محترم خاتون اپنے مضمون کے دوران میں فرماتی ہیں کہ "یہ تو سچ ہے کہ اشتہار کی تعریف و توصیف بے بنیاد نہیں واقعی یہ ننھی سی چیز اپنی بساط سے زیادہ کارآمد ہے جو بہنیں اسکے صحیح استعمال سے واقف ہیں ضرور مجھ سے متفق ہونگی کہ آرائشی اشیا ایسی خوبصورت کاڑھی جاتی ہیں کہ کمرۂ ملاقات گویا ایک ننھا سا سدا بہار باغیچہ بن جاتا ہے جہاں باد سموم کا خوف نہ خزاں کا اندیشہ —— پردے، میزپوش، گدیاں، فوٹو فریم، سلیپر وغیرہ کے لئے یہ کاریگری لاثانی زیور ہے۔ اگر احتیاط سے زیر استعمال رکھیں تو سالہا سال تک یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں۔ بچوں کے کلوک اور فراک پر بھی خصوصاً گرم لباس پر ایک ایک چھوٹا سا پھول خوشنما معلوم ہوگا اور پرندے تو عموماً بہت خوبصورت کاڑھے جاتے ہیں"

ان الفاظ پر ہمارا کچھ اضافہ کرنا بے سود ہوگا آپ ایک مشین معہ سامان منگا کر دیکھئے دنوں میں آپ کا گھر پررونق ہو جائیگا۔

مخمل، دوسوتی اور دوسرے مناسب کپڑوں پر نہایت عمدہ بیل بوٹے نکالنے کیلئے ہماری مشین نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے جو منٹوں کا کام منٹوں میں سرانجام دیتی ہے اس کا ابھرا ہوا کام فی الحقیقت بڑا دلفریب ہوتا ہے

یہ مشین آپ کی بچیوں کے لئے ایک نہایت اچھی سہیلی ثابت ہوگی جو انہیں دنوں میں ایسی ہنرمند بنادے گی کہ لوگ حیران ہونگے

قیمت مشین و سامان متعلقہ حسب ذیل ہے

مشین درجہ اول جو بہت مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے مخملی بکس میں بند ہے چار روپے آٹھ آنے درجہ دوئم تین روپے یہ مشین بھی اچھی خاصی ہے کپڑا تاننے کا فریم مع ٹیکن قسم اعلیٰ ایک روپیہ آٹھ آنے ریشم کی گچھیاں ایک روپیہ (عہ/) فی درجن۔ کپڑے پر چھپے ہوئے نقشے آٹھ آنے فی عدد سب چیزوں کا اکٹھا محصول ڈاک ۸/

اس مکمل سیٹ کو سنبھال کر رکھنے کے لئے ہم نے ایک اعلیٰ درجہ کا پالش شدہ بکس بھی تیار کروایا ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے ہر مشین کے ہمراہ کام کا نمونہ اور مفصل ترکیب استعمال اردو اور انگریزی میں بھیجی جاتی ہے۔ نقلی مشینیں بازار میں بہت آگئی ہیں اصلی مشین کے لئے آپ صرف ہمارا پتہ یاد رکھیں ہماری فرم کی نسبت محترمہ جناب بنت ممتاز الحق صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس بھوپال رقمطراز ہیں: "تصدیق کی جاتی ہے کہ ایس احمد صاحب کے یہاں کی کشیدہ کاری کی مشین کارآمد اور پائدار ہے ہر ایک بہن اس سے مستفید ہو۔ ریشم عنبر بھی اس کارخانہ سے اچھا دستیاب ہوا۔ اخبار کا حوالہ دینے سے سکنگ کا خرچ نہیں لگے گا۔

زرنگار مخملی جوتیاں

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر نہایت عمدہ سنہرا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج اصحاب اور بیگمات کیلئے تیار کروائی گئی ہیں پہننے میں آرام دہ اور ہلکی دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور داموں کے لحاظ سے گویا مفت ہیں گھروں میں پہنئے سلیپروں کا عمدہ بدل ثابت ہوگی کہیں آنے جانے کے وقت پہنئے۔ آپکی زینت دوبالا کریں گی قیمت زنانہ سائز مخمل پر سچے سنہرے کام والی دو روپے چار آنے فی جوڑہ مردانہ سائز (مخمل یا چمڑہ پر سنہرا کام) دو روپے دس آنے فی جوڑہ پاؤں کا خاکہ فرمائش کے ساتھ آنا چاہئے۔ فرمائش میں رسالہ کا حوالہ دینے سے پیکنگ مفت۔

ملنے کا پتہ:- ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

145

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس ریڈنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ تم خود لکھکر ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے۔ آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی مدد کی ضرورت نہیں جونسی روح کو آپ چاہیں آ کر حاضر ہو کر آپکے سوالوں کا درست جواب دیگی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر اور مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے نہ ہی کسی چلہ کشی کی ضرورت۔ عالم بالا کے ملاقات معلوم کرنا گمشدہ کا پتہ لگانا چوری کا سراغ معلوم کرنا دشمن سے بدلہ لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب منشا کام نکلوانا اور دراز فاصلہ پر ایک سکنڈ میں خبر بھیجنا حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا سربند لفافوں کی عبارت پڑھنا مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں موجود ہونا لازمی ہے۔ اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معہ محصول ڈاک صرف دو روپیہ چودہ آنے لئے جائینگے۔ ہدایات مفت ارسال ہونگی اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں تحریر فرمائیں۔

کیمیکل سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

بال امرت گولیاں (ہمدرد اطفال)

بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور گھر بے رونق ہو جاتا ہے لیکن یہی ننھے نہالان تندرستی کی حالت میں ایک مسرت کو دوبالا کر دیتے ہیں جو شخص لڑکپن ہی میں بیمار ہے اسکی جوانی کیسی ہوگی اور کیا کر سکے گا اسلئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست کو طاقتور بنانے کیلئے بال امرت گولیاں کا استعمال کرا دیں۔ یہ گولیاں بچوں کی جملہ شکایتوں مثلاً دست کے آنا قے کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑنا تلی سستی کاہلی دبلاپن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت اور تندرستی چستی چالاکی حاصل ہوتی ہے۔ قیمت فی ڈبیہ جس میں سو گولیاں ہیں ایک روپیہ (عہ)

تمام مذاہب اور فرقے متفق ہوگئے

تمام مذاہب اور فرقے اسی طرح متفق ہو گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے بیان میں ذرا بھی فرق نہیں رہتا مسلمان عیسائی پنڈت مولوی پادری ان سب کی متفقہ آواز یہی ہے کہ (۱) زمانہ حال کی آب حیات ہیں (۲) اپنا ثانی نہیں رکھتیں (۳) مایوس بھی بارور ہوتے ہیں (۴) قیمت نہایت ہی کم بالکل برائے نام ہے (۵) علاوہ ازیں آتشک سوزاک گولیوں کی خوبی کی تعریف صدہا مریض تندرست ہو رہے ہیں جو بھی استعمال کرتا ہے تعریف کئے بغیر نہیں رہتا آپ بھی ضرور تجربہ کریں تھوڑے ایام میں قبض بد ہضمی خون کی خرابی اور کمی پیٹ کا درد معدہ کی کمزوری دماغ اور قوت حافظہ کی کمی وغیرہ دور ہو کر اصلی طاقت مردمی کی توانائی حاصل ہوگی قیمت [illegible] صحت و تندرستی کی نعمت خوشی کے ساتھ [illegible] دکھلانے میں سچا دوست کتاب کام شاستر بالکل مفت منگوا کر ملاحظہ فرماویں

ویدشاستری منی شنکر جی گووند رام جی جام نگر کاٹھیاواڑ

رسالہ عصمت دہلی

شریف بیگمات کے لئے ہندستان بھر کا بہترین رسالہ ہے

اسی لئے

ہندستان بھر کے تمام زنانہ رسائل و اخبارات میں سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے

عصمت ـ اکیس سال سے کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور امراء، رؤساء، و شرفاء کے طبقہ میں قابل رشک مقبولیت و وقعت حاصل کر چکا ہے اور شریف کنواری بچیوں کو آنکھ بند کر کے دیا جاتا ہے ـ

ہندوستان کے سینکڑوں، رسالوں میں صرف **عصمت** کو یہ فخر حاصل ہے کہ **علامہ راشد الخیری** مدظلہ کے گراں بہا مضامین اور افسانے قریب قریب ہر ماہ شائع کرتا ہے ـ

ہندوستان بھر میں صرف عصمت وہ رسالہ ہے جس کی مضمون نگار خواتین ہندوستان کے ہر حصہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں ـ

عصمت کے دستکاری و خانہ داری پر مفید مضامین، تمدنی معاشرتی، تعلیمی بحثیں عصمت کے سبق آموز و نتیجہ خیز افسانے ـ موثر و دلاویز نظمیں ادب اردو میں امتیازی شان رکھتی ہیں ـ

عصمت مضمون نگار خواتین کو نہایت معقول انعامات ہر سال تقسیم کرتا ہے ـ

عصمت ـ اردو کے متعدد رسالوں میں سب سے زیادہ تصاویر شائع کرتا ہے ـ

اردو کے تمام رسالوں میں صرف **عصمت** کا ٹائٹل پیج سہ رنگین بلاکوں کا نہایت خوبصورت چھپتا ہے ـ

عصمت کی اشاعت میں کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں ہوتی، نہایت پابند وقت رسالہ ہے ـ ہمیشہ ۳۰ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے ـ

عصمت اردو کے تمام زنانہ رسالوں سے زیادہ مضامین ہر ماہ شائع کرتا ہے ـ بھرتی کے مضامین اس میں درج نہیں کئے جاتے ـ

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک پیشگی صرف پانچ روپے (صر)

قسم دوم بے تصویر ـ معمولی ٹائٹل اوسط درجہ کا کاغذ ـ صرف تین روپے چھ آنہ (سے؎)

قسم خاص تمام رسالہ آرٹ کاغذ پر چھپتا ہے سالانہ چندہ دس روپے (عـــہ) فی پرچہ عہ

سالانہ خریداروں کے ساتھ رعایت

اگر اس وقت آپ عصمت کے سالانہ خریدار ہو جائیں تو آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ عصمت کا مشہور شاندار جوبلی نمبر جس کی قیمت عہ ہے آپ صرف عہ میں علاوہ محصول ڈاک حاصل کر سکتے ہیں اور سالگرہ نمبر ۲۹ء جس کی قیمت عہ ہے صرف عہ میں ـ مگر بہت کم پرچے باقی ہیں اس لئے جلدی کیجئے ـ

اردو رسائل کے خاص نمبروں میں عصمت کے خاص نمبر امتیازی شان رکھتے ہیں

مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

جوہرِ عصمت

۱۳- سبق آموز فسانے

(۱) منظلوم بیوی کا پاک جذبہ عرفان ایک شریف و معزز خاندان کا شخص بُری صحبتوں کی وجہ سے لاکھ کا گھر خاک کرکے جیلخانہ پہنچنے والا ہوتا ہے کہ مظلوم بیوی کی کوششوں سے اس طرح رہائی حاصل کرتا ہے کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں -

(۲) سھنور کی دلہن - بلوچی قوم کے مرد و عورت کے عمیق کیرکٹر ازدواج ثانی پر نہایت موثر بحث، محبت کا جواب اور انتقام بے انتہا دلاویز افسانہ -

(۳) اگلی محبتیں ہزاروں برس پہلے کے تمدن کا ایک دلچسپ مرقع شجاعت جان نثاری، دوستی، وفاداری اور سچی محبت کے حیرت انگیز ناظر

(۴) فسانہ تنویر، ملکہ تنویر کی درد و غم بھری کہانی -

(۵) بیگناہ کا قتل محبت کی چوکھٹ پر کسان لڑکی کی قربانی -

(۶) سجاوج کا کینہ - دولت و عصمت کا مقابلہ

(۷) مامون الرشید کا دربار اور ایک سچی عورت -

(۸) عدل جہانگیری - شہنشاہ جہانگیر کا انصاف -

(۹) بلبل کی شہادت (۱۰) ملکہ شہرزاد (۱۱) برقع کی منتق (۱۲) غلط فہمی (۱۳) خاتمہ بالخیر - قیمت عہ

سیلاب اشک باتصویر

۷- دردانگیز فسانے

(۱) پرستار محبت عورت کا دل وفا و محبت کے خزائن سے مالا مال ہے یہ سبق آموز افسانہ جو کٹر سے کٹر انسان کی آنکھیں نمناک کر دیگی اس کا ثبوت ہے اور بے انتہا مقبول ہوا ہے -

(۲) بلوچن کے تین رنگ ایک خوددار لڑکی کی وفاداری انتقام اور احسان کے جوہر دکھا کر محوحیرت کر دیتی ہے -

(۳) طلاق کا سفید بال میاں بیوی کے تعلقات کیا چیز ہیں خودداری اور ایثار کسے کہتے ہیں، ضمیر و ایمان کیا کام کرتا ہے اس فلسفیانہ نہایت دردانگیز افسانے سے معلوم ہوگا جس نے کتنے ہی گھر تباہی سے بچا ڈالے

(۴) حج اکبر جس سے معلوم ہوگا کہ ماں کا دل کس محبت سے لبریز ہوتا ہے اور سچی محبت کسے کہتے ہیں -

عدل گلبدن - شہنشاہ بابر کی لخت جگر شہزادی گلبدن کی شجاعت عدل و کرم احسان و عفو کے حیرت انگیز کارنامے -

بے قصور لڑکی - بے انتہا موثر افسانہ -

ثریا کا تخیل - ہر افسانے کیلئے زر کثیر صرف کرکے فوٹو بلاک کی تصاویر لگائی گئی ہیں، جو مشہور مصور مسٹر سیح نے تیار کی ہیں -

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

رواج کی چوکھٹ پر مظلوم عورتوں کی قربانیاں

مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی لکھی ہوئی دل ہلا دینے والی مندرجہ ذیل کہانیاں

محروم وراثت	رواج کی بھینٹ	اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے	میں نے کیا دیکھا
نئی دلہن	کلنگ کا ٹیکا	سوتیلی ماں کا آخری وقت	تفسیر عبادت
بیوی کی صحنک	توصیف کا خواب	شہید معاشرت	طوفان اشک

یہ وہ عبرت انگیز افسانے ہیں جن کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج چکا ہے علامہ محترم نے ان افسانوں میں جادو کیا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - ان افسانوں کے مجموعہ کا نام طوفان اشک ہے قیمت صرف عہ (ایک روپیہ)

ملنے کا پتہ:- منیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

دلی کے کھنڈروں سے ایک صدا

شاہجہاں آباد اجڑ چکا مگر اس کے کھنڈر اب تک سننے والوں کے کارنامے سناتے ہیں اور شہر کے در و دیوار اس وقت بھی اپنے ہمانوں کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں آج سے ستر سال پہلے دلی کیا تھی بادشاہ کا جلوس قلعہ معلی کی بہاریں، شاہی جھگڑے میلے تماشوں کے رنگ دربار کی کیفیت قطب صاحب کے مقبرے، پیر غیب، شاہ بڑے اور کوٹلہ کے جشن، شہر آبادی کی چہل پہل، ہندو مسلمانوں کی معاشرت رمضان عید، سلونو، سالگرہ کے تزک و احتشام، شادی بیاہ کی رسوم غرض دور گذشتہ کی بہار اگر دیکھنی ہو تو مصور غم علامہ راشد الخیری مدظلہ کی معرکتہ الارا تصنیف۔

نوبت پنج روزہ

یعنی **وداع ظفر** ملاحظہ فرمایئے جس میں آخری تاجدار مغلیہ کی پانچ نوبتیں اس قدر درد انگیز پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ خون کے آنسو رلوا دینگی پانچویں نوبت وہ ہے جب دلی نے بادشاہ کو وداع کیا غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات، مخبروں کا ظلم، مظلوموں کی حالت زار، مردوں کی بربادی، عورتوں کی تباہی، اور بادشاہ کی پیہم مصائب ناممکن ہے کہ آپ آنسو بہائے بغیر پڑھ سکیں، بادشاہ کی تصویر اور تین نادر عکسی تحریریں بھی دی گئی ہیں نوبت پنج روزہ دور حاضرہ کی مایہ ناز اردو مصنف کی بہترین تصنیف ہے اور دوسرا ایڈیشن نکل رہا ہے اگر آپ نے منگانے میں جلدی نہ کی تو یقیناً دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کاغذ لکھائی چھپائی ہر چیز نفیس قیمت صرف عہ

قسم خاص نہایت اعلیٰ درجہ کے چکنے ولایتی آرٹ کاغذ پر چھپی ہے قیمت عہ

صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی

زمانہ لٹریچر کی وہ غیر فانی کتابیں جن سے زیادہ مقبولیت کسی اردو کتاب کو گذشتہ پچاس سال میں نہیں ہوئی آٹھ سال میں پچاس ہزار سے زیادہ فروخت ہو چکی ہیں اور آج بھی مانگ کا وہی حال ہے علامہ راشد الخیری مدظلہ کی وہ بےمثل تصانیف ہیں جنہوں نے ہزاروں بگڑے ہوئے گھر بنا دیئے سینکڑوں مردوں عورتوں کو پتھر سے ہیرا جانور سے انسان کر دیا ہے ہر شخص کی تمام عمر میں ایک دفعہ تو ضرور ہی مطالعہ کرنا چاہئے اردو زبان ان کتابوں پر قیامت تک ناز کرے گی۔

صبح زندگی نیسے کے گزارے کے حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں لڑکیوں کی تربیت پر صبح زندگی سے بہتر کتاب آجتک اردو میں نہیں لکھی گئی، صبح زندگی کا ایک ایک حرف موتیوں میں تولنے کے لائق ہے۔ قیمت عہ

شام زندگی قصہ کے پیرایہ میں موثر انداز میں بتاتی ہے کہ عورت کو کیسا ہونا چاہئے مرد اور عورت یعنی میاں اور بیوی دونوں اسے پڑھیں پھر بچیوں کو پڑھائیں علاوہ مفید ہونے کے دلکش اتنی ہے کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قیمت عہ

شب زندگی صبح زندگی اور شام زندگی تیسرا حصہ اصلاح نسواں کے سلسلہ میں علامہ محترم کی سب سے بہتر تصنیف ہے جن لوگوں نے اب تک اس کا مطالعہ نہیں کیا وہ ضرور منگائیں۔ عالم بالا کی سیر، نیک و بد روحوں کا درد انگیز سبق آموز مطالعہ عہ

انگوٹھی کا راز

علامہ راشد الخیری کی مشہور تصنیف جسے حضرت مصنف نے نظر ثانی اور جدید اضافہ کر کے تیسری مرتبہ عمدہ کاغذ پر عصمت بک ایجنسی نے شائع کیا ہے انگوٹھی کا راز میں مختلف الخیال لڑکیوں کا سبق آموز افسانہ ہے جسے پڑھ کر کہیں آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں تو کہیں ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں رابعہ کا عبرت انگیز انجام اور اسلامی کی جگر خراش داستان بیر اثر کئے بغیر نہیں رہتی صفیہ کی مشکلات کو انگوٹھی کا راز اس خوبی سے حل کرتا ہے

منیجر عصمت دہلی

الزہرا

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

بنت الرسول خاتون جنت حضرت بی بی فاطمہ کی اردو زبان میں بہترین سوانح عمری تاریخ میں بیش بہا اضافہ کے علاوہ الزہرا بتاتی ہے کہ میاں بیوی کس طرح رہتے ہیں، مائیں بچوں کو کس طرح پالتی ہیں دنیا کے ساتھ دین کیونکر میسر آتا ہے واقعات اس قدر درد انگیز کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے خاتمہ پر واقعہ کربلا پر بحث۔ آٹھواں ایڈیشن قیمت عمر

اُمت کی مائیں

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

رسول اکرم صلعم کے ازواج مطہرات کے مختصر مگر مکمل حالات جو مسلمان مردوں عورتوں کو دین و دنیا میں کامیابی کا صحیح رستہ بتاتی ہے کثرت ازدواج پر اس قدر معقول بحث ہے کہ غیر مسلم بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر مسلمان خاتون کی لائبریری میں یہ کتاب ہونی ضروری ہے

قیمت صرف عمر

منازل السائرہ

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

یہ وہ مشہور تصنیف ہے جو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہے۔ جس پر مشہور اخبارات نے بڑے شاندار ریویو کئے تھے ایک لڑکی کی پیدائش سے موت تک کے تمام واقعات اس قدر دلچسپ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بار بار پڑھنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔ حصہ اول عہ دوم عمر

قیمت مکمل۔ دو روپے (عار)

بنت الوقت

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

ہماری مستورات کی موجودہ تعلیم و تربیت کا بہترین مرقع آجکل کی مہذب بیبیوں کی لاثانی تصویر، وقت کی اندھا دھند تقلید کرنیوالی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا عبرت انگیز انجام تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اس کتاب کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت صرف ۸ر (آٹھ آنہ)

سراب مغرب

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

تعلیم نسواں کے مسئلہ میں غیر مسلم ذرائع سے مستفید ہونا کہاں تک جائز ہے اس موضوع پر علامہ محترم کی معرکۃ الآرا تصنیف تقلید مغرب کے دردناک نتائج پارٹیز کا حشر فیشن جدید کا عبرت ناک انجام ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کیوجہ خاندان سادات کی بدنامی، ایسے ایسے باب ہیں کہ آنسو نکل پڑتے ہیں قیمت ۸ر

سات روحوں کے اعمالنامے

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

دنیا کے ساتھ بہترین کیرکٹر انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر بحث، اس قدر دلچسپ قصہ کہ کئی بار پڑھئے کہیں روتے روتے ہچکی بندھ جائے کہیں ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ ہندوستان میں اسلام کا انجام اور مسلمانوں کی دورِ معاشرت کے دل ہلا دینے والی تصویریں۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت ۸ر

فسانہ سعید

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

بیوہ کا نکاح ثانی اسلام کا حکم ہے مگر سعید کا دوسرا نکاح مولانا نے جس قابلیت سے بے سود ثابت کیا ہے وہ حق رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھے سعید کی جگر خراش داستان دل ہلا دیگی، سنگدل باپ نے بچی بیوہ پر ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے سوتیلے رشتوں پر نہایت سبق آموز کتاب

قیمت [illegible]

نوحۂ زندگی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

بیوہ کے نکاح ثانی پر علامہ محترم کی مشہور تصنیف رسم و رواج میں پھنسکر مسلمان کس طرح تباہ ہوئے اس کتاب سے معلوم ہوگا یہاں ایسا قبرستان ملے گا جہاں عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور عزت پر قربان ہونیوالی ماں دائیں بائیں اپنے دو معصوم بچوں کو لئے گہری نیند سو رہی ہے۔ نہایت موثر کتاب ہے۔

ساتواں ایڈیشن قیمت صرف ۱۲ر

اندلس کی شہزادی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

جس کا دوسرا نام تائید غیبی بھی ہے مسلمانوں کو بتاتی ہے سرزمین اندلس پر وہ کیا کرچکے ہیں کس طرح انہوں نے ترقی کی اور کیونکر اپنے اعمال سے فنا ہوئے قصہ بے انتہا دلچسپ کبھی آنکھ سے آنسو نکل پڑے کبھی بے ساختہ ہنسی آجائے بڑی عمر کی عورتوں اور مردوں کے لئے ہے۔

قیمت صرف ۸ر

ملنے کا پتہ: منیجر عصمت دہلی

ملنے کا پتہ: مینیجر عصمت دہلی
محصول ڈاک بذمہ خریدار
تفسیر عصمت
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
خلع اور ارتداد پر معرکۃ الآرا افسانہ
اس قدر دلچسپ قصہ کہ بار بار پڑھیے، اس قدر دردناک
کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں اس کے ساتھ اس قدر پرلطف
کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ ہر مسلمان مرد
اور ہر مسلمان عورت کو مطالعہ کرنا چاہیے اردو زبان
میں اس قدر اعلیٰ درجہ کے افسانہ بہت کم ہیں
قیمت صرف ۶/
ستونتی
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
شوہر پرستی پر نہایت دلچسپ اور سبق آموز افسانہ
فدائیان مذہبی تعلیم کے اثرات کا حال کتاب
ستونتی میں ملاحظہ فرمایئے جو اپنے اعلیٰ کیرکٹر سے آپکو
محو حیرت کر دیگی مقبولیت کی یہ کیفیت ہے کہ ہاتھوں
ہاتھ تین ایڈیشن نکل گئے نہ صرف کنواری لڑکیوں اور
شادی شدہ عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی
بہت مفید ہے۔ قیمت صرف ۸/
امین کا دم واپسیں
از علامہ راشد الخیری
شہنشاہ ہارون الرشید کے لخت جگر اور ملکہ
زبیدہ خاتون کے لعل شہزادہ امین الرشید کا
دردناک قتل اسلامی تاریخ کا ایک پردرد و دردانگیز
واقعہ ہے اس پر مصنف رقم نے قیامت توڑ دی ہے
قصہ کے پیرایہ میں مامون الرشید، زبیدہ
کے حالات لکھے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت
عمدہ دیدہ زیب ہے۔ قیمت ۴/
محصول ڈاک بذمہ خریدار
قلب حزیں
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ کے نہایت لطیف چھوٹے چھوٹے
ادبی مضامین۔ محبت کا تاج، تو، چرخی کا جوڑا، شوہر کی قبر،
گلستان ستم، ابدی زندگی، فلسفہ موت، جذبہ نسوانی، بہار شب کا
تبسم، بالو ممی۔ دم واپسیں، عالم خیال وغیرہ۔ طرز تحریر انتہا پہلا اور
سلیس کہ ایک ایک فقرہ اور ایک ایک جملہ حفظ کرنے کو جی چاہے۔
جذبات نسوانی کی ترجمانی اس کمال کے ساتھ کی گئی ہے کہ ہر فقرہ دل کے
پار ہوتا ہے۔ ان مضامین میں شاعری کی گئی ہے قیمت ۸/
گلدستہ عید
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
عید کی دعا، عید کا کرتہ، عید کی خوشی، ام جعفر کی عید، چہار عالم، ترکی لما
بچا اس ہلے کے مسلمانوں کے تہوار، کنواری بچی کی عید، دوگانی عید وغیرہ وہ
پرلطف سبق آموز افسانے اور مضامین جنکی ہندوستان بھر میں دھوم مچ چکی ہے دل اور
آنکھ اگر تمہارے پہلو میں ہے تو یہ مضامین پڑھو جن میں عید کے روز مسلمان یتیم اور لڑکی
نے عبرت کا دردانگیز پیام پہنچایا ہے، سچی محبت کسے کہتے ہیں دنیا کی کٹھن منزلیں
کس طرح طے کی جاتی ہیں۔ گلدستہ عید میں دیکھو جو ہر وقت پڑھنے سمجھنے
اور غور کرنے کی چیز ہے۔ قیمت ۱۲/
گڑیا کی سرگزشت
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
گڑیا جو دہ مرتی تو دم بھی نہ تھا فیشن اور جدت کی دلدادہ
ایک انگریزی خاتون کی زندگی کے حالات خود اسی کی زبان
انگریزی معاشرت کا نہایت کامیاب مرقع۔ یورپین
میاں بیوی کے تعلقات کا ہوبہو فوٹو نہایت دلچسپ
اور پرلطف قصہ قیمت صرف ۴/
بچہ کا کرتہ
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
ایک عاشق زار بدنصیب ماں دل کی لگی کے کارن
جوان بچے کے لئے کیسی مصیبتیں اٹھاتی ہے اور
اس محبت کا دنیا کیسا عبرت انگیز جواب دیتی
ہے اس دردانگیز افسانہ سے معلوم ہوگا۔
قیمت صرف ۴/
منازل ترقی
از علامہ راشد الخیری مدظلہ
انسان ترقی کی دھن لیڈری کے شوق اور دولت
کے نشہ میں اخلاق انسانیت اور مذہب کو تج کر
غریب لاوارثوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھاتا ہے۔
دل لشیرین و نذیر میاں بیوی کے کیرکٹر نہایت
دلچسپ ہیں۔ قیمت ۴/
ملنے کا پتہ: مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

مظلوم عورتوں کی جگر خراش صدائیں

جن سے دل درد مند تڑپ اٹھیں گے ان دردانگیز حلقوں سے بلند ہوئی جو علامہ راشد الخیری مدظلہ نے حقوق نسواں کی حمایت و حفاظت میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائیں، مظلوم حسینہ، روضۂ اقدس پر سرخاب کا دم واپسیں اسلام کا خط، فخر کے نام، التجائے قیصر، بیٹیوں کی فریاد، بچپن کی یاد، عید کا کرتہ، یتیم بچی کا تخیل وغیرہ معمولی نظمیں نہیں بے کس و مظلوم عورتوں کے دل سوز نالے۔ اس کتاب کا نام

روداد قفس ہے

اور اب پانچویں مرتبہ چھپی ہے قیمت ۱۲؍

تمغۂ شیطانی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

وہ بے نظیر مشہور افسانہ جو جنوری ۱۹۲۸ء سے عصمت میں مسلسل نکل رہا تھا اور اب کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے حضرت علامہ محترم نے اسلام کو جن سائنٹفک اصولوں پر پیش کیا ہے اردو لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی جن مسلمانوں نے سمجھ کر علامہ محترم کی کتابوں کو پڑھا ہے ان کا بیان ہے کہ اسلام ان کے دلنشین ہوگیا اور سینکڑوں گھر تباہی اور بربادی سے بچ گئے۔ تمغۂ شیطانی میں امت شیطانی کے آٹھ بے مثل کیرکٹر ہیں۔ اور ہر کیرکٹر ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کا ہو بہو فوٹو ہے افسانہ کی دلچسپی کی یہ کیفیت ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا، ناکڑے والی بہری خانصاحب، ملاجی وغیرہ کے حالات پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور درد و اثر ہر باب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا۔ ناممکن ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ تمغۂ شیطانی بے انتہا دلچسپ اور بے حد سبق آموز اور عبرت انگیز افسانہ ہے کاغذ چھپائی لکھائی اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت صرف ۱۲؍

منیجر عصمت دہلی

نانی عشو

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

علامہ محترم کا نہایت پرلطف قصہ جس کی قسطیں ابھی رسالہ عصمت میں چھپی ہی تھیں کہ تمام ملک میں ڈنکا بج گیا۔ اس قدر پرلطف قصہ کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی نانی عشو کا کیرکٹر نہایت دلفریب ہے نانی عشو کے ساتھ ایسے ہی ظرافت آمیز مگر نتیجہ خیز ۲۳ اور قصہ ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ ۳ ایڈیشن ڈیڑھ سال میں نکل چکے ہیں۔ قیمت ۱۰؍

شہید مغرب

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

۹ دردانگیز مضامین و افسانے یورپ کے مسلمانوں پر ہولناک مظالم اگر سیاسیات سے آپ کو دلچسپی ہے اگر جوش ایمانی اور حب وطنی کا دریا آپ کے سینہ میں موجزن ہے اگر آپ اردو کی چاشنی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو

شہید مغرب

کا مطالعہ کیجیے۔ کاغذ چھپائی وغیرہ عمدہ

قیمت صرف ۱۲؍

وداع خاتون

جنت مکانی محترمہ خاتون اکرم اگر ایک طرف تمام ملک کی مایہ ناز انشا پرداز تھیں جن کی ادبی قابلیت پر بڑے بڑے مرد رشک کرتے تھے۔ تو دوسری طرف بہ حیثیت عورت کے اس قدر اعلیٰ کیرکٹر کی بی بی تھیں کہ ان کے اعزا آج بھی ان کی یاد میں خون کے آنسو گرا رہے ہیں حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ نے مرحومہ کے انتقال پر جو قیامت انگیز مضامین تحریر فرمائے ہیں **وداع خاتون** کے نام سے شائع ہوئے ہیں جو بتائیں گے کہ بہو کیسے کہتے ہیں اور لڑکی شادی کے بعد کس طرح سسرال والوں کے دل فتح کرسکتی ہے۔ وداع خاتون کا ایک ایک فقرہ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آنسوؤں کی جھڑیاں نہ شروع ہو جائیں

قیمت صرف ۶؍　　محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: منیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

فخر نسوان ہند محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی کی بے مثل تصانیف

جن سے اردو لٹریچر میں گرانبہا اضافہ ہوا ہے

جمال ہمنشیں

یہ اس محترم خاتون کے دلآویز مضامین ہیں جنکی مضمون نگاری کا ہندوستان بھر میں ڈنکا بج چکا ہے جو تعلیم یافتہ خواتین کے محبوب ترین انشا پرداز تھیں جن کے فلسفیانہ خیالات نے جن کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے طرز تحریر نے بڑے بڑے قابل بزرگوں سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔

جمال ہمنشیں مندرجہ ذیل مضامین کا مجموعہ ہے

فانی زندگی	تغیرات زندگی	نیرنگی زمانہ	اجل
عالم نزع	عبرتگاہ دنیا	محرم	موسم بہار
ساون	پھول	رمضان	عید
زندگی زندہ ہستی	شمع ہدایت	کسی کی یاد	وعدہ وفائی
ہنسی مذاق	خوشی کا دن	خدا کی مصلحت	تعزیت نامہ

انڈین ڈیلی میل کی رائے: جمال ہمنشیں کی اردو صاف اور رواں ہے اور کتاب نہایت دلچسپ ہے

اخبار ہمدرد کی رائے:۔ جمال ہمنشیں کے مضامین کی عبارت بہت پختہ اور صحیح ہے۔

علیگڈھ میگزین کی رائے:۔ خاتون اکرم مرحومہ فخر نسوان ہند کا طرز بیان پر اثر اور دلنشین ہوتا تھا۔ جمال ہمنشیں قابل قدر کتاب ہے۔

مضامین کے اعتبار سے جمال ہمنشیں اردو کی چوٹی کی کتابوں میں ہے، اور خوبصورتی کے اعتبار سے بہت کم اردو کتابیں ایسی دلکش نکلینگی تمام کتاب آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ڈیڑھ سال میں تین دفعہ چھپ چکی ہے۔

قیمت صرف عہ/ — علاوہ محصولڈاک

پیکر وفا

ایک نہایت دلچسپ سبق آموز افسانہ مع دیباچہ از اڈیٹر عصمت

خاتون اکرم جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ۔

رسالہ ہمایوں کی رائے ہے پیکر وفا ایک کامیاب و مفید افسانہ ہے جس میں عورتوں کے اس احترام کو واضح کیا گیا ہے جس کی تعلیم مذہب اسلام نے ہمیں دی ہے، انداز بیان دردانگیز عبارت سادہ و شگفتہ۔

اخبار ریاست لکھتا ہے "پیکر وفا ایک نتیجہ خیز دلآویز افسانہ ہے۔ طرز بیان اس قدر صاف و دلکش کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

رسالہ حرم کی رائے ہے، پیکر وفا میں عورتوں کی وفاداری و قربانی کا بے مثل نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے

قیمت صرف آٹھ آنہ (۸/)

بچھڑی بیٹی

ایک نہایت دلچسپ افسانہ

ایک لڑکی ماں باپ سے بچھڑ جاتی ہے اس کی جدائی میں ان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ برسوں کے بعد وہ لڑکی اس طرح ملتی ہے کہ بے ساختہ جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا معترف ہونا پڑتا ہے، پلاٹ بے انتہا دلاویز طرز تحریر پر اثر و دلنشین۔

یہ افسانہ اردو کے کئی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوا ہے

قیمت صرف چھ آنہ ۶/ — علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ منیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

عصمت جوبلی نمبر کا دوسرا ایڈیشن

اردو صحافت میں ہمیشہ یادگار رہنے والا عصمت جوبلی نمبر جس کے متعلق ہندوستانی پریس کی متفقہ رائے ہے کہ اس سے بہتر شاندار اور دلچسپ مفید خاص نمبر کسی مردانہ یا زنانہ رسالہ کا شائع نہیں ہوا ختم ہو چکا تھا لیکن شائقین ادب کے اصرار پر اب دوبارہ چھپوایا گیا ہے وہی تمام مضامین ۲۵۰ صفحوں کے وہی ہیئت سادہ و رنگین ۶۰ تصاویر، جن میں ایک درجن بلاک جرمنی میں بنے ہیں، وہی کاغذ لکھائی چھپائی غرض دوسرا ایڈیشن زر کثیر خرچ کر کے اتنا ہی شاندار اور خوبصورت تیار کیا گیا ہے۔ عصمت کا جوبلی نمبر اگر آپ کے کتب خانہ میں نہیں ہے تو آپکی لائبریری یقیناً نامکمل ہے قیمت صرف عہ۔ مگر جدید خریداران عصمت سے ۸ عہ اسکے مقابلہ میں دس روپیہ بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

مسلمان لڑکیوں کیلئے کوئی مذہبی رسالہ نہ تھا

رسالہ بنات

تربیت گاہ بنات دہلی سے علامہ راشد الخیری مدظلہ نے جاری فرما کر اس کمی کو بھی پورا کر دیا اور دو سال میں ہی بنات کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب

ماہوار سے پندرہ روزہ ہوتا ہے

بنات کے دلچسپ اور مفید مضامین لڑکیاں ہی نہیں بڑی عمر کی عورتیں اور مرد بھی بڑی خوشی سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، عصمت کے علاوہ صرف یہی پرچہ ہے جس میں علامہ راشد الخیری مدظلہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں نومبر سے بنات پندرہ روزہ شائع ہوگا۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ اس چندہ میں تربیت گاہ بنات جیسی مفید درسگاہ کی نادار یتیم بچیوں کی امداد بھی شامل ہے اس لئے ہر درد مند مسلمان کو بنات منگانا چاہیئے۔ اسقدر کم چندہ میں بنات سے زیادہ مفید رسالہ ہندوستان بھر میں نہیں مل سکتا

منیجر بنات دہلی

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۹۳۶ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۶ر

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

منشی شمس الدین منیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۶۳

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر
حامد علی خاں - بی، اے
منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۶ — بابت ماہِ دسمبر ۱۹۲۹ء — نمبر ۶

تصویر:- گوئٹے اٹلی میں

سالگرہ نمبر

ہمایوں کے آٹھویں سال کا یہ آخری پرچہ ہے۔جنوری کا رسالہ سالگرہ نمبر ہوگا، اور اس تقریب پر حسب معمول وہ خاص اہتمام سے تیار کیا جائے گا۔اس کا حجم پونے دو سو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اس کیلئے بہترین اور بلند پایہ ادیبوں اور مصوروں کے مضامین و تصاویر صرف کثیر اور کاوش عظیم سے حاصل کئے گئے ہیں۔مضامین کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے کہ ہمایوں کا یہ سالگرہ نمبر گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ اور زیادہ کارآمد ہوگا۔تصویروں پر دلکش نظمیں ہونگی یعنی مصوری کی ترجمانی شاعر کے احساسات لطیف کریں گے۔

دنیا کے نئے تمدن کے متعلق ایک جامع اور مبسوط مضمون ہوگا جس میں انسان کی آئندہ رفعت و عظمت کا نقشہ پیش کیا جائے گا۔

ہمایوں کے فلک پیما نامہ نگار کے قلم سے ایک "کلیمانہ" مضمون ہوگا، جس کی ندرت اور شگفتگی کیف انگیز ہوگی

چار یا پانچ مختلف النوع افسانے ہونگے جن میں زندگی، کمال بینی، محبت اور اخلاق کے بصیرت افروز مناظر نظر آئیں گے۔

عورتوں کی زبان میں ایک پُرلطف سیر کی سرگزشت ہوگی جسے ایک مسلّمہ اور مستند اہل زبان نے لکھا ہے۔

زبان اردو کی ایک نہایت اہم تحریر پر تنقید ہوگی جو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے لاجواب ہوگی۔

دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نظمیں اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابل دید ہوں گی نظم کا حصہ خاص طور پر بلند ہوگا۔

سالگرہ نمبر میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے ادبا و شعرا جلوہ افروز ہونگے:۔

میاں عبدالعزیز، سید سلطان حیدر جوش، آغا حیدر حسن دہلوی، حکیم آزاد انصاری، مولانا جوش ملیح آبادی حضرت اصغر گونڈوی، جناب حمید احمد خاں، حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی، عاشق حسین صاحب بٹالوی، میاں عطاالرحمٰن، حضرت احسن مارہروی، جناب آثر صہبائی، جناب جگر بریلوی۔

سالگرہ نمبر نئے سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔اسے کثیر تعداد میں چھپوایا جارہا ہے اپنے دوستوں کے لئے زائد جلدوں کی فرمائشیں جلد بھجوائیے قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے سالانہ خریدار بننے والوں سے اس پرچے کی علیحدہ قیمت نہ لی جائے گی۔

منیجر

رباعیات

(۱)

آزاد بشر ہے ایک حد کے اندر
مختار ہی اپنے نیک و بد کے اندر
ممکن ہے بہشت و نار اس کی پروا
محبوب ہے گر روح جسد کے اندر

(۲)

یہ کام ہے اب کام نہ [illegible] کا
ضامن ہی آپ اپنے غم و شادی کا
کٹ جاتی ہیں ایک ایک کر کے سب بند
دنیا میں زمانہ ہے اب آزادی کا

(۳)

یہ زندگی غافل بھی ہے جاہل بھی ہے
یہ زندگی صادق بھی ہے باطل بھی ہے
وابستہ ادھر حق سے ادھر دنیا سے
یہ زندگی ناقص بھی ہے کامل بھی ہے

(۴)

کچھ کام ہیں ایسے کہ پشیماں ہوں میں
کچھ کام ہیں ایسے بھی کہ نازاں ہوں میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر
یا ناز پہ اپنے پشیماں ہوں میں

بشیر احمد

جہاں نما

امریکا میں حبشیوں کی ترقی

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انقلاب انگیز تبدیلیوں نے جہاں ممالکِ متحدہ امریکا کو اقوامِ عالم کی سب سے اگلی صف میں لاکھڑا کیا وہاں حبشیوں کے لئے بھی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اب حبشی خوش بختی کے دور میں داخل ہو چکا ہے اور جلد جلد حیاتِ ملیہ کا ایک جزو شمار ہو رہا۔

آج سے بیس سال قبل اُسے ملک کی ترقی کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، ایک ابدی و ازلی ذلیل ہستی جسے امریکی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اُس وقت اُسے بھی اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ اُسے اپنی ذلت کا پورا یقین تھا اور اسے خیال تک نہ تھا کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے وہ اپنے پراگندہ شیرازے کو منظم کرسکتا ہے۔ اُس زمانے کی سائنس اُسے ادنیٰ قسم کا انسان شمار کرتی تھی۔ اس پر صرف حبشی کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اُس کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لوگ ہر ہفتہ تین حبشی ہلاک کر دیتے تھے۔ اُن کے مال واملاک چھین لئے جاتے تھے جنوبی علاقوں میں نوواردوں نے حبشیوں سے وہ کام چھین لئے جو نسلاً بعد نسلٍ شمالی علاقوں میں انہیں کے قبضے میں چلے آتے تھے۔ اُن ابتدائی صنعتوں میں جنہوں نے امریکا کا مرتبہ بلند کیا حبشیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ بہت کم حبشی کالجوں میں تعلیم پاتے تھے اور بہت کم حبشی تعلیم یافتہ پیشوں میں تھے۔ حبشی ادب بالکل موجود نہ تھا چیسٹ نٹ اور ڈنبار جیسے مصنفین مستثنیات میں سے سمجھے جاتے تھے۔ جنوب میں حبشیوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ سیاست دانوں کو پختہ یقین تھا کہ حبشی تپِ دق، جرم اور کمزوری کی وجہ سے بالکل نابود ہو جائیں گے۔

آج حبشی ایک زبردست اور منظم قوم ہے جو اپنے حقوق کی خود حفاظت کرسکتی ہے، اپنی ترقی کے لئے راستہ صاف کرسکتی ہے اور اپنی ضروریات کو مہیا کرسکتی ہے۔ اب وہ اپنی نسل پر نازاں ہیں۔ اب سائنس بھی اُن کا ہمنوا ہے اور کہتا ہے کہ اُن کی پستی کا کوئی ثبوت نہیں اور امریکی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان میں ہر طرح کی اہلیت موجود ہے۔ اب گورے اور کالے سکولوں میں حبشی تاریخ پڑھائی جاتی ہے افریقہ کے حبشی تمدن کی اب قدر سمجھ آچلی ہے اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے۔ حبشیوں کے قتل کے واقعات ۱۹۲۵ء میں صرف گیارہ تک رہ گئے۔ اب بہت سے شہروں میں حبشی ارکانِ کونسل موجود ہیں۔ وہ رکنِ مجلس قانون ساز ہیں، بلکہ ملکی کانگرس

میں بھی ان کا ایک رکن موجود ہے۔ دس ہزار حبشی ہر سال امریکن کالجوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ ان کے ۴۵ ہزار معلم ہیں جن میں سے ۴ اسو اعلیٰ تعلیمی مراکز میں ہیں۔ حبشی ناول نویس، مضمون نگار اور شاعر امریکا کے ادب میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ جارج کاروور اور ارنسٹ جسٹ بہت بڑے سائنس والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۲۵۰۰ سو حبشی ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ ایک ہزار سے زائد حبشی وکیل ہیں جن میں سے کئی جج ہیں اور دونوں نسلوں میں دادِ انصاف دے رہے ہیں۔

حبشیوں کے جلد نابود ہو جانے کے متعلق تمام پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے دوسروں کے مقابلہ میں ان کی موت میں اک نمایاں کمی واقع ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان صرف تپِ دق کی اموات میں ۴۲ فی صدی کمی واقع ہوگئی ہے۔ حبشیوں کی رفتارِ پیدائش اس وقت وہی ہے جو آج سے ۳۰ سال قبل گوری قوم کی تھی اور جو کئی یورپین ممالک سے زیادہ ہے۔ عام تعلیم، بہتر اقتصادی حالت اور بہتر صحت کی وجہ سے اس میں اور بھی ترقی ہو رہی ہے۔

گذشتہ بیس سال میں حبشی ترقی کی راہ میں بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن بعض مشکلات اب تک اُن کے راستے میں حائل ہیں۔ ابھی اُن کو بہت طویل راستہ طے کرنا ہے لیکن وہ صحیح راستے پر گامزن ہیں اور پچھلے بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ بہت جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

ٹالسٹائی کس طرح مرا

اخبار "لونگ ایج" لکھتا ہے کہ سوویٹ حکومت ایسی تحریریں نہایت سرگرمی سے شائع کر رہی ہے جن سے کونٹ ٹالسٹائی کے عہد اور اس کی شخصیت پر کوئی نئی روشنی پڑتی ہو، شاید اس لئے کہ لینن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جنگ اور امن" دنیا کی بہترین تصنیف ہے۔ ان تحریروں میں سے آخری وہ تاروں کا مجموعہ ہے جو اسٹاپوود کے مقام سے بھیجے گئے جہاں ٹالسٹائی کا انتقال ہوا۔ ذیل کی سطور ہم اس اخبار سے نقل کرتے ہیں:۔

اواخر اکتوبر ۱۹۱۰ء میں معمر کونٹ نے اپنے گھر کو چھوڑا اسے خیال تھا کہ اس کی نقل و حرکت بالکل پوشیدہ ہے لیکن حقیقت میں پولیس اُس کے ساتھ تھی جو اُس کے تمام حالات سے اُس کی بیوی کو خبردار رکھتی تھی۔ اُس نے ڈان سے راستوو کا ٹکٹ لیا اور اپنے دوست ڈاکٹر میکووش کی معیت میں سفر کر رہا تھا کہ ۳۱۔ اکتوبر کو تیسرے پہر کا ایک بیماری نے آن گھیرا۔ اُس وقت گاڑی اسٹاپوود کے گاؤں سے گذر رہی تھی۔

کونٹ کو فوراً گاڑی سے اتار لیا گیا۔ سٹیشن ماسٹر نے اپنا مکان اپنے معزز مہمان کو پیش کر دیا۔ پولیس ٹالسٹائی کے

خاندان، اخبارات اور پادریوں کو فوراً خبر دی گئی اور یہ تمام اس چھوٹے سے قصبے میں آوارد ہوئے۔ ٹالسٹائی کی بیوی گاڑی کے ایک ڈبے میں فروکش ہوئی اور اس علاقے کا گورنر ایک دوسرے ڈبے میں۔ فوجیں بلائی گئیں اور توپیں اور بارود موقع پر جمع کر دیئے گئے۔ کلیسا نے اس وقت تک اُس کے لئے دعا کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ دوبارہ کلیسا کے حلقہ میں داخل ہونے کے لئے رضامند نہ ہو جاتے۔ حکام کے اوسان خطا تھے اور وہ تشدد پر آمادہ ہو رہے تھے لیکن تمام قوم میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

اس چھوٹے سے اسٹیشن سے برقی پیغامات کا ایک طوفان امڈا چلا آتا تھا۔ ان پیغامات کے مختلف مضامین سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے دلوں کا ایک مدہم سا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ پہلا پیغام پولیس افسروں کا ہے! "مصنف کونٹ ٹالسٹائی گاڑی میں بیمار ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر روزولن نے اُسے پناہ دی" دوسرے روز خود ٹالسٹائی نے اپنے ایک دوست کو تار دیا "کل بیمار ہو گیا۔ مسافروں نے مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ آج حالت اچھی ہے اپنا سفر جاری رکھوں گا۔ تدبیر کرو "نکولیو"۔ لیکن یہ بات جلد ہی صاف ہو گئی کہ "نکولیو" جیسا کہ اُس نے اپنا نام ظاہر کیا تھا اس اسٹیشن سے زندہ رخصت نہ ہو سکے گا۔ اُس کے باقی حالات مندرجہ ذیل پیغامات سے ظاہر ہوتے ہیں "اگر امن قائم رکھنے کے لئے مدد کی ضرورت ہو تو لیبیڈین سے پولیس بھیج دی جائے" یہ ایک ہمسایہ صوبے کے گورنر نے مقامی گورنر کو لکھا۔ "آج اسٹاپوو پہنچا۔ کونٹ کا گھرانہ یہیں ہے۔ کل پھر تار دوں گا۔ دعا کے لئے تہ دل سے التدعا کرتا ہوں۔ وارسونوف (پادری)"۔ ایک اخبار نویس نے پیغام بھیجا "خزاں کی تاریک اور طوفان انگیز رات تمام حاضرین کی روحوں کے ساتھ غم انگیز خیالات میں ہمنوا ہے۔ کیا روس کا آفتاب غروب ہو جائے گا؟" پولیس لکھتی ہے "بالکل امن ہے۔ اسٹاپوو کے باشندے کونٹ کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ انتظامات معقول ہیں"

جب کونٹ کا آخری وقت آن پہنچا تو پیغامات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا "دل کو سخت تکلیف ہے حالت نازک ہے"، "گھر والوں کو جگا یا گیا اور بلایا گیا ہے۔ حالت خطرناک ہے"، "دل کمزور ہو رہا ہے۔ گھر والے اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ کونٹس بھی۔ ڈاکٹر رو رہے ہیں" "تیار رہو" "سو رہا ہے۔ نبض کمزور ہے۔" "ڈھائی بجے، کوئی قابل ذکر بات نہیں" "تین بجے۔ نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں"، "مارفاین کا ٹیکہ لگایا گیا۔ حالت ویسی ہے۔ سو رہا ہے۔ ٹانگیں گرم ہیں"، "پانچ بجے۔ دل یکایک کمزور ہو گیا حالت سخت خطرناک ہے۔ دھند جھکڑ چل رہا ہے۔ پولیس پہرے پر ہے"

اس کے پانچ منٹ بعد پولیس افسر نے اعلیٰ عہدہ دار کو تار دیا "ٹالسٹائی مر گیا" اُس کی موت کی پہلی خبر اُس کی بیماری کی پہلی خبر کی طرح پولیس ہی نے بھیجی۔

پنجاب میں علم کی سرپرستی

مندرجہ ذیل شذرہ ہمیں پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے:-
مولفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک فنڈ قائم ہے، تا کہ اس صوبے کی دیسی زبانوں کے اہلِ علم کو مفید اور عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو، اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے رہنے والوں کے لئے ہیں اور صرف چیدہ اور خاص تعریف کے قابل کتابوں کے لئے دئیے جاتے ہیں۔ ترجمے جب تک غیر معمولی اور انوکھی قابلیت کے نہ ہوں انتخابِ انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخابِ انعام کے متعلق کمیٹی نے چند قواعد و ضوابط مرتب کر دیئے ہیں، اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہوتا ہے۔ ان قواعد کی نقل دفتر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ واضح ہو کہ انعام دینے کی غرض سے کمیٹی ان تصانیف پر غور نہیں کرتی جن میں سیاسی اور مذہبی متنازعہ معاملات پر بحث مباحثہ ہو، یا جو کسی خاص فرقہ کے متعلق ہوں، یا ان میں سے ایسے مضامین ہوں کہ جن سے کسی طرح قوموں میں باہمی نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی متنازعہ معاملات پر بحث کی گئی ہو، یا جو درسی کتابیں ہوں، یا جن کا کسی پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجیح ایسی کتب کو دی جاتی ہے جو عوام الناس کے واسطے مفید ہوں اور جو عام فہم سائنس تاریخ، سوانح عمری یعنی سیرت اور سیاحت سے تعلق رکھتی ہوں۔ یا جن کا مدعا یہ ہو کہ مدرسوں کے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب مہیا کیا جائے، یا جو کہ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں +

ہر سال ماہ جنوری میں ٹکسٹ بک کمیٹی کتب موصولہ پر غور کیا کرتی ہے۔ اس سال کی کتابیں برائے انتخاب ۲ جنوری ۱۹۳۰ء تک دفتر میں آنی چاہئیں۔ گویا یہ آخری دن ہے +

موجودہ قواعد کی رو سے بہترین کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہوسکتا ہے اور کوئی انعام پانچ سو سے کم نہ ہوگا۔

تفصیل انعامات سال ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہے:-

نمبر شمار	جس کو انعام دیا گیا	نام کتاب	رقم انعام
۱	حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور	پنجاب میں اردو	ایک ہزار
۲	ڈاکٹر سوکھن سنگھ ایم بی بی ایس میڈیکل آفیسر خالصہ کالج امرت سر	شری رک رکھیا	سات سو پچاس
۳	لالہ سنت رام بی اے لاہور	البیرونی کا بھارت حصہ سوم	پانچ سو
۴	ڈاکٹر سکھا رام میدی رتا ایم بی بی ایس لاہور	جڑی بوٹی حصہ اول و دوم	پانچ سو

گوئٹے اٹلی میں

گوئٹے اپنی جوانی میں ایک رندِ لاابالی تھا، لیکن ۱۷۸۱ء کے موسم بہار میں جب وہ سوئٹزرلینڈ میں سردیاں گزار کر واپس آیا تو اُس کے دل میں پھر ادبی جوش پیدا ہوا۔ اُس نے سپینوزا کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی زندگی میں متانت اور مستعدی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ اُس نے ولہلم میسٹر اور ٹیسو دو تصانیف کی طرح ڈالی اور سیزر، محمد، آوارہ یہودی اور پرومی تھیوس پر مضامین کے خاکے تیار کئے۔

چھ اور سالوں تک وہ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں رہا جس کے چاروں طرف باغ تھا اور جو ڈیوک کارل آگسٹ نے اُسے دے رکھا تھا۔ لیکن اُس کی طبیعت یہاں بھی بے کیف ہی رہتی تھی۔ اُسے ایک تازہ فضا کی ضرورت تھی جس میں اُس کے خیالات ابھریں۔

سو ۱۷۸۶ء میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر گوئٹے چپکے سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ عمر بھر اُسے اٹلی جانے کی تمنا رہی تھی۔ جب انگور کی بیلیں، زیتون کے جھنڈ، پرانے شہر اور اس سے بھی پرانے کھنڈر اُس کی نظروں سے گزرتے تھے تو اُسے یہ سفر گھر سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی شدید کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی تصنیف افی گینیا یہیں مکمل کی جو جرمن زبان میں ایک یونانی المیہ ناٹک ہے۔ روما سے وہ سسلی میں پہنچا جس میں اُس نے یونان سے زیادہ یونانیت پائی۔

اٹلی میں گوئٹے نے اپنے عمر بھر کے ذوقِ تصویرکشی و نقاشی کو خیرباد کہی اور ہمہ تن شاعری میں محو ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سمجھ لیا کہ فطرت نے اُسے شاعری کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ پھر ویمر میں آیا تاکہ اپنے عزائم کو بارور ہوتا دیکھے۔ اُس نے ڈیوک سے کہہ کر دفتری تفکرات سے آزادی حاصل کر لی اور ادب کی خدمت کے لئے تیار ہوگیا۔

منصور احمد

گوئٹے اٹلی میں

غالب اور ہائنے

کامرڈ کے ایک پرانے پرچے میں ہندوستان کے مشہور مستشرق پروفیسر صلاح الدین خدابخش نے جرمنی کے جلیل القدر شاعر ہائنے کا موازنہ غالب سے کیا تھا۔ مضمون گو پرانا ہے مگر پرانی شراب کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے پیش کرنے میں کسی خاص معذرت کی ضرورت نہیں۔

(مترجم)

حال میں ہائنے کے سوانح زندگی شائع ہوئے ہیں جن سے اُس کے تمام خصائل وخصوصیات، اُس کے افکار و آلام اس کے عشق ومحبت کی داستان اور آخر میں اس کی تکالیف اور علالت کے واقعات من وعن علوم ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہائنے خود ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مخصوص بذلہ نواز لہجے میں اپنے اسرار دلی کہہ رہا ہے۔ جب اُس کے دل پر سے واقعاتِ عالم کا پردہ اُٹھتا ہے تو ہمیں اس آئینہ میں اُس کی صورت صاف نظر آتی ہے۔ گویا اُس کا دل غمگین ہے، بے قرار ہے، اور کسی کی جستجو میں خون بہا رہا ہے۔

ہائنے پر اٹھارہویں صدی کے خیالات کا بہت گہرا اثر تھا اور یہ اثر مرتے دم تک ایک صورت پر قائم رہا۔ ہائنے جرمنی کے شہر ڈسلڈارف میں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ کے لحاظ سے گو وہ اٹھارھویں صدی کے اختتام پر پیدا ہوا، لیکن اس صدی کا نقش اُس کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت تھا۔ اس کی ماں فرانس کے مشہور فلسفی اور سیاسی روسو کی شاگرد تھی اور روسو کی مشہور تصنیف "ایمیل" سے جو تعلیم پر ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے، پورے طور پر واقف تھی۔ ہائنے کو اس طرح اٹھارہویں صدی کے خیالات وراثۃً ملے تھے۔ اٹھارھویں صدی سیاسی مباحث اور تحقیر مذہب کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس زمانہ میں عقل ہی ہر چیز کا معیار سمجھی جاتی تھی۔ فلسفہ، علم، سیاست، سائنس غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسان اپنی ان تھک کوششوں کا ثبوت دے رہا تھا۔ گذشتہ واقعات اور روایات پر سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی۔ مذہب کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے کے خلاف ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خون اور نسل کا شوق مٹتا جا رہا تھا۔ خدا کی ودیعت کردہ حکومت کے اصول کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اور سوسائٹی کو ایک نئے مرکز پر لانے کی کوششیں جاری تھیں اور ساتھ ہی ساتھ سیاست بھی اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ اس صورتِ حالات میں جب کہ یورپ ایک انتشار

کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر سے دماغی اور سیاسی انقلابات کی موجیں گزر رہی تھیں ہائنے نے دنیا میں قدم رکھا۔
جو کچھ روسو نے سیاست کی دنیا میں کیا بالکل وہی ہائنے نے عقل کی دنیا میں کیا۔ ایک طرف روسو انسان کے طوقِ
غلامی کے خلاف برابر آواز بلند کرتا رہا۔ اور ہمیشہ انسان کو سیاسی غلامی سے نجات دلانے کی فکر میں سرگرداں رہا۔
دوسری طرف ہائنے نے اپنی تلوار سنبھالی اور اُن تمام گتھیوں کو کاٹ دیا جو عقل میں لپٹی ہوئی تھیں۔

ہائنے کو اوائلِ عمر ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ اُس نے سولہویں ہی برس میں اپنے قلم کو جنبش دینا شروع کر دیا تھا۔
اور اس کے بعد جب اس دریا میں طوفان آیا تو آخر تک یہی کیفیت باقی رہی۔ اُس کا قلم اُس کے خیالات کی ترجمانی میں
کبھی سست نہیں رہا۔ اُس کی ماں کو بڑا شوق تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو ایک کامیاب ساہوکار بنتا ہوا دیکھے اور وہ
روپے سے کھیلے لیکن اُس کو کیا خبر تھی کہ اُس کا بیٹا ایک ایسا پیشہ اختیار کرے گا جس کا اُس کو سان گمان تک نہیں۔
ماں کے اصرار پر بہر حال اُس نے ایک ساہوکار کی دوکان پر نوکری کر لی اور وہاں آنے جانے لگا مگر اس لین دین میں اُس کی
طبیعت نہ لگتی تھی۔ تین ہفتہ تک بمشکل اُس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ کر اس مصیبت کو برداشت کیا اور اس کے بعد اپنی ماں
کو کسی طرح راضی کر کے وہاں سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ اب جاننے لگا کہ تجارت سے اُس کا مذاق کوسوں دور ہے اور اپنی تمام
کمزوریوں اور قوتوں پر اس غرض سے غور کرنے لگا کہ اب اُس کو کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے سوچا کہ مجھ کو اگر کہیں سرخروئی نصیب
ہو سکتی ہے تو وہ ادب کی دنیا ہے اور واقعی اس دنیا میں اُس نے جو نام پیدا کیا وہ نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اُس کے تمام
ملک کے لئے تاریخ کے صفحات میں ایک زرّیں کارنامہ رہے گا۔ ساہوکارہ چھوڑ کر اُس نے قانون کی طرف رجوع کیا لیکن
یہ بھی اُس کے مذاق کے مطابق نہ نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بے شک ایک ایڈووکیٹ بن گیا مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔
اس پیشے سے اُس کو اپنی روزی پیدا کرنے میں کسی قسم کی سہولت نہ ہوئی۔

بڑے بڑے اصحابِ نظر کی طرح اس کو وقت کی سوسائٹی سے بالکل لگاؤ نہ تھا۔ ۱۶ سال کی عمر میں جب ایک جلاد
کی لڑکی سے اُس کو عشق ہو گیا تو وہ لکھتا ہے کہ میں اس سے اپنے جذبات کی بنا پر عشق نہیں کرتا بلکہ مجھ کو سوسائٹی کے
قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آتا ہے۔

یہاں ہم پر اس کے مزاج کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اپنی تمام زندگی اُس نے ایک کمربستہ سپاہی کی
طرح کاٹ دی ہمیشہ وہ آزادی کے لئے لڑتا رہا۔ کون سی آزادی؟ وہ آزادی جو انسان کو گذشتہ روایات کی جماعتی اور عقلی
غلامی سے آزاد کر لے۔

اپنے متعلق وہ لکھتا ہے کہ میں حسین عورت اور انقلابِ فرانس کا ہمیشہ شیدائی رہا۔ او سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا کون صاحبِ

دل ایسا ہے خواہ وہ لشکر شکن سپہ سالار ہو یا ملکوں کو تہ و بالا کرنے والا سیاسی گوشہ میں بیٹھ کر فلسفہ کے ادق مسائل پر غور و فکر کرنے والا فلسفی ہو یا ادب کے لطائف اور نکات پر مسرور ہونے والا شاعر جو ایک حسین عورت کا شیدائی نہ ہو۔ قیصر کو لیجئے۔ خود جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ خالد اور ابو سینا کو دیکھئے۔ کیا یہ لوگ محبت کی دیوی کے پرستار نہ تھے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ ہائنے کا دل عورتوں پر اس زمانے کی سختیاں دیکھ کر پسیج گیا ہو اور اس طرح اس کے عشق میں ایک قسم کی شعریت پیدا ہو گئی ہو۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنے سے اُس کی مراد کمزوروں کی حمایت تھی۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اُس کو دولت کی دیوی کے دربار میں حاضری کا کم موقع ملا لیکن جب ملا تو اس کا نتیجہ اس کی طویل علالت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے اس بیان میں کتنا درد ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ قیام یونیورسٹی میں جواہرات زیرِ حلق اتارے ہیں اور موتیوں کو ہضم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری گھڑی کو میرے دل کا راز مجھ سے زیادہ معلوم ہے اور وہ اس کو شہر بھی کرتی ہے اس لئے کہ وہ کبھی کبھی کسی یہودی کے تہ خانہ کی بے تکلف سیر بھی کرتی ہے۔ ان الفاظ میں محض شاعری کی لطافت نہیں ہے بلکہ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن کو ہائنے نے محسوس کیا مگر معمولی طور پر ظاہر کیا۔ اس کی تمام زندگی غربت اور علالت کی وجہ سے بے کیف رہی اور ایک دفعہ اُس نے کس حسرت بھرے انداز میں کہا ہے "کاش میں دنیا سے اُٹھ جاتا۔ اے سوزِ جانگزا تیرا نام ہائنے ہے!"

اُس کی تمام تحریروں میں، کیا نظم، کیا نثر، اس کے ذاتی سوز و گداز کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ اس کی شوخ اور مذاحیہ تحریروں میں بھی یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور اکثر اوقات یہ رنگ اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ گویا ہم فریادِ جرس سن رہے ہیں۔ ہائنے کی افتادِ طبیعت روسو سے بالکل مختلف تھی۔ روسو کی سرشت میں تعمیر تھی اور ہائنے تخریب پسند تھا۔ اس کے اندازِ تحریر میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ ہائنے کو کسی نئی چیز کے تیار کرنے میں لطف آتا تھا۔ اُس کا مقصد محض اس قدر تھا کہ وہ عقل کو تمام فرسودہ روایات سے پاک کرے۔ نپولین کے اور اُس کے خصوصیات میں بڑی حد تک یکرنگی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ نپولین کا شیدائی تھا۔ نپولین بھی اس کی طرح توڑ پھوڑ میں مشاق تھا۔ انقلابِ فرانس کا وہ بڑا مداح تھا۔ اس لئے کہ اُس نے اُن تمام روایات کو خاک کے ذروں کی طرح اڑا دیا جو اخوت آزادی اور مساوات کے راستے میں حائل تھے۔ مذہب پر اس کے تمام حملوں کا ذکر بھی اسی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ مذہب ہمیشہ قدامت پسند طبقے کا بڑا قلعہ رہا ہے اور اُس نے خیالات کی ترقی میں کافی روکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ہائنے نے اس لئے مذہب پر سخت حملے کئے کہ یہ نئے خیالات کی ترویج کو روکتا اور قدیم کو مستحکم کرتا ہے۔ وہ مذہب کا تار و پود بکھیرتا ہے اور اپنی نظموں میں

اس پر آوازے کستا ہے۔ معجزات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ خدا کو اپنے افعال کی تنقید اب منظور نہیں اسی لئے معجزات بند ہوگئے ہیں۔ اُس کے زمانہ میں جرمنی کے اندر مذہب کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی تھی اُس نے اس میں شریک ہؤا اور اس نے مذہب پر خوب خوب حملے کئے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ پر چند حلقوں میں اعتراض ہؤا ہے کہ میں نے جرمنی کے رخ سے کیوں نقاب الٹ دیا اور کیوں میں نے جرمن قوم پر یہ ظاہر کردیا کہ وہ جس بہشت کی پرستش کررہے ہیں وہ سراسر دیوتاؤں سے خالی ہے۔ ہاں وہاں البتہ ایک خضر صورت ہستی ضرور نظر آتی ہے جس کے دل میں رنج وغم کا وفور ہے اور اُس کے ہاتھ کسی بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور اس صورت کا نام "ضرورت یا احتیاج" ہے میں نے تو صرف ایک تنبیہ کی ہے کہ ہر شخص کو خود اس طرف قدم بڑھانا چاہئے اور اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرنا چاہئے۔ اور جو انوکھی باتیں میں آج کررہا ہوں وہ دریائے رائن کے اُس کنارے پر (فرانس) مدتوں سے کہی جارہی ہیں۔ ہم میں وحدانیت کے ایسے پرستار بھی ہیں جو والٹیر کو زندہ جلادیں اس لئے کہ وہ پوشیدہ طور پر موحد ہے"۔

آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس کی تحریر میں کتنی تلخی ہے اور اُس نے اپنے مطمح نظر کو ثابت کرنے کے لئے کتنا وحشیانہ پہلو اختیار کیا ہے۔ اُس کو صرف مذہب ہی سے نہیں بلکہ سارے جماعتی نظام سے نفرت ہے۔ بادشاہ سے لے کر غلام تک، رئیس سے لے کر مالگذار تک اور فلسفی سے لے کر بیوقوف تک سب اس کے تیرِ ملامت کا نشانہ بنتے ہیں۔ دنیا اس کے نزدیک گویا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے اور ان حقائق کو وہ برابر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لیکن کیا وہ دنیا کی تمام خرابیوں کو لاعلاج سمجھتا تھا کہ اس کی تباہی کا خیال ہر وقت اس کو رہتا تھا نہیں اُسے ہرگز یہ خیال نہ تھا۔ وہ ان خرابیوں کی اصلاح مستقبل کے پردہ پر اپنی دوربین آنکھوں سے دیکھتا تھا، اور اس معاملہ میں اس کی وسعتِ نظر اس کے پیش رووں اور پس رووں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ تمام انسانوں کی ایک مجلس کے قیام کا موید تھا۔ وہ دنیا میں ایسا دستور چاہتا تھا جس سے ہر شخص کا دوسرے سے لگاؤ پیدا ہو۔ ذیل میں اس کی ایک عبارت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے انسانوں کے متعلق اس کی محبت صاف طور پر آشکارا ہوتی ہے:

"کتنی بہاریں آئیں اور چلی گئیں لیکن اُن کا جوبن کبھی نہیں نکھرا۔ میں بہار کی ترنم ریز بلبل کے شیریں مگر دروغ نالوں پر ہرگز یقین نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا فروغ بے ثبات ہے اور جب میں کلی کے ننھے دل کو پھول میں بدلتے خون ہوتے اور آخر میں ہوا کے کسی شوخ جھونکے کی تاب نہ لاکر مرجھاتے اور پیوندِ خاک ہوتے

دیکھتا ہوں تو میرے سامنے بے ثباتی کی ایک مجسم تصویر ہوتی ہے۔ مجھ کو ہر جگہ موسمِ سرما کا ظہور نظر آتا ہے جو دلوں کی گرمی شباب کی شوخی اور موجوں کی روانی کو سرد کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود بھی میرے سینہ میں ایک چنگاری موجود ہے جس میں تمام عالم پر چھا جانے اور اُس کو مسخر کر لینے کی ایک آرزو پوشیدہ ہے۔ ستاروں کی رفاقت اس کو ناپسند ہے اس لئے کہ اُن میں سراسر سردی ہے۔ کہکشاں کی سفیدی اُس کو منظورِ نظر نہیں اس لئے کہ وہ بے میل ہے۔ غرض آسمان اور زمین میں اس کے بسنے کے لئے اگر کوئی ممکن جگہ ہے تو وہ صرف میرا دل ہے۔ یہی محبت ہے جس کا ظہور اکثر دیوتاؤں کی صورت میں ہوا ہے"۔

زندگی میں ہم کو تعمیری اور تخریبی دونوں قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دونوں کے حلقۂ عمل جداگانہ ہیں اور ضروری ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تخریب کی ضرورت اشد ہوتی ہے اور اس وقت ہم تخریبی قوائے عملیہ کو برسرِ کار لا کر تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں تاکہ ہم سچائی کو اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ فرمائی کا موقع دیں۔ اور اس ذیل میں ہائنے نے بنی نوعِ انسان کی جو خدمت کی ہے وہ تا ابد زندہ رہے گی۔ بے ایمانی، ریاکاری، مکاری کا اس کے ہاں مطلق گذر نہیں۔ اس کے علم پر انصاف اور سچائی کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اُس نے اس علم کو تا زندگی کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کے حوادثِ زمانہ کا ثابت قدمی اور دلیری سے بلاخوفِ نتائج مقابلہ کرتا رہا۔ اگر وہ عیش و آرام کی زندگی میں پڑ جاتا تو اتنا بڑا کام کبھی نہ انجام دے سکتا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک دفعہ نصیحت کی تھی کہ "بیٹا۔ تمہاری ماں چاہتی ہے کہ تم ریکٹر شلیمر سے جا کر فلسفہ پڑھو۔ یہ اس کا معاملہ ہے۔ مگر میں فلسفہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ صرف خیالی اور وہمی چیز ہے۔ میں بیوپاری آدمی ہوں۔ مجھ کو اپنے بیوپار میں اس سے کیا مدد ملے گی۔ لیکن اگر تمہارا جی چاہے تو میں تمہیں اس سے روکتا نہیں مگر عوام کے سامنے تم اپنے افکار کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ اس سے میرے بیوپار کو نقصان پہنچے گا خاص کر اُس وقت جب لوگ سنیں گے کہ میرا لڑکا خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ یہودی تو مجھ سے لین دین مطلق بند کر دیں گے اور تم جانتے ہو کہ یہودی کتنی جلدی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور اپنے مذہب پر کتنی سختی سے پابند ہیں"۔

لیکن باپ کی یہ نصیحت ہونہار بیٹے کے لئے بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ ہائنے نے اپنا عندیہ اپنے باپ سے صاف اور واضح طور پر کہہ دیا۔ اس کو بہت سا لالچ بھی دیا گیا مگر ہائنے کا پختہ دل اپنے راستے سے تنکا برابر بھی ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آزادی کا یہ علمبردار ... نثر کا پیغمبر بھی تھا۔ جرمن زبان شاید ہی کسی دوسرے شخص کا نام بتا سکتی ہے جو اس قدر صاف

پُرزور اور پُرمعنی تحریر پر قادر ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہائنے اپنے فن میں لاثانی ہے۔ کون سا دل ہے جو اُس کی غزلیں پڑھ کر بے قرار نہ ہو جائے اور کون سا ہاتھ ہے جو کوہ ہرز کا سفرنامہ پاکر مصنف سے مصافحہ کا شائق نہ ہو جائے۔ ہاں، کون ہے جو اس کے انگریزی حالات کو پڑھ کر اپنے دل کو قابو میں رکھ سکے۔ لیکن اس کی زندگی قریب قریب رنج و غم کی ایک داستان ہے جس میں مسرت اور خوشی کے صفحات کم نظر آتے ہیں۔ ۱۶۔ فروری ۱۸۵۶ء کی وہ شام پُرحسرت تھی جب کہ اُس کا آفتابِ حیات ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اُس کے حسبِ ذیل الفاظ سے اُس کے دردِ دل کا حال کسی حد تک معلوم ہوتا ہے:۔

"دیکھو میرے تابوت کی لکڑیاں مضبوط اور عمدہ ہوں۔ خیال رکھنا کہ وہ دریائے رائن کے پل سے لمبی ہوں۔ میری نعش کو کاندھا دینے کے لئے کم سے کم بارہ قوی ہیکل جوانوں کو بلانا تاکہ وہ میری بھاری نعش کو اٹھا کر قبر کے گڑھے میں ڈال دیں۔ مگر سنو میری نعش کے لئے سمندر کی گہرائی زیادہ موزوں ہے۔ میری نعش آخر کیوں اتنی بھاری ہوگی اس لئے کہ میرے دل میں دو عالم کے خزائن پوشیدہ ہیں۔ سمندر کی گہرائی میرے لئے مناسب ہے اور میں وہیں رہ سکوں گا کیونکہ ایک طرف مجھ میں دنیا کی ساری کلفتیں ہنگامہ آرائی کرتی ہونگی اور دوسری طرف محبت اپنی پوری تیزی کے ساتھ جوش مار رہی ہوگی۔"

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں نے غالب اور ہائنے کا موازنہ کیا تھا جو محض سطحی تصور کی بنا پر نہ تھا بلکہ خاصی فکر اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ہائنے کے سوانح شائع ہونے سے یہ رنگ ذرا صاف ہو جاتا ہے، اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور ہائنے کے سینوں میں ایک ہی دل تڑپتا تھا۔ رقعاتِ غالب پڑھئے اور ساتھ ہی ساتھ ہائنے کے خطوط کا بھی مطالعہ کیجیئے پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کتنی دماغی قربت تھی۔ دونوں میں آورد کا نام تک نہیں اور نہ وہ کسی جوش کو دبانے یا ظاہر کرنے کی کوئی خاص کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کلام گویا ایک پردہ ہے جس کو اٹھا کر وہ اپنے دل کی کیفیت عالم پر آشکارا کرتے ہیں۔ خلوت میں وہ بالکل اطمینان اور صفائی قلب سے باتیں کرتے ہیں۔ ان کی صحبتوں میں ہر حسین اور پُر رونق چیز کا ذکر ہوتا ہے۔ دونوں میں حقیقت کے دریافت کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ دونوں کو آپ کسی خیالی معشوق کے لئے سرگردان اور پریشان پائیں گے۔ اُن کے کلام سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے، دماغ کو روشنی اور تاریکی کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور عالی حوصلگی و رفعتِ خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ دونوں اپنے فن کے کامل استاد ہیں اور کون ہے جو اُن کے اثرات سے زندگی کے پوشیدہ راز کو معلوم کرنے کا خواہاں نہیں ہے؟ دونوں دنیا کی تکالیف پر آنسو بہاتے ہیں۔ اُن کا دل انسانیت کے غم میں

کوہ

بے قرار ہے لیکن انسان کی آخری تباہی پر کون ہے جس کو یقین نہیں ہے؟ دونوں ملول ہیں مگر ان کے اس انداز میں بھی ایک شاہانہ تمکنت ہے۔

اردو ادب میں غالب کا وہی درجہ ہے جو جرمن ادب میں ہائنے کا ہے۔ اردو نثر کی شگفتہ بیانی کی ابتدا کا سہرا بجا طور پر غالب کے سر ہے۔ غالب نے اس میں سلاست، ترنم، روانی اور حسن پیدا کیا اور اسکی ترقی کے لئے لامتناہی راستہ کھول دیا۔ لیکن غالب اور ہائنے کا موازنہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ دونوں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ موجودہ طرزِ زندگی اور خیالات کی رُو سے پریشان ہوکر دونوں نے اپنی دنیا الگ آباد کی۔ دونوں کے حسرت و ارمان اور رنج و مسرت کے بیان سے رازِ دلی صاف ظاہر ہوتا ہے اور یہی اُن کے فن کا سب سے بڑا جادو ہے جو دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ دونوں نے دل کی زبان میں نغمہ سنجی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام تا ابد تازہ اور شاداب رہے گا۔

دونوں اس طرح حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور اس طرح انسانی دل کے راز کو آشکار کرتے ہیں کہ ہم فوراً اُن کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ہمیں اپنے طرزِ بیان سے اس طرح حیرانی میں مبتلا کرتے ہیں کہ گویا اس راز کا افشا ہماری زندگی کا عین مقصد تھا۔ دونوں کے دل میں انسانی ہمدردی اور محبت کا سمندر جوش مارتا ہے۔ دونوں کمال ناامیدی و حیرت کے عالم میں انسانی گوشت پوست کو امید کے روح افزا پیاموں سے مسرور کرتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دونوں مشعل کا کام دیتے ہیں۔ دونوں ایک خیالی حقیقت کے پیچھے بڑی سرگرمی اور جوش سے دوڑتے ہیں اور ہر راہرو کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ لیکن دونوں کی سعیِ پیہم عالم کی لامتناہی وسعت میں جاکر گم ہو جاتی ہے۔ دونوں زخمِ دل کا علاج کرتے ہیں اور انتہائی حرماں کے وقت دستگیری کرتے ہیں۔ دونوں انسانیت کو ایک خوش آیند زندگی کا مسرت آمیز پیغام دیتے ہیں۔ کمال اور اطمینانِ قلب دونوں کا اصل الاصول ہے۔ اور اس لئے اُن کے راستہ میں جتنی دقتیں حائل ہوتی ہیں اُن کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب پر غالب کا حملہ ویسا ہی سخت اور تیز ہے جیسا ہائنے کا سخت اور تمسخر آمیز ہے۔ دونوں کو ایسے مذہب سے بالکل انس نہیں جو صرف نام کی خاطر زبان سے ادا کیا جائے۔ دونوں کبھی اپنی محنتوں کے ثمر حاصل کرنے کے شائق نہ تھے۔ دونوں ہمیشہ قسمت کے ہاتھوں نالاں رہے اور برابر زورِ قلم اسی کی شکایت پر صرف کرتے رہے ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگر ہائنے نے انسانی ادب کی جنگ میں اپنی سپہ گری کا کمال دکھایا تو غالب بھی اس سے پیچھے نہیں رہا۔ غالب ہمیشہ رنگ و بو کے پردے میں حقیقت کو تلاش کرتا تھا اُس کا دل ہمیشہ محبت کے ولولوں سے سرشار رہا۔ قدیم روایات کا وہ سرے سے مخالف تھا اور ان کے خلاف اسی جوش اور سرگرمی سے آواز بلند کرتا رہا جس جوش اور سرگرمی سے جرمنی میں ہائنے نے کی۔ دونوں کے کلام میں محبت کی چاشنی اور انسان کی نیکیوں اور کمزوریوں کا بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لہذا دونوں کے کلام صفحۂ ہستی پر روشن حروف میں جگمگا رہے ہیں اور اس عالم میں ہمیشہ تاریکی کو دور کرنے میں مدد دیتے رہیں گے۔

"قراخاں"

نوائے راز

کوئی ادا فروش ہے کوئی جفا فروش ۔۔۔ بازارِ حسن میں ہوں میں تنہا وفا فروش

ہے کوئی اہلِ ہوش میں جاں باز تشنہ کام ۔۔۔ تیغِ فنائے عشق ہے آبِ بقا فروش

اہلِ جہاں سے اپنی نبھے بھی تو کس طرح ۔۔۔ وہ ہیں خدا فروش تو میں ماسوا فروش

اب منکرانِ حق سے شکایت نہیں مجھے ۔۔۔ جو بُت شکن تھے آج وہ خود ہیں خدا فروش

بزمِ سخن میں اور بھی تو خوش کلام ہیں
اے رازؔ ایک تو ہی نہیں ہے نوا فروش

رازؔ چاندپوری

نشاطِ رُوح

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اے تو بہارِ رنگ رنگ و اے تو ورائے آب و رنگ
عشق کسی نگاہ میں، حُسن کسی نگاہ میں

حُسنِ ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحدِ بے خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

رازِ فتادگی نہ پُوچھ لذتِ خستگی نہ پُوچھ
ورنہ ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں

در پہ ترے جو آگیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اصغر
گونڈوی

حُسنِ خاموش

مغربی تہذیب نے ہماری طرزِ معاشرت، ہمارے اخلاق اور زبان وغیرہ پر تو اثر ڈالا ہی تھا، مگر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صنعت وحرفت اور دستکاری پر بھی اس قدر جلد اثر پڑے گا جیسا کہ سوسائٹی اور اخلاق پر۔ کیونکہ اہلِ مشرق کے خمیر میں مذہبیت اور ہندوستان والوں میں عبودیت کا عنصر بہت ہے۔ کتنی ہی رند مشربی کیوں نہ پھیلے خدا کی یاد کھل جاتی ہے۔ سائنس ہم کو کتنا ہی پابندِ دہریت کیوں نہ کرے پھر بھی روحانی جذبات خود بخود دل پسند چیز میں، خواہ اس کا وجود دستِ قدرت سے ہو خواہ صنعتِ انسانی سے، حسنِ کمال کے ساتھ ساتھ جمال کو بھی دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اگر کوئی مرغوب شے پسند کی اس کسوٹی پر پوری نہ اُترے تو اس کا توازن معیارِ اخلاق سے بھی درست نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تو فطرتاً اہلِ عقل پر روحانی ذوق حاوی ہو کر یہ کہلواتا ہے کہ ؎ لے گل تو خورسندم تو بوئے کسے داری

لیکن آخر کار مغربی تہذیب نے ہماری اس پاک پسند کو مائل بہ پستی کر دیا اور مادیات ہی نہیں بلکہ نفسیات کے اُن مظاہر کا خوگر بنا دیا جن کو کسی زمانے میں ہم خواب میں بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ حال کی صنعت سے وہ روحانیت تو درکنار وہ سادگی بھی مٹتی معلوم ہوتی ہے ؎

سب سیکھ لیا غیر سے افسونِ شرارت ❊ باقی وہ کہاں سادگیِ یار کا اب رنگ

زیادہ عرصہ نہیں ہوا اہلِ مشرق کا یہ خیال ہو گیا تھا کہ قدیم ہندوستان میں مصوری و نقاشی کا وجود تھا ہی نہیں، اور اگر قرونِ وسطیٰ میں کچھ مثالیں ملتی ہیں تو وہ چین یا ایران سے مستعار کی ہوئی ہیں۔ مگر چند جفاکش تلاش کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی صنعت مصوری اور بت تراشی کی صنف میں یورپ سے کہیں زیادہ دلچسپ اور قدیم ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اگر یونان کی صناعی کو ہم نظر انداز کر دیں تو یورپ میں کہیں کوئی ایسی مثال نہ ملے گی جو ہندوستان پر اپنی بزرگی کا سکّہ جما سکے، یونان بھی ایک حد تک مصر و ایران کا خوشہ چین رہا ہے، اگر ہندوستان میں آئے دن انقلابات نہ ہوتے تو آج ہمارا ملک مصوری و نقاشی کا پورا پورا عجائب خانہ ہوتا۔ پھر بھی بہت کچھ ہے کیونکہ جس قوم نے ہند کو اپنا ملک اور گھر بنایا کچھ نہ کچھ اپنی نشانی از قسمِ مصوری و دستکاری چھوڑ دی تاکہ حسنِ خاموش سے قومی تہذیب کی یادگار قائم رہے اور دیکھنے والی آنکھیں آثار الصنادید سے کمالِ رفتگاں کا اندازہ کر لیں ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری ❊ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

قوموں کے انقلاب نے ہندوستان میں اس فن کی صد ہا قسمیں چھوڑی ہیں۔ نمایاں طور پر ہم بدھ۔ ہندو مسلم اور موجودہ زمانے میں مغربی اثرات کی مثالوں کو زیادہ پاتے ہیں جو حسب مراتب اپنی اپنی خصوصیتوں میں کامل دیکھی گئیں ہیں۔

ابتدائی زمانے یعنی تخلیق تہذیب کے وقت جب انسان پیٹ کے دھندوں سے کسی قدر فراغت کا وقت بھی پاچکا ہوگا جب زمین وآسمان پر ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی نظریں بھی پڑتی ہونگی، جب وہ نقاشِ عالم "شوخیٔ تحریر" کے ہر "پیکرِ تصویر" پر متعجبانہ نظر ڈالتا ہوگا، المختصر جب ان مظاہر کو دیکھ کر اُسے اظہارِ خیالات کے ذریعے کی جستجو ہوتی ہوگی اُس وقت خواہ مخواہ طبیعت بھلی بُری شکلوں کو دیکھ کر ویسی ہی نقل کرنے پر مائل ہوتی ہوگی، چنانچہ واقعۃً ایسا ہی ہوا جس کی شہادت علی مصر کے "خطوطِ نقشی" سے عیاں ہے۔ یہی خطوط یا شکلیں آج کل رسم خط کی ابتدا سمجھی جاتی ہیں اور اُن کا اثر مبنی رسم الخط میں اب بھی نمایاں ہے۔ مصری "خطوطِ نقشی" گو مجموعۂ حروف یعنی الفاظ ہیں تاہم چونکہ وہ حروف اظہارِ اشکال پر مبنی ہیں اس لئے ایک قسم کی تصویر بھی کہے جاسکتے ہیں لفظ "آدمی" بجائے اتحاد الف۔ دال میم اور ی کے اس وقت محض سر وسینہ اور ہاتھ پاؤں رکھنے والی شکل سے ظاہر کیا جاتا تھا اور کھڑی بیٹھی اور لیٹی تصویریں حرکاتِ انسانی کے لئے اظہار کا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں اور یہ شکلیں اس زمانے کی طرزِ تحریر تھیں۔ اس کی مطابقت آج کل کی مصوری سے اس طرح سمجھنا چاہئے کہ موجودہ مصوری خیالات وجذبات کو بھی ظاہر کردیتی ہے مگر اس وقت صرف ایک خاکہ ہی کافی تھا۔ رفتہ رفتہ ان شکلوں سے اصل کی نقل کا عنصر دور ہوتا گیا یہاں تک کہ ایران کے "خطوطِ مخروطی" ایجاد ہوئے اور رسم خط ایک علیحدہ فن ہوگیا۔ شاید پہلے ایک ہی رسمِ خط کا وجود ہو مگر اب تو کثرت تحریر تہذیب پر نمایاں اثر ڈال رہی ہے اور چونکہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب میں نفاق بہت کچھ شامل ہے اس لئے رسمِ خط بھی اردو ہندی کی "تُو تُو مَیں مَیں" میں پڑا ہوا ہے۔ حتّٰی کہ خود یہ فن اس جھگڑے سے عاجز آگیا ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ   تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو

مصوری کے وجود کا بہانہ رسم الخط کے علاوہ ہم کو فسانہائے پاستاں سے بھی مل سکتا ہے۔ ہندی پاستان تاریخ میں بیان کیا جاتا ہے کہ برہما نے برہمن کے مردہ لڑکے کو زندہ کرنا چاہا لیکن یم[1] نے روح واپس دینا گوارا نہ کیا اس لئے برہما نے ایک تصویر بنا کر اُس میں جان ڈال دی۔ پس تصویر بننے کی ابتدا یوں ہوئی۔ اہلِ اسلام اور عیسائیوں کے یہاں

---

[1] یم۔ فضائے آسمانی کا خدا۔ سرخیٔ شام کا بادشاہ جہاں نیک لوگوں کی روحیں فضائے آسمانی کی سیر کرتی ہیں (آریہ لوگوں کا عقیدہ)

آدم کا پتلا بنایا ہی گیا تھا جس کی شہادت بائبل اور قرآن شریف میں اظہر من الشمس ہے پس حضرتِ انسان نے
ہی اللہ میاں اور برہما کی نقل کرنی شروع کی۔ اللہ میاں نے آدم کا پتلا بنا کر فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم کیا شیطان
نے انکار کیا، نکالا گیا، شاید جل بھن کر اُس نے حضرتِ انسان کو یہ تدبیر سمجھائی کہ تم اللہ میاں کا پتلا بنا کر سجدہ کرو۔
ہمیں اِس وقت شیطان کی مخالفت یا موافقت سے کچھ واسطہ نہیں مگر اور سنئے شاعر کو جب الہام ہوتا ہے تو
عالم بالا کے راز بتا جاتا ہے۔ مصور کو بھی کچھ ایسا ہی وسیلہ خواب کے ذریعے سے ممکن ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اوشا دیوی
نے ایک حسین نوجوان کو خواب میں دیکھا اور اپنی سہیلی چتر لیکھا سے کہا کہ "میں چاہتی ہوں کہ اس کو پھر دیکھوں"
چنانچہ چتر لیکھا نے کنہیا کے پوتے انردھ کی تصویر بنائی اور اسی زمانے سے مصوری کی ابتدا ہوئی۔ یہ مشہور ہے کہ
شاہجہان بادشاہ دہلی نے چوتھے آسمان پر دہلی کی جامع مسجد خواب میں دیکھی اور ایک فقیر کامل کے ذریعہ سے معمار
نے یہ نقشہ بنایا جس کی تعمیر دارالصدر میں ہو گئی۔ شاید آگرے کا تاج محل بھی باغ فردوس کے کسی محل کا نمونہ ہے چنانچہ
شاہجہان کی اکثر عمارتوں کے دروازے پر لکھا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

یہ واقعہ ہے۔ بدھ کے مجسمے روحانی جذبات ظاہر کرتے ہیں، ہندوؤں کی تصویریں کرشن جی کی محبت آمیز اور بھولی
ادائیں دکھلاتی ہیں اور مغل لوگ آرائشِ دربار وغیرہ کا اظہار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پس اگر مسلمان جنت الفردوس کے
نمونے پیش کریں تو کوئی تعجب نہیں۔ رہے روحانی جذبات وہ بھی مسلمانوں کی مصوری میں ظاہر کئے گئے ہیں بشرطیکہ
روحانیت سے متعلق تصویریں دیکھی جائیں۔ یوں تو پستیٔ نفس کے خوف سے اسلام میں مصوری ناجائز رکھی گئی ہے
مگر پھر بھی بدرجۂ کمال یہ چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم حضرت ابراہیم ادھم کی تصویر کا ذکر مناسب
سمجھتے ہیں جس میں روحانیت اور نیچریت کے تمام مظاہر حتی الامکان دکھائے گئے ہیں۔ "حضرتِ موصوف مراقبہ
میں، یا یوں کہئے کہ محویتِ الفت میں دریا کے کنارے ایک لکڑی کے سہارے علی الصباح بیٹھے ہوئے ہیں، آسمان
پر کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے ہیں اور ایک کپڑا آپ کے سر پر سایہ فگن ہے جس میں پریاں (یا حوریں سمجھئے مگر پر
لگائے گئے ہیں) سر نکالے، بانسری اور شہنائی لئے ترانۂ روحانی آسمانی سازوں کی آواز پر گا رہی ہیں اور نور رحمت
اس ابر سے چھن چھن کر آپ کے فرق کی طرف مائل بہ زمین ہے" مگر مسلمانوں نے زیادہ تر فردوس ہی کو ظاہر کیا ہے
اور باغ، عمارت، بیل بوٹوں پر مبنی ہے۔ یوں تو مغل بادشاہوں کے یہاں کمالِ مصوری کے نمونے روحانی معاشرتی

؎ یہ تصویر امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ لکھنؤ میں موجود ہے۔

اور ہر قسم کے فطرتی جذبات ظاہر کرنے والے ملیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل مصوری ہندوستان میں چین سے آئی اور یہاں سے تقدیس کا رنگ لے کر بدھ مذہب کے ذریعے سے چین اور تمام مشرق میں پھیل گئی۔ بعد ازاں بدھ مذہب کے زوال پر کرشن جی اور مرلی منوہر ایسے دیوتاؤں کے مجسمے بنائے جانے لگے اور رادھا کی سواری ہنس اور طاؤس وغیرہ پر ظاہر کی گئی اور یہ اس فن کی ترقی کا وہ دور ہے جب رامائن اور مہابھارت کی داستانیں پیکرِ تصویر اختیار کرنے لگیں جیسے آج کل متوسطین شعرا کے خیالات ادب اردو کے رسالوں میں آرٹ بلاکس کے ذریعے سے پیکرِ تصویر اختیار کر رہے ہیں۔ اُس وقت یہی اثرات یونان میں بھی مقابلتہً دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہومر کے خیالات بتوں اور تصویروں میں عیاں کئے جاتے تھے۔ خدائے محبت[1] کی رتھ فاختاؤں کا جوڑا اپنے کندھوں پر رکھ کر کھینچتا تھا اور مغبچہ[2] الفت کا تیر یا یوں کہئے کہ تیرِ نظر صاف دل کے پار ہو جایا کرتا تھا۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہندوستان میں کنہیا جی نے اپنی بانسری سے وہ داستانِ محبت سنائی کہ رادھا تو رادھا جنگل کے جانور بھی محوِ الفت ہو گئے۔ اور جہاں تک اس بانسری کی آواز گئی اتنی فضا ایک بقعۂ نور بن گئی۔ ایسے ہی خیالات کی بنا پر قرونِ وسطیٰ کی تصویریں کھینچی گئیں اور آج کل بھی بعض ہندو ماہرین ان خیالات کو پیکرِ تصویر دیتے ہیں۔ شاعروں نے تو یہاں تک لکھنا شروع کیا کہ چندرماں دیوی آگرے کے تاج روضے پر آتی ہے اور رادھا کی روح دریائے جمن کے کنارے گوکل کے کنڈ پر رشی مہاتماؤں کی آنکھوں سے اشنان کرتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انشا ایسے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
شیو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں — کیا ہی بہار آج ہے برہما کے رُنڈ پر
اے موسمِ خزاں لگے آسے کو تیرے آگ — بلبل اداس بیٹھی ہے اک سوکھے ٹُنڈ پر

چنانچہ ہندو مصوری میں دریاؤں کے گھاٹ، پہاڑوں کے دامنوں میں سادھوؤں کے ٹھکانے اور قدرت کی فضا میں مندروں کے مناظر وغیرہ بہت ہیں۔ اکثر کسی ویرانے میں مندر دکھایا گیا ہے جس کے پاس برگدوں کے درخت سادھوؤں کی طرح بڑی بڑی جٹائیں لٹکائے کھڑے ہیں، جڑ کے پاس مہادیو جی کے چکنے چکنے مجسمے رکھے ہیں اور کنواری دیویاں تھال ہتھیلی پر رکھ کر آ رہی ہیں اور عقیدت کی مجسم تصویر بن کر کسی چھوٹے گنبد دار

---

[1] خدائے محبت Bacchus. [2] کیوپڈ Cupid

مندر میں پرشاد چڑھانے داخل ہو رہی ہیں۔ ہنود نے اپنے مذہبی احساس کے مطابق یہاں تک امتیاز ظاہر کیا ہے کہ شیوجی کے مندر اور مجسموں میں ایک مقدس خوف طاری رہتا ہے کیونکہ وہ خدائے فنا ہیں، وشنوجی کے یہاں رحم و مرحمت کے محبت آمیز اثرات نمایاں ہیں کیونکہ وہ خدائے حسن و عنایات ہیں، اور برہما کے یہاں بزرگی اور پُرتعظیم محبت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے کیونکہ وہ خدائے تخلیق ہیں ؎

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ　　عالم آئینہ کے مانند دریار ہے ایک

پس یہی اثرات قرونِ وسطیٰ کی مصوری سے بھی ظاہر ہیں۔

ہندوستان میں مصوری کی ترقی کا ابتدائی زمانہ مہاتما بدھ کا عہدِ زریں ہے جب کہ بدھ مذہب کے فیض سے تمام ملک پرامن و مرحمت کی ہوا چل رہی تھی اور ہر شخص کشت و خون سے عاجز آ کر نروان کی شکل میں محو تھا۔ اس زمانے میں بدھ کے مجسمے ایسے بنائے گئے جو اپنی ماہیت سے حصولِ نروان یا فنا فی المسرت ہونے کے طریقے بتلا رہے ہوں اور نیک کاموں کی نصیحت کر رہے ہوں۔ ان مجسموں کی شکل سے دنیا کی ناپائیداری اور عالمِ بالا کی رعب دار تقدیس ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صنعت بدھ مذہب کی ترقی کے ساتھ تمام ایشیا میں پھیل گئی اور جب بدھ کو اوتار اور اس کے بعد خدا مان لیا گیا تو اُس کے مجسموں کو بھی ویسا ہی رنگ روپ دے دیا گیا اور بدھ کے سامنے لوگ ہاتھ جوڑے دعائیں مانگتے اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہوئے دکھائے گئے۔ ماہرینِ فن نے بدھ کے مجسموں میں روحانی کشش دوڑانے کی کوششیں کیں جس کا اثر تبت میں اب تک ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک بُت تراش نے بدھ کی شکل بنا کر تبت کے کسی راجہ کو پیش کی جس کی پُرتاثیر کشش نے اُس کو بدھ مذہب کا پیرو بنا دیا۔

یہی بات ایران[1] کے نامی مصور مانی سے بھی وجود میں آئی تھی جس نے اپنی تصویروں کو دستِ قدرت کی کاریگری ثابت کر کے پیغمبری کا دعوےٰ کر لیا تھا۔

ہندوستان میں بھکشو نقاشوں کو بہت جلد زوال ہونا شروع ہوا کیونکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندو مذہب میں بیداری شروع ہو گئی۔ بدھ کی صلح کل نصیحتیں شجاعانہ جذبات کو مردہ کئے دیتی تھیں، اس لئے راجپوت چھتریوں کے سورج بنسی اور چندر بنسی خون نے جوش مارا اور بدھ کی تصویروں اور مجسموں کی جگہ راماین اور مہابھارت کے رزمیہ اور معاشرتی نمونے تصویروں میں دکھائے جانے لگے۔

---

[1] بعض مورخ مانی کو چین کا باشندہ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مغلوں کا زمانہ اور مغلوں میں خصوصاً اکبر و جہانگیر کا زمانہ مصوری کے لئے عہدِ زریں تھا۔ سلاطینِ تیموریہ خاص طور پر مصوری کے دلدادہ تھے۔ بڑے بڑے مشہور نقاش ان بادشاہوں کی سرکار میں ملازم تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سلطان حسین والیٔ خراسان کے یہاں بہزاد ایسا مشہور مصور گزرا ہے جس کا ذکر بابر نے اپنے خود نوشت حالات میں بہت تعریف سے کیا ہے۔ یہ لوگ نظامی و فردوسی وغیرہ کے تخیل کو اپنے ہنر میں ایسی طرح نمایاں کرتے تھے کہ اگر مغربی مصور Raphael بھی دیکھتا تو وجد کرتا۔ اُس وقت کی مصوری نے جس کا بیان آئینِ اکبری میں خاص طور پر کیا گیا ہے ہر رنگ کی تصویریں چھوڑی ہیں جو اب ہندوستان سے یورپ چلی گئیں اور جن کو اب ہم نگاہِ یاس سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہندوستان میں جو تصویریں باقی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی مصوری نے علم مجلس، دربار، سیر و شکار، میدانِ کارزار، قلعہ گیری، قدرتی مناظر اور اظہارِ جذباتِ حسن و الفت، وغیرہ کے تمام اقسام پر ہنر آزمائی کی۔ آج کل جذباتِ حسن و الفت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور معاشرتی نمونے بھی تمام و کمال ظاہر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ "مرقع چغتائی" کے نمونوں سے ظاہر ہے۔ لیکن مغلوں کے وقت میں بھی اظہارِ حسن و محبت کی بہت کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک تصویر[1] میں ظاہر کیا گیا ہے کہ معشوق عاشق پر مائل بہ مرحمت ہے اور عاشق گلدستہ لئے وارفتگی کے عالم میں سامنے کھڑا ہے اور کچھ سوال و جواب ہو رہے ہیں۔ حاشیۂ تصویر پر سوال لکھا ہے ؂

بگو اے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردی؟ دلِ بلبل شکستی غنچہ را دل بستہ آوردی؟

عاشق جواب دیتا ہے ؂

نہ بہرِ زیبِ دستم جانِ من گلدستہ آوردم بہ خوبی لاف مے زد گل بہ پیشیت بستہ آوردم

اور کمال یہ ہے کہ پھولوں کو کچھ خنداں اور کچھ پژمردہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح کمالِ مصوری اور کمالِ شاعری کے نمونے ساتھ ساتھ دیکھے گئے ہیں اور حتی الامکان "حسنِ خاموش" کو بولتی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کل ہندوستان کی نقاشی میں بعض لوگ اس بات کے کوشاں ہیں کہ مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم راجپوت اور مغل خوبیوں کو بھی تصویر میں زندہ رکھیں۔

مصوری کے علاوہ دیگر فنونِ حرفت و دستکاری اپنی مقامی خصوصیتوں کے ساتھ مشہور ہیں۔ دکنی، پنجابی، مرادآبادی، بجے پوری کام اپنی اپنی جگہ پر خصوصیت رکھتے ہیں۔ جن میں سے دلی اور لکھنؤ کی دستکاریاں زبان زد

---

[1] یہ تصویر "حمیدیہ لائبریری" بھوپال میں دیکھی گئی۔

کی امتیازی خصوصیتوں کی طرح مشہورِ عام ہیں مصوری سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ہندوستان نے عام دستکاری میں ایرانی اثرات کی وجہ سے بہت ترقی حاصل کی۔ مغل بیگمات کی جدت پسند طبیعتوں نے آرائش و زیب و زینت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، چنانچہ نورجہان، ممتاز محل اور زیب النسا کی کوششوں نے صرف لباس و زیور ہی نہیں بلکہ عام دستکاری کو درجۂ کمال تک پہنچادیا۔ اور آج کل یورپ کی کامل پسندی اور فطرت طرازی نے اُس پر چار چاند لگا دیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ مشرقی مصوری "جزو" یعنی خط و خال کی طرف زیادہ مائل ہے اور مغربی مصوری "کل" بلکہ آس پاس کا خاکہ بھی ضروری سمجھتی ہے۔ مشرقی نقاش بھی اب کُل کی طرف مائل ہوگئے ہیں اور یہی ایک اچھا اثر ہے جو یورپ کے آرٹ سے ہم کو حاصل ہوا۔

المختصر قدیم مصوری و نقاشی بالکل روحانی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں رزم و بزم کی تصویریں دکھلائی گئیں۔ اور اب فطرت اور نیچریت غالب ہے۔ لیکن اردو رسالوں میں جو شعرائے متوسطین کے خیالات پر فنِ مصوری کی ہنر آزمائیاں کی جاتی ہیں اور اُن کے ساتھ عالمِ خیال کا ایک منظوم طلسم بھی باندھا جاتا ہے اگر حسن و سادگی اور مظاہرِ فطرت کے ساتھ کچھ روحانی جھلک بھی لئے ہوں تو صحیح معنیٰ میں فنِ مصوری کا نمونۂ کمال ہیں۔

جہاں تک کہ مذہب کا تعلق مصوری اور بت تراشی سے ہے ہم ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام عالم کو زمانۂ قدیم میں گمراہ پاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی سبق آموز بت شکنی سے لے کر محمود غزنوی کی بت شکنی تک یہی رونا رہا مگر اسلام نے بہت کچھ مسیحائی کی جس سے بہرہ اندوز ہوکر کبیر داس اور گرو نانک ایسے بزرگ خود بخود بت پرستی کے خلاف لیکچر دینے کھڑے ہوگئے اور اب یہ روحانی مرض قریب قریب مٹنے لگا، گو پست درجے کے لوگوں میں ابھی باقی ہے۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے لوگ اپنے خیال ہی کو نہیں بلکہ روح کے اُس مقدس احساس کو بھی پیکرِ تصویر میں لانے کے کوشاں تھے جو انہیں وجودِ معبود کا پتہ دے رہا تھا۔ تاکہ دقتِ مراقبہ اور سعیِ تصور کی تکلیف رفع ہو جائے اور یہ ایک غلطی تھی جس کو مسلمانوں نے رفع کرنے کے لئے بتوں اور تصویروں سے اختلاف ظاہر کیا۔ کیونکہ ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

تاہم حسنِ خاموش سے ہم کو ارتقائے روحانیت کی بہت کچھ تاریخ مل جاتی ہے اور روحانیت ہی نہیں بلکہ امتیازِ حسن اور معاشرتی پہلو کا بھی بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر قدیم مصوری ہمارے جذبات کو بیدار کر کے زبان سے تعریف کے کلمات کہلائے۔ کوئی حیرت نہیں اگر شاعر[۵۱] "حسنِ خاموش" کی زندہ مثال دیکھ کر "حسن کو حق[۵۲] اور حق کو حسن" کہے۔ گو اسی شرط پر کیوں نہ ہو کہ حسن جب ہی تک حسن ہے جب تک کہ رسوا نہ کیا گیا ہو۔ یہ عجیب بات نہیں اگر کوئی سیاح[۵۳] شاعرانہ انہماک کے ساتھ روضۂ تاج کو دیکھ کر ساختۂ انسان نہیں بلکہ ساختۂ ملائک کہے کہ "روئے زمین کے سر کا تاج ہے" یا یہ کہ اُس جنت کا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے زندہ خاکی نمونہ ہے۔ اگر ہماری نگاہیں نگارِ فطرت کے حسن کو دیکھ کر حیران ہوتی اور دل کو محوِ کیفیت کر دیتی ہیں تو انسانی جد و جہد اور کوشش بھی کچھ نہ کچھ کر گزرتی ہے، پس گزشتہ قوموں کی یادگاریں اپنے قیام تک اُن کا نام روشن رکھیں گی ع

جاگ رہی ہیں نکہتیں پھول ہیں خوابِ ناز میں

اگر ہم فنِ مصوری اور نقاشی کے ان مظاہر اور ان جیتی جاگتی تصویروں کو زندگی کے دھندوں میں پڑ کر یا کسی اَور قسم کی غفلت سے فراموش کر دیں اور اُن کی قدر نہ کریں اور اُن کو حوادثِ آسمانی میں تباہ ہو جانے* یا غیر قوموں کا ذخیرہ ہو جانے دیں تو ہماری کم نصیبی ہے۔

جن چیزوں میں روحانیت، صداقت، عزت اور محبت کی کچھ بھی بو ہو وہ اگر پرستش کے لائق نہیں تو کم از کم پرورش کے لائق ضرور ہیں ورنہ ہاتھ سے گئی چیزوں کا افسوس تو ہمیشہ رہتا ہے۔ وہ چیزیں پھر کہاں؟ ع

عاشق و معشوق بھی آخر فسانہ ہو گئے
جائے گریہ! اب یہاں لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں؟

سیّد مقبول حسین

---

۵۱ Keats on Grecian Urn

۵۲ Keats: Beauty is truth, truth beauty.

۵۳ سر رابندرا ناتھ ٹیگور۔

غزل

تبسّم نہیں ہے، گل افشانیاں ہیں
تکلّم نہیں ہے غزلخوانیاں ہیں

نرے آپ کے حسن کا دورِ نصفت
جدھر دیکھتا ہوں ستم رانیاں ہیں

ترے گھر کی جانب نمازوں میں رُخ ہے
ترے در پہ سجدوں میں پیشانیاں ہیں

خوشا! اک تری نسبتِ غم، کہ جس سے
خوشی پر خوشی کی فراوانیاں ہیں

مہ و مہر مشّاطہ بن کر چلے ہیں
نئی سے نئی جلوہ سامانیاں ہیں

کوئی پردہ داری کرے بھی تو کب تک
نزاد رد ہے اور عُریانیاں ہیں

سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں
خطائیں نہ کر کے پشیمانیاں ہیں

تقاضے کرم کے نہ شکوے ستم کے
ادا دانیاں سی ادا دانیاں ہیں

اگر کارِ الفت کو مشکل سمجھ لوں
تو کیا ترکِ الفت میں آسانیاں ہیں

اِدھر فکرِ دُنیا، اُدھر خوفِ عقبےٰ
پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں

اگر اذن ہو ہر دو عالم سے کہہ دوں
تمہارے مقدّر میں ویرانیاں ہیں

اب آزاد ہے اور سکوتِ مسلسل
وہ لفّاظیاں ہیں نہ لسّانیاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

شیطان اور بزرگ

بیٹھے بیٹھے انجیل کا ایک جملہ جو یاد آیا تو معًا یہ خیال گذرا کہ یا اگلے وقتوں کے لوگ بہت غصیلے تھے یا آج کل کے لوگ زیادہ شائستہ ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے "Get thee behind me, Satan." اس کا لفظی ترجمہ ہے "پیچھے ہٹ بے شیطان!" لاحول ولا قوۃ۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے کہ ایک ہستی اپنا فرضِ منصبی ادا کرے اور اُسے جھڑک کر کہا جائے چل! ہم نہیں آتے۔ تیری ایسی کی تیسی" اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیک رہنے کے لئے ترش رو ہونا لابدی ہے پھر بھی ناگوار سا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مقدس ترش روئی کے ساتھ اندازِ گفتگو بھی بازاری ہو۔ آج کل کی زندگی میں سینکڑوں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیطان کو سخت سے سخت جواب اگر کسی نے دیا تو بس اتنا ہی کہا "واللہ معاف کیجئے۔ آج ناچ میں شریک نہ ہوسکوں گا" قصہ ختم ہوا۔ نہ یہ کہ بازاری زبان اور پھر ہزاروں سالوں تک اس کا چرچا! آخر وہی دنیا ہے وہی شیطان ہے مگر اخلاق وسیع تر ہیں، یہاں تک کہ آج کل کے محمد شاہ رنگیلوں کو عیش پرستی کا تواتر بھی بارِ خاطر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اسی خیالی کشمکش میں تھا کہ حضرتِ ڈیش کی خوشبو آئی۔ نہیں اُن کے سگرٹ کی! ابھی کمرے سے باہر ہی تھے کہ فرماتے ہیں۔

ڈیش۔ اب کہیں چلو گے بھی یا یونہی اس کمرے کا ناک میں دم کرو گے؟ تمہارا کمرہ تم سے اکتا چکا ہے۔ کمرے کا حق ہے کہ کبھی کبھی تازہ ہوا اسے بھی نصیب ہو۔

میں۔ ایک مشکل حل کر دو تو جہاں کہو چلوں۔

ڈیش۔ اگر مشکل مشکل ہے تو تو بندہ حاضر ہے لیکن آسان مشکلوں کے لئے کسی قومی لیڈر کو چندہ عطا کیجئے۔

میں۔ واقعی خوفناک مشکل ہے (یہ کہہ کر اسے "ہٹ بے شیطان" والی دقت پیش کی۔ ڈیش صاحب نیا سگرٹ جلا کر فرماتے ہیں)

ڈیش۔ میں تم سے بیس دفعہ کہہ چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کی کسی بات کو بھی اس طرح سے بیان نہ کرو جس طرح کہ وہ ہوئی بلکہ اس طرح سے بیان کرو جس طرح سے کہ تمہارا اپنا نسب العین

پورا ہو۔ مرنے والے مر مرا چکے۔ نہ ہم سے پُوچھ کر وہ پیدا ہوئے نہ ہم سے پوچھ کر انہوں نے کھایا، پہنا، برتا پوجا۔ اگر ان کا ہم پر کوئی حق ہے تو بس اس قدر کہ ہم یہ ثابت نہ کریں کہ وہ بہت گمراہ تھے۔

میں۔ تو گویا تاریخ کوئی چیز نہیں۔

ڈیش۔ بہت بڑی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسے بدلتے رہنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اخبار روزانہ کھلم کھلا حالاتِ حاضرہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار میں ایک وزیر دانشمندی کا پُتلا ہے تو دوسرے میں تعصّب کا بھُوت۔ آخر تاریخ اسی مصالح سے تیار ہوگی اور آج کل کے ٹکے سیر والے وزیر تو کیا ہمارے سامنے کئی نپولین، کئی کلائو، کئی اورنگ زیب موجود ہیں اور جیسی ضرورت ہوگی ابھی اور تیار ہونگے۔

میں۔ اچھا! آپ تاریخ کو رہنے دیجئے۔ اصل مطلب پر آئیے۔

ڈیش۔ یہی تو اصل مطلب تھا کہ جس طرح ہم تاریخی ہستیوں کی حسبِ ضرورت اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمیں پیغمبروں کو اصلاح کا بیڑا ابھی اٹھانا چاہیئے۔

میں۔ توبہ کرو۔ توبہ! کیا کفر بکتے ہو!

ڈیش۔ کفر تم تو بکتے ہو۔ تم اور تمہارے ہم خیال ہر دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ سب کے سب پیغمبر ناکامیاب ہوئے اور دنیا ویسی ہی بُری ہے جیسی کہ ان کے نازل ہونے سے پہلے بُری تھی۔ میرے دل میں چونکہ پیغمبروں کی سچّی عظمت ہے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بے انتہا کامیاب ہوئے۔

میں۔ وہ کیسے۔

ڈیش۔ بالکل آسان ہے۔ فرض کرو کہ کسی پیغمبر نے حکم دیا کہ زیتون کا تیل حرام ہے۔ مگر خود اس کی امت کے کچھ لوگ دبنا د میں نغزشی میں ہلدی میں زیتون کے تیل کے خم لُنڈھاتے رہے۔ تم لوگ تو یہ کہہ دوگے کہ اس امر کی تعمیل نہیں ہوئی۔ گویا پیغمبر کو اس خاص معاملہ میں ناکامیابی ہوئی۔ میں یہ کہوں گا کہ ممانعت ہرگز نہ تھی۔ صرف یہ حکم تھا کہ جنہیں آسانی سے میسّر نہ ہوسکے وہ خواہ مخواہ زیتون کے تیل کی ہوس میں مقروض نہ ہوں۔ یہی صورت اس جملے کی ہے۔ میں اس جملے کا ترجمہ یوں کروں گا "جناب من۔ مجبوراً میں آپ کی طرف پیٹھ کر رہا ہوں۔ مجھے دوسری طرف جانا ہے"۔ قصہ ختم ہوا۔ فرض کرو کہ تم نے یہ نتیجہ نکالا ہوتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ بہت صاف گو تھے اور آج کل منافقت کا زور ہے۔

میں۔ یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تو ذرا ذرا سے عقائد کے فرق پر دھمکیاں دیتے

تھے کہ جلوگے، بھنوگے، دنیا غرق ہو جائے گی۔ بات بات پر قیامت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

ڈیش۔ تم بہت اکھڑ ہو۔ یہ اُن لوگوں کا محاورہ تھا، رنگیں بیانیاں تھیں۔ اور کچھ بھی ہو سوال یہ نہیں کہ وہ کیا تھے بلکہ یہ کہ ہم انہیں کس کام میں لاسکتے ہیں؟ کسی چیز کو برا کہنا اور پھر اُسے استعمال کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہمارا فرضِ عین یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے عقاید تبدیل کرتے رہیں۔ تمام موجودہ تنقیدی تفسیروں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ زمانۂ سابق کے عقاید کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف عقاید کی بلکہ عادات کی۔

میں۔ خاک تم نے میری مشکل حل کی۔ ایک مشکل کو دس مزید گورکھ دھندوں میں لپیٹ دیا۔

ڈیش۔ بھائی تم فیشن ایبل انسان ہو۔ میں بچارا سیدھا سادھا قدامت پسند ہوں۔ مجھے واقعی زمانۂ ماضی کی ہر وہ چیز پسند ہے جو میری رائے کے موافق ہے اور جو بظاہر میری رائے کے موافق نہیں اُسے میں عقل کے نور سے اپنی رائے کے موافق کرلیتا ہوں۔ آخر خدا نے عقل انسان کو اس لئے تو نہیں دی کہ اُس کا استعمال نہ کیا جائے۔ بندۂ خدا! لوگ معجزوں پر ہاتھ صاف کر چکے۔ ضروری غیر ضروری احادیث رائج کر چکے اور تم ابھی یہ ٹھوکریں کھا رہے ہو کہ معمولی سے ترجمے میں تصرف جائز ہے کہ نہیں۔ اگر کچھ بھی تمہیں پاسِ وفا ہے تو اللہ کا نام لو اور ماضی کو بدنام نہ ہونے دو۔

(میری بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

ڈیش۔ (کرسی اُن کی طرف کھسکاتے ہوئے) آداب۔ اجی بیگم صاحب کچھ ان حضرات کی تو اصلاح کیجیے۔ فیشن کے مارے بزرگوں سے علیک سلیک رکھنے کے روادار نہیں۔

میں۔ تم ڈیش کی بک بک پر نہ جاؤ۔ آپ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے عقائد کی اصلاح ہمارا فرضِ عین ہے۔

بیگم۔ سبحان اللہ۔ اپنے دھندوں سے تو فراغت نہیں بزرگوں کے پیچھے عقل کی لاٹھی لئے کون پھرے!

ڈیش۔ این خانہ تمام آفتاب است۔ بیگم صاحبہ یہ تو سوچئے کہ ہمارے بزرگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ اگر اور ان سے اچھا کام کوئی نہ بھی ہوا ہو تو یہ تو کارِ خیر وہ کر گئے کہ ہم سے جانشین چھوڑ گئے۔

بیگم۔ مگر اُن کے عقائد کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟

ڈیش۔ وہ خود تو میدان میں آکر لڑنے سے رہے۔ اب تو جو ہم کہیں سو وہ ہیں۔ عصائے موسوی اور قبائے یوسفی سے آخر ہمیں کچھ کام لینا ہے یا نہیں؟ اگر لینا ہے تو اپنی طرح ان چیزوں کو بدل کر قدامت پسندی کا ثبوت دیں۔

بیگم ۔آپ دراصل ہربات کی تضحیک کرتے ۔رہتے ہیں اور مولوی بچارے سچ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں الحاد کا زور ہے ۔
خود تو ملحد ہوئے سو ہوئے اب بزرگوں کو بھی آزاد خیال کرنے چلے ۔ یہ بے ایمانی کیا نیا مذہب ایجاد ہوا ہے ؟
ڈیش ۔عورتوں کی اس تنگ خیالی سے دق آکر اسلام نے گذشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی عالم عورت
پیدا نہیں ہونے دی ۔ ہر نیا مذہب ابتدا میں ایک ناپسندیدہ بدعت ہوتا ہے ۔ مگر ساتھ ہی ہر نیا مذہب یہی
کہتا ہے کہ دنیا کو وہی سکھایا جارہا ہے جو پہلے پیغمبر سکھلا گئے ۔
بیگم ۔میں تو بحث کے مخمصے سے کوسوں بھاگتی ہوں ۔ یہ بتائیے کہ چائے ابھی منگواؤں یا تھوڑی دیر ٹھیر کر !
میں ۔ جیسے تمہاری خوشی ڈارلنگ
ڈیش (تمسخر سے) ایمانداری کے دعوے اور ساتھ ہی ملحدوں کو چائے کی دعوت ؟
بیگم (قہقہ لگا کر) یہی تو ہماری اخلاقی عظمت کا ثبوت ہے کہ سوشل تعلقات میں مذہبی اختلاف ہارج نہیں ہوتے ۔
اللہ کے بندے آپ کو چائے پلائیں گے مگر اللہ آپ کو جہنم ہی بھیجے گا ۔
ڈیش ۔مجھے جہنم رسید کر کے آپ کو کیا خوشی ہوگی ؟
بیگم (ہنستے ہوئے) بے انتہا خوشی! یہ خوشی کہ انصاف ہوا اور سچ پوچھو تو جنت میں رہنے کی اصل خوشی یہی ہے
کہ جن لوگوں نے یہ نہ مانا وہ جہنم میں ہیں ۔ تمام اصلی اور سچی خوشی کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی اور اپنی غلطی کے باعث
تکلیف میں ہو ۔
ڈیش ۔معاذ اللہ ، معاذ اللہ ۔

(بیگم چائے کے لئے حکم دینے جاتی ہے)

میں ۔کیا تم کبھی بھی متانت سے کسی مشکل مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہو ؟
ڈیش ۔میں تو ہمیشہ ہی متانت سے گفتگو کرتا ہوں ۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے اگر کسی نے شیطان
سے درشت کلامی کی ؟
میں ۔ لاحول ولا قوۃ ! عجب احمق ہو ! شائستگی سے گفتگو کرنا ہر شریف آدمی کا ذاتی فرض ہے ۔ متکلم چاہے کوئی
ہو ۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شیطان جو مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی وجہ زیادہ تر غالباً یہ ہے کہ ہم اسے
ہر وقت ستاتے رہتے ہیں کبھی شیطان الرجیم کہتے ہیں ، کبھی اعوذ باللہ کہتے ہیں ۔ آخر اس فضول دل آزاری
سے حاصل کیا ہے ؟ اگر ہم اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ہمیں کم دکھ دے !

ڈیش ۔کیا مطلب ؟

میں ۔ یہ مطلب کہ اگر خوشامد خود خدا کو پسند ہے تو شیطان کو تو بہت ہی زیادہ پسند ہوگی ۔کیوں ہم شیطان کی اس کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائیں ؟ جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے ۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگرسی یا مہاسبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے ۔شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی اور کانگرس کا بھی بھلا ہوگا ۔ہم لوگ اپنی کج اخلاقی سے خواہ مخواہ شیطان کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں ۔

ڈیش ۔خیال تو بہت اچھا ہے مگر مہاتموں اور پنڈتوں میں شیطان بچارا کیا کرے گا ؟

میں ۔کرے یا نہ کرے ہمارا تو کچھ چھٹکارا ہو ۔

ڈیش ۔ اچھا تو تم شیطان کو ہر دلعزیز بناؤ اور میں بزرگوں کے عقاید کی اصلاح کروں ۔ اس تقسیم کار سے شاید قوم کچھ ابھرے ۔

فلک پیما

سحرِ نغمہ

شبِ سیاہ ، خموشی ، تلاطمِ انجم

فضا میں نالہ کناں ہے مغنّیہ کی صدا

عیاں ہے کیفیتِ کائنات تو لیکن

جو میرے دِل پہ گزرتی ہے کہہ نہیں سکتا

اختر

انصاری دہلوی

بزمِ خرابات

(۱)

ساقی! اُٹھ، صبح، بادۂ گلگوں لا، شتاب

لیے ہوئے ہے دل کو تشنۂ بادہ

حلقہ میں ہے شیخ کے تلاوتِ قرآں!!

میں، اور تصورِ بتِ ...!

لاحول و لا قوۃ الّا باللہ

(۲)

ہے اوج ہی اوج، پیش و پس، اے ساقی

باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی

یہ آ گیا عرش، اور صہبا ستوفن

وہ جھک گیا آسمان، بس اے ساقی!!

(۳)

رندوں کو روا ہے کامرانی ساقی

ہے زہد و جزا فقط کہانی ساقی

محشر میں اگر ہوئی بھی پرسش، بالفرض

دے دے گی جواب نوجوانی ساقی

(۴)

مجبور ہے، کر لطف کے اوقات، اے دل

بیکار ہے کوشش، اول بھی خرافات، اے دل

رونا ہے اگر، وقتِ صبح رونا ہوگا

خاموش! کہ باقی ہے ابھی رات، اے دل

جوش
ملیح آبادی

تاریکی

میں نے ایک خواب دیکھا، جو اصل میں خواب نہ تھا،

روشن سورج بجھ گیا تھا، دھندلے بے نور ستارے لامحدود خلا میں بھٹکتے پھرتے تھے، اندھی اور تاریک دنیا چاند کی کرنوں سے محروم ٹھنڈی ہوا میں گردش کر رہی تھی۔

صبح آئی اور چلی گئی، آئی اور اپنے ساتھ دن نہ لائی۔

انسان اپنی بربادی کے خوف میں ساری خواہشات بھول گئے تھے، تمام دل روشنی کے لئے خود غرضانہ دعاؤں میں مشغول تھے، لوگ آگ جلا جلا کر زندہ تھے۔ حکومت کرتے ہوئے بادشاہوں کے محلات، غریبوں کی جھونپڑیاں اور تمام ذی روحوں کے مسکن روشنی اور گرمی پہنچانے کے لئے جلا ڈالے گئے تھے۔

شہر کے شہر جل رہے تھے اور انسان اپنے مشتعل گھروں کے چاروں طرف جمع تھے، کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر دل کو ڈھارس دیں۔

ایک خوفناک امید تھی جو ساری دنیا میں باقی رہ گئی تھی۔

جنگلوں کو آگ لگا دی گئی تھی ـــ لیکن لمحہ بہ لمحہ وہ جل جل کر گرتے جاتے تھے، اور اُن کی روشنی مدھم ہوتی جاتی تھی، چٹختے ہوئے درختوں کے تنے مہیب آواز سے پھٹ کر بجھ جاتے تھے، اور اندھیرا ہو جاتا تھا۔

آدمیوں کے چہرے اس ڈگمگاتی ہوئی روشنی میں ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے ـــ اُن میں سے کچھ لیٹ گئے، اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے، اور بعض نے اپنی ٹھوڑیوں کو اپنی بند مٹھیوں پر رکھ لیا اور مسکرانے لگے، اور کچھ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے، کہ اپنی جلتی ہوئی چتاؤں میں لکڑیاں ڈالیں اور پھر مایوس ہو کر اندھیرے آسمان کی طرف جو گذری ہوئی دنیا کا سیاہ تابوت معلوم ہوتا تھا، مجنونانہ بے چینی سے دیکھتے تھے، اور لعنت بھیجتے ہوئے زمین پر گر گر کر ہانپنے لگتے تھے۔

جنگلی پرندے چیختے تھے اور سہم کر اپنے بیکار بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر آگرتے تھے، خوفناک درندے مطیع ہو گئے تھے اور کانپتے ہوئے شہروں میں گھس آئے تھے، سانپ زمین پر رینگتے تھے اور لوگوں کو لپٹ لپٹ کر پھنکاریں مارتے تھے، مگر اُن کا زہر ختم ہو چکا تھا ـــ اُن کو کھانے کے لئے مار لیا جاتا تھا۔

جنگ جو کچھ عرصے کے لئے بالکل ختم ہو گئی تھی پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔

ایک ایک نوالہ خون سے خریدا جاتا تھا، اور ایک دوسرے سے دُور دُور اندھیرے میں بیٹھ کر زہر مار کر لیا جاتا تھا۔

محبت باقی نہ رہی تھی۔

دنیا کو صرف ایک خیال تھا اور وہ فوری اور گمنام موت کا خیال تھا۔

قحط نے اپنا اثر تمام اعضا پر ڈالنا شروع کر دیا تھا، آدمی مرتے تھے اور اُن کی ہڈیوں کو مثل اُن کے گوشت کے کوئی مزار نصیب نہ ہوتا تھا، ایک کمزور آدمی دوسرے کمزور آدمی کو کھا لیتا تھا، حتیٰ کہ کتے بھی اپنے مالکوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئے، سوائے ایک کے کہ جو اپنے آقا سے اُس کے مرنے کے بعد بھی وفادار رہا، پرندوں، درندوں اور بھوکے آدمیوں سے اُس نے اپنے آقا کی لاش کو بچایا، یہاں تک کہ بھوک نے اُن میں سے بہت سوں کو آ لیا اور باقی کے اُن مرے ہوؤں کو چٹ کر گئے۔ خود اپنے لئے اُس نے کوئی غذا تلاش نہ کی، بلکہ اپنے مالک کا ہاتھ چاٹتے ہوئے جس سے کہ اُسے تھپکی کی کوئی اُمید نہ تھی، وہ ایک دردانگیز سسکی بھرتا ہوا مر گیا۔

مجمع آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔

ایک بڑے شہر میں سے صرف دو زندہ رہے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے، وہ دونوں ایک بڑے مندر میں قربان گاہ کے بجھتے ہوئے انگاروں کے قریب ملے جہاں بہت سی متبرک اشیاء ناپاک استعمال کے لئے ڈھیر کر دی گئی تھیں، انہوں نے اپنے ٹھنڈے اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے بھوبل کو کُریدا اور چند مدھم انگاروں کو اپنے کمزور سانس سے ایک موہوم زندگی کی امید میں پھونکا، ایک چھوٹا سا تمسخر آمیز شعلہ بلند ہوا، شعلے کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چیخ ماری، اور چیخ مار کر مر گئے، وہ صرف ڈر کر مر گئے، اور کسی نے کسی کو نہ پہچانا، کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کے چہرے کو بھوک نے شیطان کی طرح بھیانک کر دیا تھا۔

دنیا خالی ہو گئی تھی۔ کبھی آباد و پُرشوکت، اب ایک بیکار ڈھیر، بے موسم، بے برگ، بے انسان، بے زندگی، موت کا ڈھیر۔ مٹی کا بے ترتیب مجموعہ۔ دریا، جھیلیں، سمندر سب ساکن تھے، اُن کی خاموش گہرائیوں میں کوئی حرکت نہ ہوتی تھی۔

جہاز بے ملّاحوں کے سمندروں میں سڑ رہے تھے اور اُن کے مستول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، اور جونہی کہ وہ پانی پر گرتے تھے، خاموشی سے تیرنے لگتے تھے، کوئی لہر نہ اٹھتی تھی۔ لہریں مر گئی تھیں، مدوجزر اپنی اپنی قبروں میں پہنچ چکے تھے، آندھیاں بدبودار ہواؤں میں تحلیل ہو گئی تھیں، اور بادل ضائع ہو گئے تھے۔

تاریکی کو ان کی ضرورت نہ تھی ـــــ وہ خود تمام 'جہان' تھی۔

(لارڈ بائرن)

محسن عبداللہ

نفاست کا طلسم

بعض دولت مند ہندوستانی کوٹھیوں کے گول کمرے میں فرش فروش، میز اور کرسی، پردے اور قالینیں، آتشدان کے نمائشی نوادرات اور دیواروں پر رُوکھے پھیکے فوٹو کمپنیوں کے نوتعلیمیافتہ (یا ناتعلیمیافتہ) مذاق کا زندہ ثبوت ہیں۔ قالین اگر آگ بھبھوکا ہے تو پردے جوگی اور میز پوش خاکی۔ کرسیوں کے غلافوں کی آب و تاب اگر ایک بھی ہو تو بھی ہر کرسی کا دم خم الگ ہے۔ ایک پر بیٹھو تو تحت الثریٰ تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتی، اور جو دوسری پر بیٹھنا چاہو تو گویا کمر میں کسی نے آہنی سلاخ ٹھونک دی۔ جس قدر یہ کمرے آنکھ کے لئے گستاخ اور کمر کے لئے ناہموار ہیں اسی قدر ان کی روحانی آب و ہوا کثیف ہے۔ بھلا جہاں قالین چیخ چیخ کر پردے سے کہہ رہی ہو "بھیا! خدارا اپنے پاؤں تو ذرا ہٹاؤ" اور جہاں زرق برق میز پوش دیوار کی تصویروں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہوں وہاں ملنے کا کیا لطف، اور اگر مل بھی بیٹھیں تو ناممکن ہے کہ فرنیچر کے اس شور و بکا میں نیچی نظروں کا، میٹھی باتوں کا جادو چلے اور رنگ لائے۔

انسان بالکل پھول ہیں۔ جس طرح لُو پھولوں کو جھلس دیتی ہے اُسی طرح گرم فرنیچر خیال کو، خیال کی عروسیت کو سوخت کر دیتا ہے۔ ہزار رعنائی تصور سے انسان ایسے کمرے میں داخل ہو، فصاحت کے ہزار دُرِ شاہوار نثارِ خندۂ سیم تناں ہونے کے لئے تیار ہوں مگر جہاں ایسے کمرے میں ذرا بیٹھے تو باتیں یہ ہوتی ہیں کہ کلب میں آجکل جوتے میں دال بٹ رہی ہے، کانگرس کا چرخا نہیں چلتا، سرکار کا حقہ پانی بند ہے اور علیٰ ہٰذالقیاس۔ یعنی جو باتیں برآمدے کے کسی ذلیل کونے میں ہونی چاہئیں وہ فرنیچر کے تشدد سے گول کمرے میں اُگلی جاتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے گول کمرے ہیں بھی اسی قابل۔

جن لوگوں کو اس تنقید پر شک ہو، وہ ایک سیدھے سادے معیار سے اپنے گول کمرے کی لیاقت کو پرکھ لیں۔ کسی ماہرِ راگ شیریں ادا سے دو بول سُن لیں۔ اگر کمرے کا رنگ، پردے اور باقی لباس موزوں نہیں تو راگ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر جان دیدیگا۔ لیکن اگر کمرہ کسی نستعلیق ہستی کی توجہ کا ممنون ہوا ہے تو راگ پھیلے گا، چیزوں سے لپٹے گا، دلوں میں کھُبے گا، آنکھیں بند ہونگی، سارے جسم میں خفیف سا رقص ہوگا اور راگ روح کو لئے اُڑے گا۔

راقمِ حروف کو کسی کمرے کی توہین مقصود نہیں اور یہ تنقید محض تعلیمی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ امیر ہندوستانی کوٹھیوں میں اگر بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہے تو اب یہ بھی لازمی ہے کہ کمروں کی تعلیم کی بھی ابتدا ہو۔ بعض کوٹھیوں میں

اس وقت بھی گول کمرے نمایاں طور پر دلفریب ہیں۔اس ضمن میں بیگم ب، ت کا گول کمرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں انسانیت ہے۔اگلے دن چند منٹ مجھے تنہا اس کمرے سے ملاقات کا موقع ملا۔نہ تو کرہ مجھ پر جھنجھلایا نہ " اِدھر دیکھو، اُدھر دیکھو " کہہ کر اُس نے میرے کان کھائے ۔نہ کہیں رنگ ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے نہ تصویروں سے دیواریں جھکی پڑتی تھیں۔بعض اچھے گول کمروں کا سامان بھی بسا اوقات اس قسم کا ہوتا ہے جیسے غزل میں شعر یعنی ایک دوسرے سے آزاد، مگر بیگم ب، ت کے کمرے کے سامانِ آرائش میں غرورِ حسن سے بھی بڑھ کر خلوصِ یگانگت کی جھلک تھی، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزاج شناس نے ہر مختلف چیز کو زندہ اور با مذاق سمجھ کر اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھیک جگہ اور مناسب ہنشیں تجویز کئے ہیں اور اس مزاج شناسی کی داد میں کمرے کی ہر چیز خوش و خرم تھی +

جب میں داخل ہوا تو پہلی ہی کرسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ساتھ والی میز نے رسیلی آواز سے کہا " اس فوٹو کو تو ملاحظہ کیجئے!" فوٹو نے انداز سے کہا " میرے بناوٹ پر ستند کا کل میری Chin.[1] کے لئے کس قدر دلفریب Background (پس منظر) ہیں"۔ بندے نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے اس بہاری ادا کے عکس کی داد دی اور دل ہی دل میں کہا " کمرہ کیا ہے کسی کی طبعی نفاست کا طلسم ہے +

پرستارِ حسن

[1] نوٹ - Chin کا اُردو ترجمہ ایسے کمرے کے ذکر میں استعمال کرنا گناہ ہے سخت گنوار لفظ ہے، اس کمرے کی نفاست کا یہی کافی ثبوت ہے، کہ سینکڑوں میل اس سے دُور بیٹھے بھی اس کے خیال کے ساتھ زنخدان اور ذقن جیسے لفظ بھی ثقیل معلوم ہوتے ہیں +
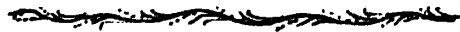
پروانہ

سلمائے سحر کے حسن کی ضو تاریک فضا پر چھانے لگی
وہ انجمِ رقصاں ڈوب چلے، وہ شمع کی لو تھرّانے لگی

جو مطرب و مے سے رنگیں تھی وہ محفلِ عشرت ختم ہوئی
خوابیدہ فضا نے کروٹ لی کیفیتِ غفلت ختم ہوئی

کچھ خاک کے ذرّے، کچھ پر ہیں بے برگ و نوا پروانوں کے
یا، دیکھ کہیں انجام نہ ہوں یہ شب کے حسیں عنوانوں کے

وہ آخرِ شب وہ دھندلا سا تجلّی بار سماں بھی ختم ہوا
وہ شمع بجھی، اُٹھا وہ دھواں، لو اب وہ دھواں بھی ختم ہوا

پروانہ کی ہستی میں کیا کیا عبرت کے خزانے ملتے ہیں
ہر دور میں اس کے کتنے لامحدود زمانے ملتے ہیں

اعجازِ وفا ہے صبر و سکوں سے تلخیٔ پیہم سہہ جانا
یوں آتشِ دل کے شعلوں میں خاموش سلگ کر رہ جانا

شب تیرہ دروں تھی شمع کی ضو نے محفلِ شب نورانی کی
پروانہ کو دیکھو، جس نے محبت ہی کے لئے قربانی کی

احساں کی لذت شمع کے جل بجھنے کی ہوس کا عنواں تھی
پروانہ کے دل میں لیکن صرف الفت کی تجلی رخشاں تھی

تعمیرِ حیاتِ شمع ہے مضمر شمع کے پیہم جلنے میں
پروانہ مگر مجبور نہیں اس راہِ وفا پر چلنے میں

اس طرح کوئی آزاد غرض، جاں اپنی کسی پر کھو نہ سکا
وہ کام ہوا پروانہ سے خود شمع سے بھی جو ہو نہ سکا

اختر

عبرت

"بھلا کیوں وہ لوگ جنہیں میں چاہتی ہوں یہاں نہ آئیں۔ آخر کوئی سبب بھی؟"

"بہت خوب تو پھر آپ مختار ہیں۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں،" یہ کہتے ہوئے عطیہ دریچہ کی طرف گئی اور غصہ میں وہاں کھڑی ہو کر دریچہ سے باہر کی طرف یونہی دیکھتی رہی۔ اگرچہ دراصل وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی۔"

"کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ یہ لوگ میرے کس کام کے ہیں۔"

"میری سمجھ سے بیزار کرکون ہمارے کس کام کا ہے،" عطیہ نے جھلا کر کہا۔

جمال نے تیزی سے کمرے کے فاصلہ کو طے کیا اور بڑھ کر کسی حد تک کرختگی سے اپنا ہاتھ اپنی بیوی کے نازک کندھے پر رکھا اور کہا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھو کہ میں ان بے فکرے مردوں اور عورتوں کو ہر شام اپنے گھر میں بھرے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"آپ ایسے ہی مہمان نواز تو ہیں" عطیہ نے طعن سے کہا۔ "اور تم تو ہمیشہ ان ہی لغو قانونی کاغذات یا مختلف اخبارات میں دفن ہوئے رہتے ہو۔ اور میں تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہا کروں، اور تمہاری جرابیں سیتی رہا کروں، کیوں ہے نا یہی بات؟"

عطیہ! میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ قانونی دنیا میں نام پیدا کروں۔ اور پھر تمہارے لئے روپیہ کی ریل پیل کر دوں۔"

"ہاں! تو یہ سب میرے ہی لئے ہے؟ جی بجا کیوں نہیں!"

بیوی کے الفاظ سُن کر جمال اس سے پرے ہٹ کر دور چلا گیا اور بولا "عورتیں بڑی ہی کوتاہ عقل ہوتی ہیں۔"

"میں عورتوں کے بارے میں تمہاری اس رائے کے خلاف احتجاج کرتی ہوں۔" عطیہ نے بیٹھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

"اور ہاں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بچوں کے سامنے یوں لڑا کریں؟"

"استغفر اللہ، قطعًا ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں بالکل تم سے متفق ہوں۔" وہ جھکا اور اُس نے اپنے بیٹے

کے بل کھائے ہوئے بالوں کو چھوا اور بولا "لو بچو اب لپنے اپنے بستروں پر جاکر سو رہو۔ دارا تم اور صفیہ تم بھی اپنا انجن لے لو"۔

"دیکھو جی یہ سگنل تو میرا ہے"۔

"جھوٹ جھوٹ یہ میرا تو ہے"۔

"اری بس کی گانٹھ کل تو تو نے اپنا سگنل توڑ ڈالا تھا" یہ کہنے کے ساتھ دارا نے غصہ سے اپنا سگنل چھین لیا۔ بس پھر کیا تھا صفیہ لگی چیخنے چلانے اور سسکیاں بھرنے۔

"صفیہ! دارا! مت لڑو" عطیہ نے یہ کہا اور اُٹھ کر اپنی ننھی سی بیٹی صفیہ کو گود میں اٹھا لیا پھر بولی "ادھر آؤ میرے بچو! کل تمہاری اناتلاش کر کے سگنل مرمت کر دے گی"۔

قبل اس کے کہ ماں بیٹی دوسری طرف جائیں۔ دارا نے اپنا کھلونا لے لیا اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولا "ابا جان بھلا کیا یہ صفیہ ضدن بس کی گانٹھ ہے کہ نہیں۔ دیکھئے اپنا انجن اور سگنل تو کل توڑ پھوڑ ڈالا اور اب میرے کھلونے پر قبضہ جما بیٹھی۔ ڈھٹائی تو اس کی دیکھئے"۔

جب تنہائی ہوئی اور جمال اپنے بیٹے کو گود میں لینے کے لئے جھکا تو اُس کا چہرہ کسی قدر مکدر تھا۔ اور اُس نے بیٹے سے کہا "ارے میاں وہ غریب چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اس لئے تمہیں کو صبر و تحمل کی عادت ڈالنی چاہئے"۔

"ابا جان! وہ لڑکی ہے اسی لئے تو ضدی ہے۔ کیوں ہے نا؟"

اُس وقت اُس کی ماں کمرے میں واپس آگئی۔ اس کا باپ بولا۔ وہ ضدی نہیں ہے، دارا وہ ضرور تمہاری چیز تم کو دے دیتی، اگر تم ہی ذرا نرمی کا برتاؤ اس سے کرتے"۔

لڑکے نے برہمی سے تیوری چڑھائی اور بولا "لیکن میری بجائے وہی کیوں نرمی نہ برتے" اس سوال پر اُس کا باپ یوں ہی سا مسکرا دیا۔

"ارے بوڑھے بزگوار دارا یہ ہم مردوں ہی کا حصہ ہے کہ نرمی برتا کریں"۔

"لیکن کیوں"؟ معصوم بیٹے نے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلاتے ہوئے جرات سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بتکرار کہا۔

باپ بولا "بیٹے! نرمی اور مہربانی اچھی چیز ہے اور جب تم بڑے ہو گے تب تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ لو اب بھاگو اور اگر ہو سکے تو کل اپنی بہن کا انجن مرمت کر دو"۔

دارا لڑکیوں کے متعلق کچھ بڑبڑاتا اور لڑکیوں کی ضد اور انجنوں اور سگنلوں کی باتیں آپ ہی آپ کرتا ہوا ماں کی طرف بڑھا تاکہ وہ اُسے پیار دے۔ اور گو وہ ناراض سی تھی تاہم اُس نے اُسے پیار کیا۔ دارا ماں سے پیار لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہر ہر قدم پر مخالفت اس کی حالت سے ظاہر تھی۔

بچے کا جانا تھا کہ عطیہ غضبناک ہو کر خاوند پر برس پڑی۔ اور بولی یہ کیا غضب ہے کہ تم ہمیشہ عورت ذات پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہو؟ اور یہی تم ابھی سے اپنے بچے کو سکھا رہے ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح عورت سے نفرت کرنے لگے اور تم ہمیشہ بچے کو دکھاتے ہو اور سمجھاتے ہو کہ نامراد عورتیں ہی بیہودہ اور الٹی سمجھ کی ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی تم نے یہی ثابت کیا ہے کہ نصیبوں جلی صفیہ ہی ضدی اور ذلیل ہے۔

"بجا! تو کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟"

"مجھے تو پتہ نہیں کہ تم نے کبھی اس بات کے جاننے کی بھی کوشش کی ہو کہ سگنل درحقیقت ہے کس کا؟"

جمال یہ سن کر کسی قدر تلخ ہنسی ہنسا۔ اور بولا "میری پیاری عطیہ کیا یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے کہ بچوں کے سامنے یوں لڑا جائے؟"

"میں نے تو کوئی لڑائی نہیں کی ہاں تم ہی ہو جو لڑائی مول لیتے ہو۔ اور یہ تمہارا قاعدہ ہے کہ تم خطا ہمیشہ مجھ کم نصیب کی بتایا کرتے ہو۔ میرے ملنے والوں سے تمہیں نفرت ہے اور یہ بات بھی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ میں کبھی ہنس بول ہی لیا کروں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہو تو میں ——— میں تو تم کو بالکل چھوڑ چھاڑ کر کہیں کو نکل گئی ہوتی۔"

"اور یہاں سے جا کر اپنی ماں کے پاس رہتیں کیا اچھی بات ہے نا!" جب اُس کے خاوند نے یہ فقرہ کہا تو کہہ کر مزا اُٹھا ہنسا بھی "عطیہ! بھلا تم اپنے آپ کو کچھ کم سمجھتی ہو۔ ماشاءاللہ تم ایک آتش فشاں پہاڑ ہو۔ میری تو خیر جب تم اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھیں تو اُس سے تمہاری کیا بنتی تھی؟"

"بس جی بس! میرا تو آپ سے جی جلا ہوا ہے" عطیہ نے چلا کر کہا اور تمہارے آئے دن کے طعنوں سے میرا سینہ چھلنی ہو چکا ہے اور تمہارے عورتوں کے متعلق پرانے فرسودہ اور احمقانہ خیالات سے مجھے دلی نفرت ہے میں تو اب یہ چاہتی ہوں کہ یہاں سے کہیں چلی جاؤں اور اپنے ٹکڑے کی آپ فکر کروں۔ آخر رزاق تو خدا ہے۔ میں تو کب کی سب کچھ کر گزرتی اگر بچوں کا پاس نہ ہوتا اور میں ——— میں تو آج ہی چلی جاؤں گی۔ بے بس میں تو اب جا کر سوتی ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ گویا کود کر کمرے سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے کواڑ بند کرتی گئی۔ . . . .

جمال کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے قانونی کاغذات اٹھا کر قریب ہی بچھی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ امید اور مسرت کی کیسی تباہی اور بربادی ہے! وہ اور عطیہ جو پوری والہیت سے ایک دوسرے کے پجاری تھے اب ان کا کیا حال ہے! عطیہ جس میں وہ تمام نسوانی محاسن بحد انتہا موجود تھے جو وہ کسی عورت میں خیال کر سکتا تھا کیسی سمجھدار اور خوش دل ہشاش بشاش اور ہمیشہ اور ہر حال میں اُس کی ہمدرد اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والی تھی۔ اسے اب کیا ہو گیا۔ ابتداءً اُن کے باہم مل کر زندگی بسر کرنے کے کیسے کیسے دلربا ارادے تھے، جو اب خاک میں مل چکے ہیں۔
جمال کو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اپنی شادی کے ابتدائی ایام مسرت جو کشمیر میں بسر ہوئے تھے یاد آ گئے۔ گلمرگ کی طویل، خاموش، پُرکیف چاندراتوں اور مسرت و سرشاری کے مختصر دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اُس زمانہ میں کام کاکسے ہوش تھا۔ دنیا رہے یا جائے اک پیار کرنے والی عورت سب کا نعم البدل ہے۔ پھر اسے وہ زمانہ بھی یاد آ گیا کہ اس جنتِ ارضی کی سیر سے وہ کس بے دلی کے ساتھ بمبئی میں اپنے کام پر واپس آیا تھا اور یہاں آ کر انہوں نے اپنے لئے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ بیوی کی سلیقہ شعاری اور سلیم مذاق کے باعث ہر ایک بات دونوں کی طبیعت اور میلان کے مطابق انجام پاتی تھی۔ اس کے بعد اُسے اپنی بیوی کی تکلیف کی وہ گھڑیاں بھی یاد آئیں جب وہ اپنے پہلوٹے بیٹے اور بیٹی کی پیدائش پر موت کے پنجے سے بمشکل بچی تھی۔ اور پھر اس کی بتدریج آہستہ آہستہ شفایابی، اور خود اس کا اپنی بیوی کی نہایت دلسوزی سے تیمارداری کرنا اور محبت وغیرہ غرض گذری ہوئی ایک ایک بات اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اس کے بعد دفعتہً اُس کی بیوی کے مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ روپیہ اپنے مصارف کے لئے مانگنے اور نئے نئے طریقے اپنے دل بہلاؤ کے لئے ایجاد کرنے لگی۔ اور اس طرح آئے دن روپے کے سوال نے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں ایک ناگوار تغیر پیدا کر دیا۔

عطیہ نے ایک گراموفون خریدا۔ اور جمال کو اس سے چڑ تھی۔ اُس نے نہ صرف معمولی طور پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ نغمہ و سرود کی مجالس منعقد کرنی شروع کیں، بلکہ کھانے کے بعد روزانہ چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بلانا شروع کر دیا۔ جمال کو مجال نہ تھی کہ وہ ان کدکڑوں کی شکایت کر سکے۔ وہ اسی طرح اپنے آپ کو اپنے دل بہلاؤ میں مختار سمجھتی تھی جیسا کہ اُس کے نزدیک جمال اپنے مذاق کی باتوں میں مختار تھا۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اُس کے ساتھ اب شاید نادانستگی میں آزادی کی ایک نئی ہوا بھی بیوی صاحبہ کے دماغ میں بھر گئی کہ بعض اوقات کسی قدر سختی اور تندی کے

ساتھ وہ اپنے خاوند کی معمولی سے معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر رائی سے پہاڑ بنا دیا کرتی تھی "یہ روپیہ میرا ہے" یہ تو اُس کی روز کی بولی تھی۔ باہر کے لوگ جب اُس کے گھر پر آتے تو وہ شوہر کے لئے معمولی رقعہ لکھ کر یا پیغام دے کر جہاں جی چاہتا چلی جاتی۔

اب تو یہ حال تھا کہ جمال کو اپنی بیوی کی زندگی میں کوئی حیات بخش عنصر دکھائی نہ دیتا تھا حتیٰ کہ یہ بچے بھی میاں بیوی میں باہمی سرپھٹول کا ایک خطرناک ذریعہ بن گئے تھے۔ اس لئے وہ کیا کر سکتا تھا؟ عطیہ اس کے پیشہ سے بھی ناراض تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند کام وام تو سب تہ کر کے رکھ دے اور اُس کے کھیل کود میں شامل ہو جائے۔ اور اس کے باوجود روپیہ دینے میں کمی نہ ہونے پائے۔ لیکن جمال کا اصولی طور پر یہ پختہ اعتقاد تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کا گھر اُس کی ذاتی سلطنت ہے۔ اگر اُس کے گھر پر اِدھر اُدھر کے "بُتے ہوئے" شرفا کی چڑھائی ہو تو کم از کم اس کی اجازت سے ہونی چاہئے۔

اسراف نے عطیہ کو بدل دیا۔ اُس کے لئے زندگی کے بعض عجیب مگر نئے دروازے کھل گئے۔ وہ خود تو ان میں بذوق وشوق داخل ہو گئی، لیکن اپنے خاوند کو تنہا، حیرت زدہ اور بے چین کھڑا چھوڑ گئی۔ یہ سب باتیں تو تھیں مگر جمال کو یقین تھا کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور یقیناً ہو جائیں گی، مگر اُس وقت جب اس کو مقدمات میں بڑی بڑی فیسیں ملنے لگیں گی۔ جمال کو اپنی ذات پر غیر محدود اور بجا بھروسا تھا کہ اُس کی آمدنی ضرور ترقی کرے گی۔ اُس وقت وہ عطیہ کی ہر ایک فرمائش بجا لایا کرے گا لیکن ابھی تو یہ بات میسر نہ تھی۔ جب زمانہ بدلے گا تو وہ اسے اپنے ہمراہ کہیں باہر لے جائے گا، اور یوں اُن کے لئے گویا ایک نیا دورِ مسرت شروع ہوگا۔ رہے یہ باہمی جھگڑے اور شکر رنجیاں جن سے اس کے دل میں گھاؤ پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق اس کا خیال تھا یہ کدورتیں محض اُن کی زندگی کی سطح پر ہیں جو جلد ہی فراموش ہو جائیں گی۔

جمال تو اپنے ان خیالات کے سمندر میں تیر رہا تھا اور عطیہ اپنے بستر پر بیٹھی لباسِ شب خوابی پہن رہی تھی اور آپ ہی آپ غصہ اور اشتعال کی حالت میں باتیں کر رہی تھی وہ اپنے خاوند کے فرسودہ خیالات سے تنگ آچکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی اصطلاحاتِ شکایت اُس کی نوکِ زبان پر تھیں۔ "اب میں ان بیہودگیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور میری ان "مصیبتوں" کی تلافی کوئی چیز حتیٰ کہ بچے بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس روز روز کی اِتنا کلکل سے "نفرت" کرتی ہوں اور میرا تمام اندوختہ اپنا غم غلط کرنے میں صرف ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ جمال نے تو روپیہ دینے سے "انکار" کر دیا ہے۔ وہ ان باتوں کو پسند

نہیں کرتا اس لئے وہ روپیہ بھی نہیں دیتا۔ "آپ" کہتے ہیں کہ میں بچوں کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ چاہتے ہیں میری جوانی بغیر کسی تفریح و تفنن کے گزر جائے"۔ سرکشی کا ایک طوفان اُس پر سوار ہوا اُس نے اپنا لبادہ اوڑھا اور اُٹھ کر ملاقاتی کمرے کی طرف دوڑی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بگولے کی طرح اپنے خاوند کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"اُدھر دیکھو! تم سے طعنے سنتے سنتے اور یہ دیکھ دیکھ کر کہ میرا ہی لڑکا میرے اور اپنی بہن صفیہ کے مخالف ہو گیا ہے، میرا کلیجہ پک گیا ہے اور میں سخت بیمار ہوں۔ اس لئے بھی کہ میں بہت سست اور بے کار رہتی ہوں اور جب کچھ تفریح کرنا چاہتی ہوں تو بُرے الفاظ سنتی ہوں، میں کل یہاں سے رخصت ہوتی ہوں۔

جمال نے کہا "میں خود بچے کو ہمراہ لے کر پونا جا رہا ہوں۔ تم بھی کسی قدر خستہ ہو چکی ہو۔ یہ تبدیلی تمہارے لئے بہتر ہو گی"۔

"میں بہتری ہی کے لئے تو یہاں سے جا رہی ہوں"۔ عطیہ نے باختصار کہا۔

"کیا تم دیوانی ہوئی ہو"

"میں کیوں دیوانی ہوئی بالکل تندرست اور باہوش ہوں لیکن اب میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی"۔

"مجھے تم خارج از بحث سمجھو۔ مگر کیا سچ مچ تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم اپنے بچوں کو چھوڑ دو گی محض اس لئے کہ ہم میں کچھ شکر رنجیاں ہیں"۔

"نہیں" عطیہ گرج کر بولی "اس لئے نہیں کہ ہم میں بعض شکر رنجیاں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میں بیمار ہوں — سخت بیمار۔ اور میری بیماری تمہارے ہر وقت کام میں لگے رہنے اور تمہارے طعنوں اور میری اپنی بے کاری و سستی اور زندگی کی خوفناک یکسانیت کے باعث جو تم میرے لئے تجویز کرتے ہو بڑھتی جائے گی"۔

"میں اب تک ایک بہت بڑے اور نہایت مشکل مقدمہ کے لئے تیاری کر رہا تھا"۔ جمال نے نرمی سے جواب دیا۔

"جی ہاں! تم تو تعطیلات کے موقع پر بھی اس سال یونہی لگے رہے تھے۔ تم خود تو کسی تفریح میں شامل ہوتے نہیں البتہ ہر ایک چیز پر طعنہ زنی کرتے رہتے ہو"۔

"میں بے کاروں اور بے فکروں کی طرح راتوں کو موٹروں پر اِدھر اُدھر مارا مارا نہیں پھر سکتا"۔

"بہت اچھا۔ تو میں تو یہی کروں گی۔ لو بس میں جاتی ہوں"۔ ....

"جاتی کہاں ہو؟" اب جمال کا چہرہ بالکل سفید اور سخت ہو گیا اور اُس پر شکنیں پڑ گئیں۔ مگر باوجود اس کے اُس کی آواز اُس کے قابو میں تھی۔

"مجھے نہیں معلوم شاید پہلے لیلیٰ کے پاس جاؤں"
"یہ تو وہ عورت ہے کہ میں اندازاً روادار نہیں کہ تم اُس کے پاس ٹھیرو"
"نہیں میں اس کے پاس نہیں ٹھہرتی لیکن میری پیزار سے کہ تم کیا خیال کرتے ہو کیا نہیں کرتے۔ وہ میری دوست اور سہیلی ہے"
"یا دشمن؟"
"نہیں وہ تو دشمن نہیں البتہ تم میرے دشمن اور جان کے لاگو ہو" عطیہ نے وحشیانہ طور پر چیخ کر کہا۔ "ذرا خیال تو کرو میرے دوستوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کہتے ہو۔ میں لیلیٰ کو چاہتی ہوں مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری دوست ہے!"
"اسے کوئی قابلِ رشک شہرت حاصل نہیں"
"بالکل جھوٹ سفید جھوٹ۔ چند بے شعور اور حاسد لوگ ایسی ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔ لو میں جاتی ہوں میں تو کل کو یہاں سے چلی ہی جاؤں گی"
یہ کہہ کر عطیہ جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور غریب جمال پھر دوبارہ اپنی آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ یقیناً یہ بہت بیہودہ بات تھی۔
شاید یہ بات غیر صحیح تھی کہ عطیہ محض چند بے معنی شکر رنجیوں کی بنا پر اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی تھی۔ مگر کیا اسے اپنے قانونی پیشہ کی بنا پر یہ تجربہ حاصل نہ تھا کہ تقریباً روزانہ بعض احمق نوجوان عورتیں اپنے خاوندوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ معاً ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دل میں چمک گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے تو جمال اس خیال سے ادھ موا سا ہو گیا۔

اس کے ایک لمحہ بعد وہ تیزی سے اپنی بیوی کے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے بلا تامل اُس کے کمرے کے کواڑ کھول دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی برش ہاتھ میں لئے کسی خیال میں گم بیٹھی ہے "عطیہ!" یہ کہہ کر قدم بڑھاتا ہوا وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی آواز میں جو اس کی بیوی نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی بولا۔
"کیا تم میں اور مجھ میں کوئی اور شخص تو روک نہیں ہو گیا؟"
"اُس کی بیوی نے تقریباً تبسم کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ کر کہا "اس ستم ظریفی کا شکریہ۔ میری ہتک کے لئے کچھ اور کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی اٹھا نہ رکھئے"؟

عطیہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جس سے اُس کے خاوند کو یقین ہوگیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا حرف حرف درست ہے اس خیال سے جو فوری اور اچانک راحت اُسے حاصل ہوئی اُس نے ایک لمحہ کے لئے تو اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کردی کہ وہ اپنے بڑے اور مضبوط بازوؤں میں اسے لے لے اور اپنے سینہ سے بھینچ کر لگا لے، مگر ایک طبعی شعور نے اُسے فوراً متنبہ کردیا کہ یہ طریقہ برتنا موزوں نہیں۔ دل میں یہ خیال گذرنے کے ساتھ ہی وہ بولا۔

"تو پھر تم دیوانی ہوئی ہو جو کہتی ہو کہ مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"نہیں صاحب میرے ہوش بجا ہیں۔ کم از کم اتنی باہوش تو ہوں جتنے آپ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتے بس بس یہاں سے آپ تشریف لے جائیے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں آئیں اور آسمان سر پر اٹھائیں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اور نہیں تو اتنی مہربانی تو کیجئے کہ میرے کمرے کو میرے ہی لئے رہنے دیجئے۔"

"میں تو خود اسے چھوڑ کر جانے کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میں اسے ایک سبق دینا چاہتی ہوں۔" عطیہ اپنے زانوؤں پر پیڈ رکھے ہوئے ایک سہیلی کو خط لکھ رہی تھی "میں اماں حوّا کے زمانہ کی کہنہ اور پھوہڑ عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو ہم پر تو طعنہ زنی کرتی ہیں لیکن خود کسی ایک مرد کی بھی دیکھ بھال نہیں کرسکتیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسی لئے میں اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جارہی ہوں۔ لیکن برخلاف اس کے سچ تو یہ ہے کہ وہی وہ میری رگ رگ اور ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ میری ہر ایک تفریح اور کھیل سے بے کیف ہو جاتا ہے اور اتنا بُرا مناتا ہے کہ الٰہی توبہ۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ دیولالی آؤں یا کسی دوسری جگہ کا نام لیا تھا۔ بہرحال اب میں دو مہینوں کے لئے آزاد ہوں۔ اور خدا کا شکر اپنی تنہائی، مبارک تنہائی کے لئے ادا کرتی ہوں۔ اور وہ بھی سمجھ تو جائے گا۔ خدا اس کو برکت دے۔ جس وقت اُسے گھر کا انتظام آپ کرنا پڑے گا اور بچوں کی نگرانی بھی کرنی پڑے گی تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا۔ میں خوشی سے اُسے معاف کرتی ہوں اے میرے پیارے خدا میری مدد کر۔ میری ازدواجی زندگی کو آسان کر۔ لیکن ہائے ہائے۔ ارے دیکھو تو سہی یہ مرد کس قدر احمق ہیں!" . . . . . .

عطیہ نے اپنے خط کو سربمہر کرکے بند کردیا تو مینا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"بانو! میاں دارا اب سے دُور کچھ علیل تو نہیں ہیں۔ مجھ سے تو انہیں دیکھا نہیں جاتا۔ کیا آپ آتی ہیں؟ جب میں کھانا کھا کر اُن کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ کپکپا رہے تھے۔ اور اُن کا ماتھا تو بہت ہی گرم ہے۔"

عطیہ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی اور دفعتہً اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

"کیا کہتی ہے ری مینا! نہیں وہ بیمار نہ ہوگا۔ ابھی وہ چائے کے لئے نیچے آیا تھا تو بالکل بھلا چنگا تو تھا"۔

"جی ہاں بیوی! وہ دن بھر تو ماشا اللہ اچھے خاصے تھے"۔ کھلائی مینا نے کہا "پر ابھی ابھی کچھ مزاج خراب ہوا ہے۔ میں جانوں بہتر تو یہ ہے کہ فوراً ڈاکٹر میر صاحب کو بلالیں"۔

عطیہ نے اپنے بستر پر دراز ہو کر دوسری طرف رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "رسیور" سنبھالا اور کہا "نہیں ہیں نہیں، مینا تم ہی ٹیلیفون پر ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً یہاں آجائیں۔ اور میں دارا کے پاس جاتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ تو دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور بچوں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا ننھا سا معصوم بچہ بار بار کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہا تھا اور تنہائی میں یوں بول رہا تھا۔ "مینا! یہاں آؤ مجھے پیاس لگی ہے۔ اری مینا میرا سر پھٹا جاتا ہے مجھے پانی دو پانی"۔

ماں کو تو گویا وہ جانتا ہی نہ تھا۔

"میری جان، یہ دیکھو تو تمہاری امی یہاں ہے۔ قربان ہوگئی، واری گئی امی! میرے بچے امی تمہیں پانی پلائے گی"۔

بچے نے بڑی چاہت سے پانی پیا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اور ناطاقتی میں پڑا کراہتا رہا۔

کھلائی واپس آگئی اور بولی ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔ ہاں ہیں غریب صفیہ کو تو آپ کے بستر پر سلا دوں خدا نخواستہ کوئی متعدی مرض نہ ہو"۔

عطیہ نے اپنے لڑکے پر جھکے جھکے ہی رضامندی کے لئے سر ہلا دیا۔ اور کھلائی صفیہ کو جو وہیں اپنے بستر پر سو رہی تھی اٹھا کر باہر لے گئی۔

ڈاکٹر آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی ہی دیر میں آیا ہے۔ بچے کا معائنہ کیا اور پھر عطیہ کو مخاطب ہو کر مختصراً کہا "کان کی تکلیف ہے۔ میں ایک دوسرے آدمی کو اس کی نگرانی کے لئے کل لے کر آؤں گا۔ یہ دوائی تو آج شب کو پلائیے اور نرس کا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے"۔

"یہ کان کی تکلیف کیا ہے۔ کہیں کان میں کوئی پھوڑا پھنسی تو نہیں ہے؟"

میں صبح تک تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں مجھے امید ہے کہ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے میاں کہاں ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں"۔

ڈاکٹر چند ضروری ہدایات اور ہمدردانہ الفاظ کہنے کے بعد جمال کے پاس چلا گیا۔ اور اُس سے کہنے لگا کان کے پیچھے ایک خطرناک قسم کا پھوڑا ہے۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے؟" جمال نے کہا۔ اور اُس کا چہرہ بے رنگ اور ستا ہوا تھا۔

"مجھے توقع ہے کہ یہ پھوڑا بڑھے گا نہیں۔ میں نے نرس کو سمجھا دیا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے لیکن اگر اپریشن کی ضرورت ہی پڑی ———— ممکن ہے کہ اپریشن کسی قدر گہرا بھی ہو۔ میں صبح غور کروں گا اور صبح سویرے ہی حاضر ہوں گا"

دوسرے دن تو دارا کی حالت بہت ہی خراب تھی اور غیر معمولی تعجیل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ اپریشن ہی ضروری ہے۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں ڈاکٹر اور نرسیں گھر میں بھر گئیں۔ کیونکہ عطیہ اس بات پر بالکل راضی نہ تھی کہ اُس کا بچہ شفاخانے میں جائے۔ صفیہ اپنے کھلنڈرے ساتھی کو یوں اچانک کھو کر کچھ پریشان سی ہوئی۔ مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک ننھی بچی ایک معصوم کے لئے ہوسکتی ہے۔

دارا کی حالت دم بدم بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور اُس کے ماں باپ اس فکر و اندیشہ سے بے حال ہوئے جارہے تھے کہ کیا یہ بچہ اُن سے چھن جائے گا۔ عطیہ کے دل میں کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے بازوؤں میں گر پڑے۔ لیکن اس کے مضبوط مگر پریشان چہرے پر ایک نظر کر کے وہ اپنا دل اُس کی طرف سے پتھر بنا لیتی تھی۔ بعض اوقات تو اُس نے جمال کے یوں مردہ دلی اور بے جگری سے اس کمرے میں آنے پر بھی برا منایا۔ اسے یہ خیال بھی بار بار آتا تھا کہ یہ شخص کوشش کرتا ہے کہ اس معصوم کو عورتوں کا مخالف بنا ڈالے۔ اور یہی ہمیشہ بیچاری صفیہ کے مقابلے میں لڑکے کی طرفداری کرتا ہے۔ غرض اس کی فکرمندیوں نے اُس کی نفرت کو اور بڑھا دیا۔ اور جمال بھی ان باتوں کو دیکھ رہا تھا اور افسوس کے ساتھ اپنے بچے کی حالت اور کام کی کثرت سے گھلا جارہا تھا اُس کے ہونٹوں پر مہر سی لگ گئی۔ اُس نے بیوی کی طرف کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ یہ باتیں بے کار تھیں۔

آخرکار وہ دن بھی خدا خدا کر کے آیا کہ میاں دارا کمزور و نقیہ ایسے کہ جسم میں خون کا ایک قطرہ نہ تھا چند منٹ کے لئے اپنے کمبلوں میں لپٹے لپٹائے بستر پر ہی بیٹھ گئے۔

"ماشاء اللہ! اب تو ہمارے "بڑے میاں" تم اچھے ہو رہے ہو" صبح کو مُلنے سے کچھ ہی پہلے اُس کے باپ نے کہا۔

"ابا جان! تو کیا میں کل نیچے چل سکوں گا؟"

"نہیں بھئی کل تو نہیں پرسوں شاید- اور میں تمہیں خود اپنی گود میں اٹھا کر نیچے لے جاؤں گا- ہے نا؟"

"نہیں اباجان! میں خود چل سکوں گا"

اُس کا باپ ہنسا اور بولا "کیا تم چل سکو گے بہت اچھا ہم بھی دیکھیں گے"

دارا نے پُوچھا "کیا صفیہ میرے انجن کے ساتھ کھیل رہی ہوگی؟"

اُس کے باپ نے مسکرا کر کہا "بھئی تم اچھے تو ہو جاؤ- میرا خیال ہے وہ ضرور کھیلتی ہوگی مگر تم اس کی پروا نہ کرو"

اتنا کہہ کر جمال اپنی بیوی کی طرف ہمدردی و صفائی کے لئے دیکھا کیا لیکن وہ دارا پر جھکے ہوئے اُس کے اردگرد کے کھلونوں کو درست کرتی رہی -

"دیکھتے جاؤ پھر دارا کو صفیہ کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی "اب جونہی کہ دارا تندرست ہوا وہی پرانے جھگڑے پھر زندہ ہو گئے"

جمال اپنے مطالعہ کے کمرے میں جاکر گذشتہ فکر و تردد کے تین ہفتوں کے متعلق سوچنے لگا- کیا عطیہ نے اُس کو چھوڑ کر چلے جانے کی احمقانہ دھمکی کا خیال اپنے سر سے نکال دیا ہے؟ اب تو اُس نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بیوی کو دکھا دے کہ اب وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا- چنانچہ اُس نے سرسری طور پر ایک مسودہ بھی تیار کر لیا تھا وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قول کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے- اور پھر جب بھی عطیہ نے اپنی گفتگو شروع کی وہ فوراً یہ تحریر اُس کے سپرد کر دے گا-

آہ! اُس کی حسینہ و جمیلہ پری وش عطیہ! وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اُس کی تصویر کو جو کمرے میں آویزاں تھی ایک وارفتگی کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا- وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے اتنی سختی کرے گا؟ کر سکے گا؟ یا وہ حد سے زیادہ نرم تھا اور ابھی اسے اور نرم اور ملائم ہونے کی ضرورت تھی؟ وہ اسے اپنے محبوب ننھے بچے کی نگرانی اور مسلسل تیمارداری میں فداکارانہ مصروف دیکھ کر پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا- لیکن جھگڑوں کو چکایا کس طرح جائے؟ اور عورتوں سے نباہنے کی صورت کون سی ہے؟ وہ اپنی آیندہ زندگی کے متعلق جب عطیہ اُس کے پاس نہ ہوگی غور کر رہا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ناممکن ہے حتیٰ کہ عطیہ کے نئے نئے خیالات اور اُس کے حد سے بڑھے ہوئے غصے اور نئی نئی آزادیوں کے باوجود وہ ہر طرح اُس کی محبت میں مبتلا اور ثابت قدم تھا- وہ اس کی زندگی بخش آواز، اُس کی نازک و دلکش ہنسی، اس کے حسن اور فہم و فراست کا شیدائی تھا عطیہ کی یہ رکھائی اور اکھڑپن

تو بعد میں اُن کی مسرور زندگی میں داخل ہوگیا تھا۔ اُس نے بتکرار اپنے دل میں اُس نا چاقی اور اس کے اسباب پر غور کیا جس نے ان کی مسرتوں کے ساز کو بے آواز کر دیا تھا۔ لیکن اس درز کو بند کرنے کی کوئی تدبیر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس دوران میں عطیہ بھی اپنے خاوند کی اس ہلکی طعن آمیز ہنسی پر غور کر رہی تھی جب کہ اُس نے دارا سے کہا تھا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ صفیہ ضرور تمہارے انجن سے کھیل رہی ہوگی"، اُس کی نفرت کا بجھتا ہوا شعلہ دوبارہ بھڑک اٹھا۔ اُسے عورتوں کے متعلق اس بے جھانہ بولی ٹھولی اور "نیم متوہمانہ" آواز کے سننے سے نفرت تھی۔ اس لئے اب جیسا کہ طے ہو چکا تھا وہ اپنی دوست لیلیٰ کے پاس جانے پر آمادہ تھی جس نے اُس کے آنے کے ارادے پر مبارکباد کہی تھی اور جس نے اس خلیج کو جو خود عطیہ نے اپنے اور اپنے میاں کے درمیان پیدا کرلی تھی اور وسیع کر دیا تھا۔ اتنے میں اُس کے بیٹے نے پکارا "امی جان! کیا صفیہ آکر میرے ساتھ کھیلے گی؟" دارا کی آواز تھکی ہوئی اور خستگی لئے ہوئے سنائی دی "ہاں میرے بچے! قربان گئی امی! کیوں نہیں وہ ضرور کھیلے گی اور اس سے تمہارا دل بہلے گا"۔

عطیہ نے صفیہ کو بلایا اور کہا "میری بچی بیٹھے بیٹھے کوئی اچھا سا کھیل کھیلو جس میں شور نہ ہو اور نیچے اوپر دوڑتی نہ پھرو کہ اس سے تمہارے بھائی کے سر میں درد ہونے لگے گا۔ امی کو اب چند خط لکھنے ہیں وہ جاتی ہے اور ابھی واپس آکر پیار کرے گی"۔

عطیہ نے یہ کہہ کر صفیہ کو ایک چھوٹی سی کرسی پر اُس بڑی کرسی کے سامنے جس پر میاں دارا کپڑوں میں لپٹے لپٹائے بیٹھے تھے بٹھا دیا اور خود سیڑھیوں سے اتر کر اپنے کمرے میں خط لکھنے کے لئے چلی گئی۔ وہاں جا کر اُس نے لیلیٰ کو تو یہ لکھا کہ وہ آیندہ دوشنبہ کو آتی ہے اور جمال کے لئے اس مضمون کا ایک مختصر رقعہ لکھا کہ وہ پونا جا رہی ہے اور موسم سرما وہیں گزارے گی۔ اور واپس صرف اُسی وقت آسکتی ہے کہ جمال نمز چھوڑ کر اپنے موجودہ رویہ کو بالکل بدل دے بینا بچوں کی نگرانی کرے گی کہ وہ ان کی "پجارن" ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھئے تو نہ تو میاں بیوی اور نہ بچے ان مسلسل ہنگاموں کے لئے تیار تھے۔

اُس کا خط تمام ہوگیا۔ وہ "نرسری" میں گئی کہ صفیہ کو وہاں سے لے کر سلا دے۔ بینا نیچے اپنے کسی ضروری کام میں لگی ہوئی تھی۔ نرسری میں صرف بچے ہی تنہا تھے۔ عطیہ نرسری کی طرف تاریکی میں سے ہو کر گئی۔ اور قبل اس کے کہ کمرے میں داخل ہو دفعتہً صفیہ کی یہ آواز سن کر جہاں تھی وہیں تھم گئی۔

لو آؤ امی جان اور ابا جان والا کھیل پھر کھیلیں۔ مجھے تو وہ کھیل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔"
دارا ماندگی کے ساتھ سنبھلا۔
یہ خیال کر کے کہ یہ بچے کیا کھیل کھیلتے ہیں عطیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔
"بہت اچھا" دارا نے کہا "تو اب کس طرح شروع کریں؟"
"ایسے ہی جیسے کہ پچھلی دفعہ امی جان اور ابا جان میں ہوا تھا"
صفیہ نے سر ہلایا اور بولی "ہاں تم گھنونے بنو اور میں ناراض ہونگی، خوفناک ناراض۔ اور چیخ چیخ کر آواز نکالوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے تیور بدل لئے۔ اور غصے سے اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
عطیہ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جب اُس نے صفیہ کا چہرہ دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔
"جمال تم نے مجھے کبھی سُکھ نہیں دیا تم تو کہیں کے وحشی درندے ہو"
"میری جان عطیہ!" دارا نے پورے طور پر اپنے باپ کی نقل اتارتے ہوئے متبسم ہو کر اپنی بھنوؤں کو اٹھانے کے بعد کہا "کیا میں نے کبھی تمہاری کسی فرمائش کو رد کیا ہے؟ تم عورتیں بھی عجیب ناشکرگزار ہوتی ہو"
"بس رہنے دو۔ تم ذرا ذرا سی چیز لانے سے تو انکار کر دیتے ہو۔ تم تو بس ایک درندہ ہو۔ میرا تو تم سے جی جلتا ہے۔ تم کبھی "انسان" نہ بنو گے۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میں تو اس وقت کو روتی ہوں جب میں نے تم سے شادی کی تھی۔ کاش نہ ہوتی"
صفیہ گرم ہو ہو کر اٹھتی تھی اور نرسری کے فرش پر اچھل اچھل پڑتی تھی اور کہتی جاتی تھی "تم وحشی ہو وحشی۔ تمہارے خراٹے ہی ختم نہیں ہوتے۔ نہیں معلوم تم ایسے جانور میرے پلّے کہاں سے پڑ گئے"
"میری پیاری عطیہ تمہیں بتاؤ میں اس سے زیادہ تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں"
"کرنا چاہو تو بہت کچھ"، صفیہ نے چیخ کر کہا "میں تو ہر رات نئی نئی تفریحیں، نئے نئے کھیل قسم قسم کے گراموفون باجے چاہتی ہوں لیکن میں تم سے سیر ہو چکی۔ بس نے تو تم سے بھر پایا۔ میرے لئے تو تم ایک خوفناک مصیبت اور مہیب بلا ہو۔ میں تو اب یہی دعا کرتی ہوں کہ تمہارا جنازہ اٹھے۔ کسی کی آئی جمال بندے تم کو آئے۔ جیسا تم نے مجھ کو جلایا ہے"
دارا نے آہ بھری اور تھک کر کمزوری سے پیچھے کو جھک گیا اور پھر کسی قدر گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

"اب بولتے کیوں نہیں۔ کیا منہ کو تالے لگ گئے ہیں"۔ صفیہ نے بپھر کر کہا۔
"افوہ! عطیہ میں تو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے بے جان ہوگیا۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے"۔

عطیہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ صفیہ کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔
"بچو یہ سونے کا وقت ہے"۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں ایک مترحمانہ لرزش پائی جاتی تھی۔ اور دارا کے چہرے پر تکان اور خستگی کی علامات ہویدا تھیں جو بالکل اس کے مشابہ تھیں جو اکثر جمال کے چہرہ پر ہویدا ہو جایا کرتی تھیں۔
عطیہ کے لئے یہ ایک اچانک انکشاف تھا۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ایسا روشن اور صاف سبق آج تک کسی عورت کو نہیں ملا تھا۔ اُس پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اُن کے آپس کے جھگڑے میں خطا کس کی تھی۔ عطیہ کے لئے یہ ایک روح فرسا صدمہ اور ایک جانکاہ حادثہ تھا کہ صفیہ بیماری کے مارے صابر و شاکر دارا کو گالیاں دے دے کر آپ مزے لے رہی تھی۔ جب اُس نے صفیہ کو گود میں اٹھایا تو اُس نے دارا کو آہستگی سے یہ کہتے سنا کہ "لڑکیاں بڑی وحشی ہوتی ہیں"۔ یہ بات عطیہ پر صادق آتی تھی۔ وہی جمال کے لئے وحشی بنی ہوئی تھی۔ وہ جمال جس سے شادی کرنے کی اُسے اس قدر آرزو اور تمنا تھی اور جو غریب اپنی جان مار مار کر اُس کے لئے کام کرتا تھا اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ہر وقت اپنے ہی کو قصوروار سمجھتا تھا۔
اسے خیال آیا کہ کیا اس کی دوست لیلیٰ خوش تھی؟ اس نے تو اسے کبھی شاد نہیں دیکھا جب سے اُس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہے اور وہ بھی بلا کسی معقول وجہ اور سبب کے وہ کبھی خوش نہیں ہوئی۔

کسی چیز نے نامعلوم طور پر اُس کی نسوانی محبت میں ایک جوش سا پیدا کر دیا جس نے عطیہ کے گہرے روحی زخموں کو یک دم معجزانہ طور پر مندمل کر دیا۔ اسے اپنے بیمار بچے دارا کے چہرے پر بالکل جمال جیسی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر آئے اور اُس نے دل میں سوچا کہ وہ کیا غضب کرنے والی تھی کہ اپنے جمال، اپنے شوہر اپنے قابل رشک شوہر کو چھوڑ جانا چاہتی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے جھٹ پٹ صفیہ کو مینا کی گود میں دے کر دارا کو بڑے ہی پیار سے بوسہ دیا اور پھر نہایت تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صفیہ کے الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے کہ "امّی جان تم ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری طرح ناراض ہو رہی تھی"۔ اور مینا کے بے کیف چہرے نے اُس کے دل میں ایک اور درد پیدا کر دیا۔

وہ آرام کرسی پر بے اختیار گر پڑی اور سسکیاں لینے لگی۔ ایسی سسکیاں جو اُس نے اپنی عمر میں کبھی نہ لی تھیں .... آخر کار .... بے حالی میں لرزتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی اور اُس نے اپنے منہ پر پانی ڈالا اور آنسوؤں کو خشک کیا اور اس کے بعد آہستگی سے اپنے خاوند کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوئی - وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

"عطیہ کیا تم ہو؟" اُس نے بغیر دیکھنے کے کہا۔

"ہاں جمال میں ہی ہوں"

وہ اٹھا اور اُس کی نگاہ کاغذوں پر جھکی ہوئی تھی "میں نے ایک تجویز کی ہے کہ جب تم باہر ہو گی تو میں تمہارے اخراجات کے لئے کس قدر روپیہ دے سکوں گا۔ اُس نے آہستگی سے کہا اور ہیں —— عطیہ؛ ہیں یہ کیا؟" جب اُس نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ نہایت پژمردہ اور افسردہ ہو رہا ہے وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اُس نے کہا "کیا دارا کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" اور اس کی آواز میں فکر مندی کی علامات نمایاں ہو گئیں۔

"نہیں جمال لیکن میں —— میں ——" وہ اپنی باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی اور ان کو مضبوطی سے اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔

"ہائے جمال! جمال" اس نے کہا اور سسکیاں لیتی ہوئی اس کے اور قریب ہو گئی۔

"میری پیاری میری جان!" جمال نے آہستہ سے کہا اور زور سے اُس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک فوری راحت اُسے مل گئی ہے، اور وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننے کی پرواہی کرتا تھا کہ عطیہ میں تغیر کیسے پیدا ہوا۔

"جمال میں ہی اب تک تمہارے لئے وحشی بنی رہی"

"اور میں بھی کچھ کم احمق نہ تھا"

"اب تو تم مجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ کیا جدا کر دو گے"؟ نادان عطیہ نے پوچھا۔

جمال نے کہا "میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ تم کو، اپنی نادان بھولی زندگی کی رفیقہ کو اپنے سے جدا کر دوں"

مہر محمد نذا ہشمات

غزل

نہ مَیں زمیں کے لئے ہوں نہ آسماں کے لئے
ہوا ہوں خلق ترے سنگِ آستاں کے لئے

بشر کے دم سے کون و مکاں کی آرائش
کھچا ہے نقش یہ تزئینِ دو جہاں کے لئے

مرے بیانِ وفا پر نہ لے عتاب سے کام
کیا ہے ذکر ترا حسن داستاں کے لئے

فدا ہوا ہوں میں تجھ پر کہ عیش میں کاٹوں
فنا ہوا ہوں میں آرامِ جاوداں کے لئے

بہارِ گلشنِ ہستی میں جی نہیں لگتا
خبر نہیں کہ میں بے تاب ہوں کہاں کے لئے

ہوائے الفتِ منزل اڑائے چل مجھ کو
مثالِ گردِ پریشاں ہوں کارواں کے لئے

مزارِ افسرِ بے کس زمیں پہ رہنے دو
کوئی جگہ تو رہے دورِ آسماں کے لئے

افسر
صدیقی امروہوی

چھلاوہ

فیروز نے اخبار ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "آج اس میں میرے ایک دوست کے انتقال کی خبر ہے۔ میں نے اُسے صرف ایک دفعہ دیکھا ہے مگر وہ اکثر میرے خیال کی آنکھوں کے سامنے رہا ہے۔ کیا خوب آدمی تھا!

"رات کا وقت تھا اور گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک اول درجہ کے کمرے میں تھا۔ میرا ایک ہی ہم سفر کہیں راستے میں اتر چکا تھا۔ تنہائی مجھے ناگوار نہ تھی کیونکہ اب میں جس قدر چاہتا پھیل سکتا تھا اور نرم نرم گدیلے مجھے دعوتِ استراحت دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے لمپ بجھا دیا، اپنا اوورکوٹ اوڑھا اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دراز ہو گیا کہ اب وہاں کوئی نہ تھا جسے میرے پاؤں پھیلانے سے تکلیف ہوتی۔

"گاڑی اب ایک وسیع میدان میں سے گزر رہی تھی۔ انجن پوری رفتار پر جا رہا تھا اور میرا کمرہ کسی پرانے یکّے کی طرح ہچکولے کھاتا رواں تھا۔ یہ ہچکولے مجھے اپنے کندھوں کے بل پر آگے اور پیچھے مسلسل جنبش دے رہے تھے، سر کے اوپر میرے سوٹ کیس میں سے ایک باریک آواز نکل رہی تھی، کھڑکیاں کھٹ کھٹ بج رہی تھیں اور پہیوں اور بریکوں سے ہولناک چیخوں کی سی آواز آ رہی تھی۔ لیکن جونہی کہ میں نے آنکھیں بند کیں اس شور کی لَے مجھ پر چھانے لگی، میں اپنے آپ کو پھر بچپن کے زمانے میں پانے لگا اور مجھے اپنی کھلائی کی لوری کی شیریں آواز آنے لگی۔

"انہیں مہمل خیالات میں مجھے نیند آ گئی۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کا شور میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

یکایک کمرے کی فضا متغیر ہو گئی اور میں جاگ اٹھا۔ میرے منہ کے قریب تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کمرہ بدستور خالی تھا اور میرے سامنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ مجھے پھر نیند آ رہی تھی کہ رات کی سرد ہوا کا ایک اور تھپیڑا آ کر مجھے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو میرے سر کی طرف کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور فرش پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے پاؤں پائیدان پر تھے۔

"میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میرا دماغ ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ سب سے پہلے مجھ پر متوہمانہ خوف سا چھا گیا۔ کیونکہ پوری رفتار سے جاتی ہوئی گاڑی میں یکایک کسی انسان کے ظاہر ہونے پر یہی

خیال ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی بھوت ہے۔ پھر مجھے گاڑیوں میں آگھسنے والے لٹیروں، اچکّوں اور خونیوں کا خیال آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور گو میرے اور دوسرے مسافروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل ہے لیکن میں کسی ذریعہ سے بھی اُن کو اپنے خطرے سے آگاہ نہیں کرسکتا۔ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے!

حفاظتِ نفس کے جذبے سے مجبور ہوکر میں اُس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کہنیوں اور گھٹنوں سے لے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن دروازے کو بے تحاشا پکڑے رہا، اور میں اُس کی گرفت ڈھیلی کرکے اُسے باہر پھینکنے کی سعی میں مصروف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ایک محفوظ جگہ پر کھڑا تھا اور مجھے یہ فوقیت حاصل تھی۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کوئی مضرت نہ پہنچاؤں گا!" یہ الفاظ اُس نے ایسی لجاجت سے کہے کہ مجھے اپنے سلوک پر شرم آگئی اور میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ہانپتا کانپتا وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے وہاں سے ہٹ کر لمپ روشن کردیا۔

"اس کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ کون ہے۔ وہ ایک غریب کسان تھا اور اُس نے موٹے کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کی سیاہ پگڑی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ تاریک نہ تھی جس میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پیلے پیلے دانت نمایاں تھے۔ وہ احمقانہ ممنونیت میں کھلکھلا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے تھیلے میں سے کچھ تلاش بھی کررہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اپنی نیکی پر افسوس کرنے لگا۔ ابھی وہ تلاش میں مصروف تھا کہ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالا۔ اب وہ بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کرسکتا تھا۔

"آہستہ سے اُس نے کوئی چیز اپنے تھیلے میں سے نکالی، اور میں نے بھی اُس کی تقلید میں اپنا ریوالور آدھا باہر نکال لیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں محض ایک فرسودہ کاغذ کی چھوٹی سی کترن تھی، جسے وہ خوشی سے میری طرف بڑھا رہا تھا۔

"دیکھ لو، میرے پاس ٹکٹ موجود ہے"

"میں نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا

"میں نے کہا لیکن یہ تو پرانا ہے! یہ تو سالہا سال سے بے کار ہوچکا ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا یہ تمہیں چلتی گاڑی میں چھلانگیں لگانے اور یوں لوگوں کو ڈرانے کی معافی دے سکتا ہے"

"اس پر اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا، اُسے پھر خوف ہوگیا ہے کہ میں اسے باہر پھینک دوں گا لیکن

اپنی حساسیت کے باعث مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

"میں نے کہا "تم اندر آجاؤ اور دروازہ بند کردو"۔

"نہیں صاحب، شکریہ!" اُس نے کڑی آواز سے کہا "مجھے اندر آنے کا حق نہیں ہے! میں یہیں باہر بیٹھوں گا میں اُس جگہ کے قابل نہیں"۔

"اور وہ دروازے ہی میں بیٹھا رہا۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے گھٹنے اُس کے کندھوں کو چھُو رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہوا طوفان کی طرح اندر آرہی تھی، اور روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دروازے میں سے چھن کر اور ہمارے بے ڈول سایوں کو ساتھ لے کر بنجر میدان کو چھوتا ہوا ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ تار کے کھمبے رات کے سیاہ پردے پر زرد رنگ کے عمودی نقوش کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے تھے، اور چنگاریوں کے جگنو انجن سے نکل نکل کر پیچھے کی طرف بھاگتے تھے۔

"وہ مضطرب سا نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اطمینان سے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں۔ میں نے اُسے ایک سگار پیش کیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اُس نے باتیں شروع کردیں۔

اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا سفر ہر ہفتے کیا کرتا ہے۔ وہ سٹیشن سے دور کھڑا گاڑی کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب وہ قریب پہنچتی ہے تو دوڑ کر ایک ہی چھلانگ میں اُسے پکڑ لیتا ہے، اور پائدان پر کھسکتا ہوا کسی خالی کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر گاڑی کے کسی سٹیشن پر داخل ہونے سے پہلے ہی کود جاتا ہے اور جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اس پر چڑھ آتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی گاڑی بدل لیتا ہے تاکہ سنگ دل گاڑی والوں کی نظر سے بچا رہے۔

"میں نے پوچھا "لیکن تم کہاں جارہے ہو؟ اور ہر ہفتے تم اتنے بڑے خطرے میں کیوں پڑتے ہو؟"

معلوم ہوا کہ وہ اتوار کی چھٹی اپنے بال بچوں میں گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اور اس کی بیوی انتہا سے غربت کے باعث اکٹھے نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ایک شہر میں کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں۔ پہلے پہل وہ یہ سفر پیدل طے کیا کرتا تھا اور ساری رات چلتا رہتا تھا، مگر جب وہ وہاں پہنچتا تو بے حال ہوکر گر جاتا تھا اور تکان کے باعث نہ اپنی بیوی سے بات کرسکتا نہ بچوں سے کھیل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بے باک ہوگیا اور اب اس نے گھر پہنچنے کا ایک آسان رستہ نکال لیا۔ بچوں کو دیکھ کر اُس کے اعضا میں بقیہ ہفتے کے لئے زیادہ تن دہی سے کام کرنے کی قوت پیدا ہوجاتی تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ سب سے چھوٹی لڑکی ابھی اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی لیکن

وہ اپنے باپ کو پہچانتی تھی اور جب کبھی وہ آتا وہ پیار لینے کے لئے اُس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی تھی۔

"میں نے اُس سے کہا لیکن کیا تم ڈرتے نہیں کہ کسی دن یہ سفر تمہارا آخری سفر نہ ہو جائے؟"

"وہ مسکرایا اور اُس کے مسکرانے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اپنے پر اعتماد ہے۔ نہیں، جب گاڑی کسی گسستہ عناں گھوڑے کی طرح شعلے اگلتی اُس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی تو اس کو ڈر نہ آتا تھا۔ وہ کافی دلیر تھا، ایک ہی جست میں وہ اس کے اوپر ہوتا، اور گو کبھی کبھی اترتے وقت اُسے ایک آدھ دھکا لگ جاتا لیکن وہ پہیوں کی زد سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا کرتا۔

"اُسے صرف مسافروں کا خطرہ ہوتا تھا۔ اول درجہ کی گاڑیاں اُسے عموماً خالی ملتی تھیں لیکن آج کی طرح کے مواقع بھی اسے پیش آہی جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کی چیخوں نے اسے ایسا ڈرایا کہ اسے گاڑی سے اترتے ہی بنی اور باقی راستہ پیدل چل کر جانا پڑا۔

"ایک رات جب وہ چوری چوری ایک دروازہ کھول رہا تھا کسی نے اُس کے سر پر اس زور کی ضرب رسید کی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اُس دن اُسے یقین تھا کہ یہ اُس کا آخری سفر ہے! یہ بات سناتے سناتے اُس نے اپنی پیشانی پر مجھے ایک بہت بڑا داغ دکھایا۔

"آہ، اُس کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوئی تھی لیکن اس کی اُس کو شکایت نہ تھی۔ اُسے لوگوں سے گلہ نہ تھا کہ کیوں وہ اس سے ڈرتے اور اپنی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سلوک اُس سے ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ مگر جرم کے سوا اُس کے پاس چارہ کار ہی کیا تھا جب کہ وہ مفلس و قلاش تھا اور اسے اپنے بچوں کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی۔

"اتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہونی شروع ہوئی جیسے کوئی سٹیشن آ رہا ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا، دیکھو، تمہارے سٹیشن پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ایک قیام اَور ہوگا، تم بیٹھے رہو اور تمہارا کرایہ میں ادا کر دوں گا!

"اُس نے بلا تامل جواب دیا، نہیں صاحب، گارڈ پھر بھی مجھے دروازے سے گزرنے نہ دے گا۔ اُس نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ دیکھے۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سفر مبارک ہو میں نے آپ جیسا رحم دل اور نیک کوئی آدمی نہیں دیکھا!"

"یہ کہہ کر اُس نے پائدان پر پیر رکھا اور غائب ہوگیا۔"

"جلد ہی گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھیر گئی۔ مجھ پر پھر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ یکایک مجھے پلیٹ فارم پر اشتعال آمیز آوازیں سنائی دیں۔ یہ قلی وغیرہ تھے جو گاڑی کے محافظوں کو کسی کے تعاقب کا رستہ دکھا رہے تھے۔

"وہ جا رہا ہے! تم میں سے ایک دوسری طرف ہو جاؤ تاکہ وہ بچ کر نکل نہ جائے!...... لو وہ گاڑی کے اوپر چڑھ گیا!..... جلدی کرو!"

"اور چند ہی لمحوں میں میرے کمرے کی چھت غضبناک پولیس کے بھاری بھاری قدموں سے ہلنے لگی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اگلی گاڑی کی چھت سے ایک آدمی نیچے گر رہا تھا۔ ایک لوتھڑے کی طرح وہ زمین پر آ پڑا! پھر بے تحاشا بھاگ اٹھا اور جلد ہی رات کے سیاہ پردے میں چھپ گیا۔

"گارڈ اور اُس کے دوسرے ساتھی زور زور سے بول رہے تھے اور طیش سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

"میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا 'یہ کیا بات ہے؟'

"اُس نے کہا 'یہ وہی ہے وہی سواری کا چور! یہ چھلاوہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، مگر ہم ضرور اسے پکڑ کر رہیں گے!'

"'چھلاوے' کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر سردیوں کی راتوں میں میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوا ہوں کہ آیا وہ اس وقت بھی کہیں باد و باراں کے طوفان میں کھڑا ناساز گار گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوگا، اور پھر دشمن کے مورچے کو مسخر کر لینے والے کسی بے باک سپاہی کی طرح وہ اس پر چڑھ رہا ہوگا!"

پھر فیروز نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور آج اس میں لکھا ہے کہ چک لالہ کے قریب کسی کے جسم کے ٹکڑے اڑے ہوئے پائے گئے۔ یہ وہی ہے — مجھے یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ آہ! وہ جو خطرے کو ڈھونڈتا ہے اس میں پڑتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے، چار طویل سالوں تک اُس نے اپنا یہ وظیفہ جاری رکھا، جب اُس کا دل اپنے بچوں کو چومنے کے لئے چاہا وہ کسی وحشی درندے کی طرح اپنے شکار پر جھپٹا گیا، یہاں تک کہ آج صبح کی روشنی نے اُسے اُس رستے پر پڑا پایا جس پر تاریک رات نے اُسے اکثر ایک بہادر انسان کی طرح موت کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

(ترجمہ) منصور احمد

دنیائے رنگ و بو

(۱)

دلچسپ ہیں مناظر — دنیائے رنگ و بو کے
حیرت زدہ ہے ناظر — نظارۂ چمن سے
ہر گل ہے جانِ راحت
سرمایہ دارِ عشرت

(۲)

حسنِ بہارِ رنگیں — دلکش ہے دلکشا بھی
آئینہ دارِ نزہت — نرگس ہے موتیا بھی
نیرنگِ شانِ یزداں
ہر سمت ہے نمایاں

(۳)

اہلِ نظر ہزاروں — ہر ایک گل بداماں
بے خوف و بے محابا — ہیں محوِ دیدِ گلشن
وہ بے خودی ہے طاری
پروا نہیں کسی کی

(۴)

کچھ اہلِ دل نشستہ — سایہ میں تاک کے ہیں
وہ بے پیے ہوئے ہی — بیخود بنے ہوئے ہیں
ہر گل نظر میں اُن کی
ہے جامِ زندگانی

(۵)

ہشیار، دیکھ غافل! — یہ وقت ہے غنیمت
اِک جام تُو بھی لے لے — بڑھ کر، اگر ہو ہمت
انجام سے نہ گھبرا
انجام نیک ہوگا

راز
چاندپوری

شاعر اور مغنیہ

لندن میں ہر جگہ ہُن نہیں برستا، بلکہ بعض ایسے محلے بھی ہیں جہاں افلاس اور تہی دستی کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی گھر کو لیجئے جو گلی کے نکڑ پر واقع ہے، اور تنگ دستی کے جملہ نوادر کا معدن بن رہا ہے۔ ایک بیوہ عورت بسترِ علالت پر کراہ رہی ہے، اور اس کا یتیم لڑکا پاٹری سرہانے بیٹھا گنگنا رہا ہے بیماری بجائے خود ایک مصیبت ہے، مگر جب اس کے ساتھ ناداری بھی حملہ کر دے تو کوڑھ میں کھاج کی مثل صادق آتی ہے۔ عورت کراہے جاتی ہے لڑکا گنگنائے جاتا ہے اور کسی ایسی بات کا امکان نہیں جو اس ماحول میں کوئی تغیر پیدا کر سکے۔ عورت کو اپنے سہاگ کے دن یاد آتے ہیں، لڑکے کو باپ کی محبت برماتی ہے لیکن یہ اتحادِ خیال کسی گفتگو کا موجب نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنے سفر کی وہ منزل طے کر چکا ہے جہاں بیٹھ کر وہ اہلِ دنیا کو رخصتِ چاشت دیتا ہے۔ لیکن آج اس کی فرد سے ان ماں بیٹوں کا نام خارج ہے۔ ماں کو خوراک تو کجا دوا تک میسر نہیں آتی، اور لڑکے کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں پڑی، مگر وہ گنگنائے جاتا ہے اور اس بے مزہ زندگی کی ناخوشگوار گھڑیاں مزے سے گزارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس لئے معذور ہے اگر اس ہولناک تنہائی، اس بھیانک ناداری اور ماں کی اس طویل بیماری میں دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اُس کی آنکھیں اُن محرمانِ دردِ دروں سے داد طلب کریں جنہیں عرفِ عام میں آنسو کہتے ہیں۔ لڑکا گو ابھی سن کے اُس حصار سے نکلا ہے جسے بچپن کہتے ہیں۔ مگر آخر مرد کا بچہ ہے اور اس کی غیرت قبول نہیں کرتی کہ اُس کی ماں ایک سنگترے کے لئے ترسے اور کہے۔ "میری زندگی ایک سنگترے کے لئے ختم ہوتی ہے"! وہ منہ دیکھتا ہے۔ لنڈن اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ ایک خوش رقم کتاب کی طرح اس کے سامنے کھلا پڑا ہے، لیکن وہ اس کے پڑھنے کے ناقابل ہے۔ تنازعِ بقا میں ایک ایسا خاموش اعترافِ شکست اُس کے سمندِ غیرت پر تازیانہ کا کام کرتا ہے مگر بے کسی رنگ جمائے جاتی ہے اُسے سنگترہ حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود نظر آتی ہیں

تھوڑی دیر کی رائگان خاموشی کے بعد پھر وہ گنگنانے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی بے معنی گن گن سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی، اور اس دردناک منظر کو اَور بھی اداس کر دیتی تھی۔ اس گنگناہٹ کی صورت کو معانی سے پیوند دیا جائے تو وہ گیت صورت پذیر ہوتا تھا جسے اُس نے خود تیار کیا تھا اور جس کے گنگنانے میں وہ اپنی

پُرالم زندگی کو یک قلم بھول جاتا تھا۔ یہ گیت نہ صرف شاعری بلکہ موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک احسن تصنیف کا قابلِ تحسین نمونہ تھا۔ لیکن نوخیز مصنف اپنی متاعِ گرانمایہ کی قدر وقیمت سے بیگانہ تھا۔ اس گلوگیر گردوپیش کے نامتناہی سلسلہ سے تنگ آگیا تو اس نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی نگاہوں کے لئے کوئی اور فضا پیدا کرنی چاہی۔ نیل گوں آسمان پر سورج سنہری پوڈر بکھیر رہا تھا۔ آبِ رواں سے ہوا اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

کارخانوں کی سربفلک چمنیوں سے دھواں نکل کر آسمان کی خبر لا رہا تھا۔ سڑکوں پر کوئی آ رہا تھا کوئی جا رہا تھا۔ دوکانوں پر خریداروں کا جمگھٹا تھا۔ کوئی خریدتا تھا کوئی بیچتا تھا۔ گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا۔ ڈھور باربرداری کے فرائض بڑی بردباری سے بجالا رہے تھے۔ پرند فضا میں چکر کاٹ کاٹ کر دانے دنکے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض کائنات کا ہر ذرہ اپنے فرائض کی بجا آوری اور روزی پیدا کرنے میں سرگرم تھا مگر اس وسیع گیند پر ایک گوشہ ایسا نہ تھا جہاں پاٹری کسبِ معاش کے لئے تگ و دو کر سکے۔ سب کل پرزے مصروفِ کار تھے۔ کارخانۂ قدرت میں ایک بے کار ایک عضوِ معطل صرف پاٹری کی ذات تھی۔ اتنے میں ایک ٹڈھا بڑے بڑے اشتہاروں کا بستہ بغل میں دابے، ایک ہنڈیا ہاتھ میں لئے آ نکلا۔ اُس نے سامنے والی دیوار کو غور سے دیکھا اور ٹھہر گیا۔ پھر اُس نے ایک قدِ آدم اشتہار وہاں چسپاں کیا اور چلتا بنا۔ پاٹری کی آوارہ نگاہیں اشتہار پر جم گئیں اور اس کے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ اس شب کو میڈم ملبرن ایک ایوانِ موسیقی میں نغمہ سرا ہونگی

اس اشتہار کے مطالعہ نے جلتی آگ پر تیل ڈال دیا۔ بیم و رجا کی کشمکش زیادہ تیز و تند ہوگئی۔ "کاش میں بھی میڈم کا گانا سن سکتا" ایک نیا زخم تھا جس کا مرہم اس کے گیت کے پاس نہ تھا۔ آخر درد اس حد سے تجاوز کر گیا جب بقولِ حکیم غالب وہ دوا بن جاتا ہے۔ پاٹری نے ایک غبار آلود آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سنہرے بالوں کو سنوارا، ٹوپی سر پر رکھی اور لکڑی کے ایک پرانے اور بے رنگ و روغن صندوقچے سے چند بوسیدہ اور رنگ پریدہ کاغذ جیب میں ڈال کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس عالی شان محل میں وہ سب سامانِ عیش و تنعم مہیا ہے جو دولت کے اشارے پر لگا رہتا ہے۔ فرش فروش، آرائش زیب و زینت مبالغے اور سلیقے کے درمیان ششدر کر رہ گئی ہے۔ ضروریاتِ راحت و آرام کی بوقلمونی قدرت کو جنتِ جدید کی طرح اندازی کا مشورہ دیتی ہے۔ اس محل کی جلوہ گاہ میں ایک پری پیکر کمرے کے قدِ آدم آئینوں میں عکس فگن ہے۔ اور "کثرت میں وحدت" کی حقیقت پر وعظ کہہ رہی ہے۔ سرمایۂ ہوش و

خرد کو پریشان کرنے کا سامان ہنوز کندھوں پر جھول رہا ہے۔ نیم باز آنکھیں طمانیتِ قلب کا اظہار کر رہی ہیں سفید ریشم سے بدن پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ غرض حسنِ نسوانی کے جملہ نوادر کی نمائش اس مجسمہ میں بند ہے سامنے ایک تپائی پر ایک سونے کی گھنٹی پڑی تھی۔ اس پر انگلی رکھی۔ ایک دلکش آواز سے کمرہ معمور ہو گیا۔ خادم با ادب حاضر ہوا۔

مغنیہ نے کہا "کون ہیں آپ؟ ان ملاقاتوں سے دم ناک میں آ گیا ان کے نزدیک مغنیہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ شب کو گاتی رہے اور دن بھر اُن کی تعریفوں پر سر دھنتی رہے (ذرا خاموشی) جمیعہ تم بڑے ہو گئے مگر کسی کو ٹالنا نہ آیا"

"حضور! کیا عرض کروں۔ سرکار کی بدولت کیا نہیں آتا مگر معصوم بھولے بھالے لڑکے کے سامنے کس منہ سے جھوٹ بولوں۔ ورنہ میری سخن سازی کا لوہا بڑے بڑے لارڈ مانتے ہیں"

"یہ بات ہے تو آنے دو اُسے۔ بچوں کا دل توڑنا مجھے بھی گوارا نہیں"

پائری ایک ہاتھ میں کاغذ اور دوسرے میں ٹوپی پکڑے داخل ہوا جھک کر آداب بجا لایا اور اُس کی جنبشِ ابرو پر کہنے لگا "اور اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اماں بیمار ہیں، اور ہمیں کھانا تو رہا ایک طرف دوا تک خریدنے کی توفیق نہیں۔ اس امید پر آیا ہوں کہ اگر آپ ایک دفعہ میرے اس گیت کو گانے کا شرف عطا کریں تو ممکن ہے کہ کوئی اس کا حقِ تصنیف خرید لے اور میں اماں کے لئے دوا اور سنگترہ خرید سکوں"

سرو قد حسینہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اُس نے پائری سے کاغذ لے کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر اُس ایک نظر نے اُسے جتا دیا کہ یہ گیت سرسری نظر سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے پہلے تو اس نے یونہی گنگنا کر اس کی موسیقیت کا امتحان کیا پھر دوڑی دوڑی گئی اور پیانو پر گا کر پرکھا اور اُلٹے پاؤں واپس آ کر کہنے لگی۔

"یہ گیت تم نے لکھا ہے! یہ سن اور الفاظ کا یہ حسنِ انتخاب! اچھا تو آج شب گانا سننے آؤ گے"

"شوق سے، مگر اماں ——"

"میں کسی کو تیمارداری کے لئے بھیج دوں گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔ یہ لو دس شلنگ۔ ان سے فی الحال دوا اور خوراک خرید لو اور یہ ٹکٹ ہے اسے دکھا کر تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے"

پائری رخصت ہوا تو اُس کی رفتار میں فرق تھا۔ سورج کی روشنی زیادہ روشن اور دنیا رہنے کے قابل نظر آتی تھی وہ چیزیں جن کے نہ مل سکنے کا خیال اُسے قناعت کی تلقین کرتا تھا اب اسے لوازمِ حیات سے معلوم ہوتی تھیں۔ دوا اور سنگتروں کے علاوہ اُس نے اتنی چیزیں خریدیں کہ دس شلنگ ٹھکانے لگ گئے۔ گھر آیا اور چیزیں ماں کے سامنے رکھ کر ماں سے لپٹ گیا

پاٹری کو آج کا دن معمول سے زیادہ لمبا معلوم ہؤا۔ کم بخت کٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ آخر آفتاب نے سرمایہ داروں کی سی روتابی کر کے مزدور کے حال پر رحم کھایا اور رخ انعام کر کے دنیا کا پیچھا چھوڑا۔ پاٹری نے کھانے سے فرصت پائی ہی تھی کہ ایک ڈاکٹر ایک نرس کو لے کر آپہنچا اور بیمار کے آرام کا انتظام کرنے لگا۔ اس کی نگہداشت سے مطمئن ہو کر پاٹری نے ایوانِ موسیقی کا رخ کیا۔ داخل ہؤا تو اُسے اور ہی دنیا نظر آئی۔ بجلی کی روشنی کی چمک اور خواتین کے جواہرات کی دمک نے ایوان کو رشکِ فلک بنا رکھا تھا۔ کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اور یہ جمِ غفیر ہمہ تن گوش ہو کر پردے کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا۔ آخر ساز چڑھے۔ حاضرین کی نشست گاہ میں روشنی برائے نام رہ گئی۔ پردہ اٹھا تو ایک ماہ جبیں جلوہ فگن تھی۔ اس کے حسنِ گلوسوز کو دیکھ کر یہ محوِ حیرت دنیا خراجِ تحسین ادا کرنے میں کھو سی گئی اور اُسے دھیان تک نہ رہا کہ اس محبوبۂ رعنائی وزیبائی کا فرض صرف بصارت افروزی نہیں بلکہ سماعت پروری بھی ہے۔

یہ عالم دیکھ کر دم بخود پاٹری کا ننھا سا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ پہلے ہی اسے کچھ شک سا تھا۔ اب تو بالکل ناامید ہو گیا کہ یہ خاتون ایسے پُروقار مجمعے کے سامنے اُس کا گیت گانے کو کیونکر روا رکھے گی۔ لیکن پیانو کی دلکش صدا نے خشک دھانوں پر پانی ڈالا اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے پردوں میں اس کا گیت بول رہا ہے۔ گانا کیا تھا ایک بولتا ہؤا جادو تھا جس نے حاضرین کی سدھ بدھ ہی چھین لی، اور یہ قصرِ تعیش ماتم خانہ کی صورت سوگوار نظر آنے لگا۔ سیدھے سادھے الفاظ میں سوز و گداز اور رقت کے ایسے نشتر پوشیدہ تھے کہ حاضرین کے دل میں اتر گئے۔ بڑے بڑے گھاگ نغمہ نواز معترف تھے کہ انہوں نے آج تک ایسا پُر اثر اور درد انگیز گیت نہیں سنا۔

پاٹری اس غیر متوقع کامیابی سے مدہوش ہو رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اس حقیقت کو خواب سمجھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہؤا کہ وہ کب ایوانِ موسیقی سے نکلا اور کب گھر پہنچا۔

دوسرے دن پاٹری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میڈم ملبرن کی شاہانہ گاڑی نہ صرف اُس کے مکان کے سامنے آکر رک گئی، بلکہ میڈم اس کے مکان میں آداخل ہوئی اور ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاٹری کو اُس نے گود میں لے لیا۔ اور اس کے سنہرے بالوں میں اپنے ہاتھ سے شانہ کرتے ہوئے اُس کی ماں سے کہنے لگی "بی بی تمہارے بیٹے نے تمہاری عسرت کو تمول سے بدل دیا ہے۔ مبارک ہے وہ ماں جسے خدا نے ایسا بیٹا عنایت کیا۔ آج صبح لندن کے ایک مشہور ناشر نے اس کے گیت کے عوض ساڑھے چار ہزار روپے کی رقم پیش کی ہے اور عہد کیا ہے کہ جب اس کی فروخت سے ایک خاص رقم وصول ہو جائے گی تو پاٹری شریکِ منفعت شمار ہوگا۔ تمہارا بچہ حقیقی معنوں میں نامیدِ رحمٰن ہے۔ دلو بنک کی کتاب اور دل کھول کر خرچ کرو۔"

نور الٰہی
محمد عمر

اے سکھی

اے سکھی! راز و نیاز کے وہ گوناگوں محسوسات جو تیری موجودگی میں سراپا راحت تھے اب مجھے محض ایک عالم خواب معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے خیال کی نیرنگیاں تھیں!

کون جانتا تھا کہ کسی دن میں اور تو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے!

لوگ کہتے ہیں پریت کے جالوں میں پھنس کر تو نے میری محبت کے اُس تار کو توڑ ڈالا ہے جو میرے اور تیرے من کو ایک کئے ہوئے تھا۔ کیا واقعی وہ ٹوٹ گیا اور اب تجھے میرے دل کی دھڑکن نہ سنائی دے گی؟

سچ بتا میری سکھی! آج جب کہ میرے دل کے مندر میں گم کردہ مسرتوں نے ایک شورش بپا کر دی ہے کیا اس وقت تو میرے ان جذبات سے محض بیگانہ ہے؟

اے سکھی! خزاں کے موسم میں جب سورج افق مغرب میں غائب ہو گیا تھا اور تو مجھ سے مل کر آہستہ خرامی کے ساتھ واپس جا رہی تھی تجھے نہیں معلوم (آہ تو نے پھر کر میری طرف نہیں دیکھا تھا) کہ میں نے تیری واپسی کی راہ میں کتنے موتی بکھیرے! میں دور تک تیرے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

اے سکھی! تو نے اپنی محبت پر میرے دل کا آرام قربان کر دیا مگر میں تجھ کو بے وفا نہ کہوں گی کیونکہ پریت کے دیوتا نے تیری طرف دیکھا اور تو ان نگاہوں کی طرف کھنچی چلی گئی!

آہ! ایک شام تھی جب تو مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے نہیں معلوم کہ اب کون دن آئے گا جب میرے خیال کی تاریک بستیوں میں تیرے ملاپ سے ایک نور افشاں روشنی کی نمود ہو گی۔ نہ معلوم فطرت کے دھیان میں اس پریم کی تجلی کا کون سا وقت ہے!!! تو چلی گئی! تیرے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا ——
شاید میں تھوڑی دیر کے لئے کھو سی گئی مگر اب میرا اضطراب نہ پوچھ؟ میں نہیں جانتی اے سکھی! کہ اب دنیا میں کیا ہو گیا ہے!

آہ! نہ معلوم کیوں یہ دنیا کے راہ و رسم دو محبت کرنے والوں کے درمیان خلیج بن کر حائل ہو جاتے ہیں اس لئے میں جانتی ہوں کہ کسی محبت کا ایک آتشین ہاتھ تجھ کو مجھ سے چھین کر لے گیا۔ مگر میں حیران ہوں کہ میرے دل نے پندارِ مسرت کیوں چھوڑ دیا؟ اسے کس سماوی طاقت نے مجبور کر دیا ہے!!!

اے سکھی تیری جدائی کی الم خیز لذتوں نے ، شاید دنیاوی مناظر کا دلکش رنگ سلب کر لیا ہے۔ وہ تمام نظارے جو تیری موجودگی میں مسرت نواز معلوم ہوتے تھے مجھے اب ذرا بھی تسکین فزا نہیں محسوس ہوتے !

مگر یہ کیوں ؟ اے میری سکھی ! یہ تمام دلی بے چینیاں کیوں ؟ صرف اس لیے کہ تُو مجھ سے دور ہے۔ موسم بہار کی دلفریبیاں اب میرے لئے ناخوشگوار ہو گئی ہیں۔ جب میں غنچہ کو چٹکتا ہُوا دیکھتی ہوں تو مجھے تیرے نرم و خوش آیند قہقہوں کا خیال آ جاتا ہے اسی طرح جب بلبل کوئی موسمی راگ گاتا ہے تو مجھے وہ گیت یاد آ جاتے ہیں جو میں اور تو ہم آواز ہو کر گایا کرتے تھے !

اے سکھی ! کیا تو وہ دلفریب رات بھول گئی جب پھولوں میں نکہت تھی۔ جب چاند کی ترنم پاش روشنی چھائی ہوئی تھی۔ جب راہ نورد ستارے بھی ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور جب بلبل کی میٹھی میٹھی لوریاں سُن کر کائنات بھی سوئی ہوئی تھی ——— اُس رات چمن کا ایک پر نور ستارہ ——— چاندنی کا ایک نازک پھول ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا میں اسے توڑنے کے لئے لپکی لیکن تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "حسن کچھ دور ہی سے نظر افروز ہوتا ہے"!

میں رک گئی لیکن میرا دل مچلا جاتا تھا کیونکہ چاہت کو ہمیشہ حصول کی آرزو رہتی ہے !

بس اے سکھی ! وہی میرے اور تیرے ملاپ کی آخری رات تھی جس کا خیال میری دلسوزی کے لئے تازیانہ ہے۔ رقص موسیقی کے بغیر ہمیشہ تشنہ رہتا ہے ! پھر میں تجھ سے جدا ہو کر کیسے شاد رہوں۔ میں نے تو تیرے بغیر کبھی کسی منظر کا لطف نہیں اٹھایا !!!

اے سکھی ! یہ ایک سہانی شام ہے جنگل میں کیف چھایا ہُوا ہے۔ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ دھندلی سی سرمئی نقاب کے نیچے نوزائیدہ چاند "ماہ پارہ" بن کر چمک رہا ہے اور اس کے گرد تاروں کے پھیلے ہوئے شرار، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے نیل پر ایک افشاں چھڑک دی گئی ہے !

سماوی سطح ہموار و نظر فریب ہے لیکن متبسم و گلریز صحرا تو خوبیوں کا مرقع بنا ہُوا ہے، جہاں لطیف اور تازہ ہواؤں نے عجیب ترنم زا کیفیت پیدا کر دی ہے۔ خوشنما اور دلفریب پھولوں پر آج غیر معمولی نکہت ہے۔ ندی کی لہریں برابر لوٹ رہی ہیں اور کبھی کبھی ان کے ٹھہرنے پر معلوم ہونے لگتا ہے کہ پانی کی عمیق گہرائی فلک تمثال بن گئی ہے !

خاموش جنگل میں، دریا کے کنارے پر معلق، خدا جانے کتنی کافوری شمعیں روشن ہیں یعنی جگنو تیز ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے تارے ٹوٹ کر گر رہے ہیں !

آہ! کہیں پپیہا گا رہا ہے مگر اس کا وجد آفریں ترانہ مجھے اب ایک دل سوز نغمہ معلوم ہوتا ہے!

مجھ سے بہت دور کہیں آبشار الاپ رہے ہیں لیکن اُن کے راگ میرے لئے اب ایک "ماتمی لَے" ہیں!
جس میں رباب دل کے غمگین تاروں کو چھیڑ دینے کے سوا، کوئی اور حلاوت نہ ہو! مجھے ہوا کی شوخیاں بھی ناپسند ہیں
اور پھولوں کی مسکراہٹ سے ایک غمناک خیال میری روح میں نفوذ کر رہا ہے۔ آہ کائنات اپنی حسن آرائی کے لئے کوئی
موقع و محل نہیں دیکھتی!

ملائم و نازک گھانسیں بھی میرے لئے آرام دہ نہیں محسوس ہوتیں۔ ندی کا خرامِ عشوہ پاش برابر جاری
ہے اور میں نہیں جانتی کہ اس کی لہریں میرے کتنے آنسوؤں کو بہالے گئیں ہیں!

یہ شام نہ جانے کیوں اتنی دلفریبیاں لے کر طلوع ہوئی ہے جو حسن کو نظارہ کا آرزومند کر دے۔ لیکن آہ مجھے
اس سے کچھ سروکار نہیں کیونکہ میں بہار کے سارے لطف بھول چکی ہوں۔ اے سکھی! اگر جانے والی رات میری
آنکھوں میں سما گئی ہے جب تو میرے ساتھ تھی۔ اب کوئی منظر میری نگاہوں میں نہیں سماتا۔ جب تو ساتھ نہ
ہو تو ایک اکیلی، تیری سکھی، کس چیز سے دلچسپی لے؟ کیونکہ اے سکھی! بہار کے بغیر تو، کبھی بلبل بھی چمن میں نہیں
آیا کرتی!

اے کاش! وہ مسرت بار لمحے پھر پلٹ آئیں جن میں تو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ کاش تو پھر اسی اندازِ خرام
سے واپس آجائے!

تجھے ان لہروں کی سوگند! بتا؟ اے میری اچھی سکھی کہ تو کب آئے گی؟ کیا تو اس لئے نہیں آتی کہ میں نے
تیری واپسی کے لئے، ندی کے کنارے سے کوئی نایاب تحفہ نہیں چنا؟

دنیا میں نایاب تحفے تو شاید یہی ہیں، پھولوں کی کلیاں، مسرت کے الفاظ، محبت کے جذبات، موتیوں کی لڑیاں
اور ستاروں کی بندیاں مگر سب اپنی جگہ پر خوبصورت و نظر فریب ہیں اس لئے میں ان میں سے کس کو انتخاب کرتی؟؟
ہاں مجھے یاد آتا ہے کہ تجھے چھائے ہوئے آسمان کے بکھرے ہوئے ستارے بہت پسند تھے مگر میں تیرے لئے
تاروں کے سنہرے گوہر کہاں سے پاؤں؟

اچھا سُن اے سکھی! میں اپنے اشکوں کا، اُن اشکوں کا جو میں نے تیری یاد میں بہاتے ہیں قطرہ قطرہ
جمع کر کے اُن کی لڑیاں پروؤں گی اور اے سکھی! جب تو واپس آئے گی تو میں یہ ہار تیرے گلے میں ڈال دوں گی!!!

خاک نشیں
تہذیب فاطمہ عباسی

محفلِ ادب

ملی جلی بولی

۱۹۲۹ء کی آل انڈیا ہندی پرچار سبھا کے صدر ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری تھے۔ اُن کا خطبۂ صدارت جہاں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اصلاح کی مؤثر تجاویز کا حامل ہے وہاں ادبی لحاظ سے بھی ایک نہایت دلکش اور بلند پایہ چیز ہے۔ ہم اس کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں:۔

ہم ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کے پھیلانے کی ترکیبیں سوچنے اور اس راستہ میں جو دشواریاں اور کٹھنائیاں ہیں ان پر غور اور وچار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

اس ملی جلی زبان کی بابت میں دو باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو خود زبان کی شکل صورت دوسری اس کی لکھن کی بابت۔ پہلے خود زبان کو لیجئے۔ کوئی بھاشا یا تو بولنے والوں کے دل کی حالت اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے جسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ یا پھر یہ اس کا ذریعہ ہوتی ہے کہ دن رات کی زندگی میں جو ضرورتیں پڑیں ان کو ایک دوسرے پر ظاہر کر سکیں۔ بھاشا ان دونوں صورتوں میں سے کیسے پیدا ہوئی اس کی بابت کسی کا کوئی خیال ہو ہندوستانی بھاشا کے لئے تو ہر حالت میں ایک ہی راستہ پر آگے بڑھنا ہے۔ ہم اگر یہ مان لیں کہ ملی جلی زبان اپنی اصلی غرض کی وجہ سے کبھی بھی صرف ایک گروہ کی زبان نہیں ہو سکتی جس میں دوسرے گروہ کی بھاشا ذرا بھی ملی نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کسی گروہ کے اچھے لکھنے والوں کا یہ حق چھینے لیتے ہیں کہ وہ اپنے خاص انوکھے انداز میں لکھیں اور اس طرح بھاشا کے خزانے کو مالا مال کریں۔ ہاں یہ بات ضرور غور کرنے کی ہے کہ جان بوجھ اور سوچ سمجھ کر اچھے لکھنے والے کہاں تک زبان میں دخل دیں۔ اور میں اس پر اس جگہ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ تو سب مانیں گے کہ آپس میں میل جول سے جو ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کا زبان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ معاشی اور آرتھک ضرورتوں سے بھاشا میں کتنے ہی نئے نئے لفظ آجاتے ہیں اسی میل جول سے چھوٹے چھوٹے گانوؤں کی زبان بڑھ کر صوبہ کی زبان اور یہ بڑھ کر ساری قوم سارے دیس کی زبان بن جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ ایک جگہ اور دوسری جگہ کی زبان الگ ہوتی اور پھر مل جل کر ایک بنتی ہے خود سماج میں ایک حصہ ایک طرح بولتا ہے اور دوسرا دوسری طرح۔ گانوں کے کسان اور شہر کے شہری بات چیت کا اپنا

اپنا انداز رکھتے ہیں شاعر اور کوی بھاشا میں اپنی جدا رسم بنا لیتے ہیں۔ اپدیش اور وعظ کہنے والے اپنا الگ رنگ نکالتے ہیں مگر پھر بھی یہ سب مل جل کر ایسی بھاشا بنا دیتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آتی ہے اور جسے سب مان لیتے ہیں اور یہ سب کچھ چپکے چپکے ہوتا رہتا ہے۔ بھاشا کے جو بولنے والے بیچ بیچ کوئی اچھی بات یا کوئی بری بات کہتے ہیں یا کسی بات کو اوروں سے اچھی طرح کہہ دیتے ہیں انہیں کا طریقہ سب کو بھاتا ہے اور سب اسی پہ چلنے لگتے ہیں۔ مدرسے، اخبار، کتابیں ناٹک یہ سب چیزیں اپنے اثر سے زبان کو ایک سا بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ پر اگر ان اثروں سے کوئی بھی جان بوجھ کر اس کی فکر کرے کہ کسی ایک گروہ کی زبان تو ملی جلی بھاشا میں زیادہ آجائے اور دوسرے کی اس میں ذرا نہ ملنے پائے، کسی ایک پیشہ والے کے شبد تو لے لئے جائیں اور دوسرے کے نہیں، کسی ایک صوبہ کی بات چیت کا انداز بھاشا میں جان بوجھ کر ملا یا جائے دوسروں کا نہیں، تو پھر بھی سب چیزیں قومی راشٹری بھاشا کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہی بات ہے کہ میں ان کوششوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہندوستانی زبان کو مسلمانوں کی زبان بنانے کے لئے عربی لفظ ٹھونس کر اور ہندوؤں کی زبان بنانے کے لئے سنسکرت ملا کر کی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے دیس کے لوگوں سے بات چیت ہی نہیں کرنا چاہتے اچھا ہے کہ وہ عربی یا سنسکرت ہی کو اپنی زبان بنا لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ان زبانوں میں بھی کچھ بہت نہ کہہ سکیں گے۔ مگر خیر ان کی خوشی۔ مگر وہ ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کی جڑ کیوں کاٹتے ہیں؟ انہیں اگر عربی یا سنسکرت سے بہت لگاؤ ہے تو وہ ہندوستانی زبان کو ہندو مسلمان راجا اور پرجا اوتر اور دکھن کے رہنے والوں کی ملی جلی زبان بننے سے کیوں روکتے ہیں ..... اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ ننھا سا بچہ جو اسی میل کے لئے پیدا ہوا تھا کیسے بڑھے گا۔ ہندوستانی بھاشا نہ عربی ہے نہ سنسکرت، اور نہ ہو سکتی ہے، یہ تو بس ہندوستانی ہے یعنی اس بڑے دیس کے سب رہنے والوں کی زبان جس میں سب ایک دوسرے کی بات سمجھیں جس پر سب کو ناز ہو جس کی سیوا میں سب کا حصہ ہو پر جس پر پورا قبضہ کرنے کا حوصلہ کوئی نہ کر سکے۔ جو لوگ ہندوستانی زبان کا پرچار کرتے ہیں ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس میں زبردستی ایسے عربی اور سنسکرت لفظ نہ ملنے دیں جن سے یہ سب کی زبان نہ رہنے پائے اور کسی ایک فرقہ کی زبان بن جائے۔ اس لئے کہ سب کے میل جول کی یہاں تو ملی جلی زبان ہونی چاہئے۔

میں نے جو کچھ کہا اس سے آپ یہ سمجھیں گے کہ میں بھاشا کو بس کام کاج کے لئے ضروری جانتا ہوں کہ ایک آدمی دوسرے سے اپنا مطلب کہہ سکے، منڈی اور بازار میں اپنا لین دین کا کام نکال سکے اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ بھاشا سہل اور سادہ، اور سب کی سمجھ میں آنے والی اور سب کے لئے ایک سی ہو۔ ہاں آپ کا یہ سمجھنا بہت کچھ ٹھیک ہے۔ میں بے شک بھاشا کا یہ کام سمجھتا ہوں پر خالی یہی نہیں سمجھتا الگ الگ دیسوں کے لوگوں میں بات

چیت کے لئے جو زبانیں لوگوں نے بنائی ہیں جیسے مولینا کی سماری زبان یا اسیرانتو جس میں ہر چیز کے آخر میں "وہ"
ہر صفت کے آخر میں 'آ'، ہر کام کے نام کے آخر میں 'ای'، سارے حکموں کے آخر میں 'او' ہے یا اسی طرح، اور میں نہیں
چاہتا کہ آپ ہندوستانی بھاشا کو کتر بیونت کر ایسا باقاعدہ کردیں۔ میں مانتا ہوں کہ کاروبار، کام کاج سے آگے
بڑھ کر ہر زبان اپنے آپ کو خوبصورت اور سندر بنانے کا بھی حق رکھتی ہے۔ ہر زبان کے ٹکڑوں میں آپس میں ایسا رشتہ
ہوتا ہے جو بس اسی میں ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا اور ہر زبان کو اس خوبصورتی کے پیدا کرنے کا حق ہے پر میرا یقین
ہے کہ جہاں کہیں آدمی اپنے دل کے حال کو اچھی اور خوبصورت اور سندر طرح سے دوسروں پر ظاہر کرتا ہے، چاہے
بھاشا میں چاہے تصویر میں، چاہے بات میں چاہے راگ میں چاہے بڑی بڑی عمارتوں میں۔ جو چیز سچی طرح سندر
ہوتی ہے اس کا کسی نہ کسی مفید اور کام کی چیز سے ضرور بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بھاشا میں بھی حسن اور خوبصورتی
کام کی باتوں کے ساتھ چل سکتی ہے، نہیں تو یہ ممکن ہے کہ بھاشا ضرورت سے زیادہ خوبصورت، ضرورت سے زیادہ
بناوٹی ہو جائے۔ بہت زیادہ لکھے پڑھے بن بن کر باتیں کرنے والے ہمیشہ زبان کو ایسا ہی بناوٹی بنا دیتے ہیں پر ہر کوئی
جانتا ہے کہ یہ لوگ زبان کے کچھ بہت بڑے دوست نہیں ہوتے۔ کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں جب آپس
کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے تو زبان نیچے گرنے لگتی ہے، ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کی ضرورت اپنا راستہ لیتی ہے
اور بناوٹ سجاوٹ اپنا۔ عام لوگ پہلی کے ساتھ ہوتے ہیں، بہت پڑھے لکھے دوسری کے ساتھ، لیکن جدائی سے
زبان کے دونوں حصے بڑے ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ لیٹن زبان کا حشر یہی ہوا۔ یونانی اور سنسکرت پر یہی گزری۔
میرے نزدیک تو کسی زبان کے اوپر بڑھنے اور نیچے گرنے کی اس سے بہتر کوئی نشانی نہیں کہ اس میں کام کی بات اور
بناوٹ سجاوٹ میں کیا تعلق ہے۔ جب کوئی قوم بنتی ہوتی ہے، جب بڑی بڑی باتیں اور نئے نئے خیال سب
پہنچانے ہوتے ہیں، جب آپس کے جھگڑے مٹنے مٹانے ہوتے ہیں، جب سب چیزوں کی کایا پلٹنی ہوتی ہے تو
زبان کو سہل اور سادہ رہنا پڑتا ہے اور بناوٹ سجاوٹ دور کھڑی رہتی ہے۔ پر جب قوم بن جاتی ہے ترقی کے
رستے پر پڑ لیتی ہے یا چین سے دن کاٹتی ہے، جب مدت بڑھ جاتی ہے، لوگ سب ایک طرح رہنے سہنے لگتے ہیں
رسم و رواج سب میں ایک سے ہو جاتے ہیں تو زبان میں بناوٹ سجاوٹ کے دن آتے ہیں، ہم تو ابھی اپنی قوم
بنا رہے ہیں ہماری زبان کو سہل اور سادہ رہنا چاہئے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس سادگی کے ساتھ جس کے لئے میں آپ سے کہہ رہا ہوں آپ کی بھاشا سندر اور خوبصورت
اور زوردار نہیں ہوسکتی۔ ضرور ہوسکتی ہے۔ پر تب ہی کہ یہ آدمی آدمی میں بس اپنا کام نکالنے کے لئے بول چال کا

کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دل کے اندر بھری ہوئی آگ کی گرمی ہو جو باہر نکلے۔ دلوں کے اندر لہریں مارتے ہوئے دریا کا بہاؤ ہو جو سینہ میں نہ سما سکے اور باہر نکلے۔ ہندوستانی زبان کے لئے دل کی یہ گرمی اور خیالات کا یہ بہاؤ ایک ملی جلی ہندوستانی قوم کے خیال سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانی زبان اسی ملاپ کا نشان ہے، ہم میں یہ خیال جتنا اچھا ہوگا اور اسی خیال کے ساتھ جن چیزوں کو لگاؤ ہے جب وہ بڑھیں گی تو ہماری زبان میں بھی گرمی اور خوبصورتی آئے گی۔ قوم کو جن چیزوں سے لگاؤ اور جن باتوں سے پریم ہوتا ہے اُنہی کا روپ اُس کی زبان کی خوبصورتی اور زور میں دکھائی دیتا ہے۔

اب رہا لکھن کا سوال میں جہاں لفظوں کے معاملہ میں ہندو مسلمان دونوں سے چاہتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کا خیال کریں اور اپنا الگ الگ خاص حق نہ جتائیں اور زبان میں جس جس جگہ سے ہو سکے ایسے لفظ لائیں جو ہماری بھاشا کے رنگ سے میل کھاتے ہوں۔ ہاں لکھن کے معاملہ میں ہندو یا مسلمان کسی سے نہیں چاہتا کہ وہ اپنی لکھن چھوڑ دیں۔ میں نے اپنی سواگت سمیتی کے سبھاپتی کی وہ بات بڑی دلچسپی سے سنی جو انہوں نے مسلمانوں سے کہی ہے کہ وہ عربی لکھن چھوڑ کر دیوناگری لکھن اختیار کرلیں۔ انہوں نے یہ بات دل سے کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے جسے میں بہت پسند کرتا ہوں لیکن میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ میرا یقین ہے اور میں نے کانگریس کے سبھاپتی کی حیثیت سے بھی یہی کہا تھا کہ ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی یا مذہبی بگاڑ ہے وہ اصل میں ایک زیادہ گہرے مقابلہ کی اوپری شکل ہے جو ہندوستان کے سوا اور ملکوں میں بھی رہا ہے اور تاریخ جس سے ناآشنا نہیں یہ دراصل دو الگ تہذیبوں کا فرق ہے جو ایک دوسرے سے آکر ملی ہیں۔ اس بگاڑ کو دور کرنے کی سب سے اچھی شکل میرے خیال میں یہ ہے کہ ہر تہذیب کو باقی رہنے کا حق دیا جائے، آپس میں رواداری اور ایک دوسرے کی عزت پیدا کی جائے اور ایسے موقع نکالے جائیں کہ دونوں آپس میں مل کر ایک دوسرے کی دل کی لگی کو سمجھ سکیں۔ اس میں ہندوستان کا سیاسی بھلا ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کی تہذیب اور تمدن کی ترقی کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ اس دیس میں جتنی قومیں آباد ہیں اُن کے تمدنوں کو اپنی اپنی جگہ پر رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق دیا جائے تاکہ آنے والی ہندوستانی تہذیب کے دل لبھانے والے راگ میں ہر ایک اپنا اپنا سر ملا سکے۔ یہ ضروری ہے کہ اس میں دیر لگے گی مگر تمدنوں کا ملنا اور بدلنا کوئی بازیگروں کا کھیل اور تماشا نہیں کہ جب چاہا انہیں ملا دیا اور جب چاہا بدل دیا۔ ہم میں اتنی عقل ہونی چاہیئے کہ ہم ٹھیر سکیں انتظار کر سکیں۔ مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ اپنی عربی لکھن چھوڑ دیں، ان سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی ساری تاریخ کے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھو، اس لئے کہ اسی لکھن کے ذریعہ تو اس خزانہ کی کنجی اس کے ہاتھ میں آئی ہے، جس میں اس کے سارے پچھلے کام رکھے ہیں۔ یہ کنجی اس سے چھین لینا خود اسی کے لئے برا نہیں ساری دنیا کے لئے برا ہے۔

وجدانیات

ہر جلوہ ترے حسن کی محفل نکلا ہر ذرہ ترے درد کا حامل نکلا
جب غور سے یہ ہستیٔ عالم دیکھی تا حدِ نظر سلسلۂ دل نکلا

کیا لطفِ نظارہ ہے یہ جلوہ کیا ہے ترکیبِ دل و دیدۂ بینا کیا ہے
کیا دیکھا نگاہوں نے ، نہ دیکھو اس کو یہ دیکھو نگاہوں میں تماشا کیا ہے

خونِ دلِ پُرشوق بہا دیتی ہیں اشکوں سے گُل تازہ کھلا دیتی ہیں
روتا ہوں تو سیرِ غمِ ہجراں کے لئے آنکھیں مری اک باغ لگا دیتی ہیں

"خضرِ راہ"

تعلیماتِ کبیر

۱- پھولوں کے باغ میں نہ جا ، اے دوست وہاں نہ جا!
خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے -
"تو کنول کی ہزارہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا اور وہاں سے حسنِ لازوال کا تماشا کر -

۲- "مخلوق برہما (خالق) میں ہے اور برہما خود مخلوق میں موجود ہے" وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ملے ہوئے بھی -
وہ خود درخت بھی ہے ، بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے - وہ خود پھول ہے - میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے -
وہ خود سورج ہے ، روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جائے - وہ خود برہما ہے ، مخلوق بھی اور مایا بھی
وہ خود مختلف صورتوں میں اور لامحدود مکان میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے -
وہ خود سانس ہے ، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے -
وہ خود حد ہے ، خود ہی لامحدود بھی ہے ، اور محدود اور لامحدود کی حدود سے بالاتر بھی ہے -
وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے مبرا ہے ، وہ برہما اور مخلوق سائر و دائر ہے -

۳- "اے پانڈے! تو کہتا کیا ہے؟ ہندو اور ترک ، یہ کہاں سے آئے ہیں - یہ راستہ کس نے نکالا ہے؟ اپنے دل کی تلاشی
لو ، بہشت کہاں ہے - کس نے اُسے حاصل کیا ہے؟ اے بیوقوف! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام جپ - تم تو
بدمعاشی کی باتیں کرتے ہو - اے کبیر! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گھاٹے میں رہا؟

"اردو"

مطبوعات جدیدہ

پروازِ خیال - یہ جیبی تقطیع کی ایک نہایت خوبصورت مجلد کتاب ہے جسے خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کا دیوان کہنا چاہئے - ابتدا میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کے قلم سے ۵۴ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس کے بعد صاحبِ دیوان کی مختصر التماس ہے اور پھر غزلیات ہیں جو ۸۰ صفحات پر ختم ہوتی ہیں - کتابت طباعت اور کاغذ کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے - ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہے - بیل اور جدول کا رنگ سرخ ہے اور مضمون کے لئے عام سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے -

مقدمہ میں عشرت صاحب نے پہلے تو زبان اردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے پھر مرکز کا جھگڑا چھیڑا ہے اور اس سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی مردم ناشناسی اور خدمتِ زبان میں عوام کی شرکت کا گلہ کسی قدر ناگوار الفاظ میں کیا ہے اور پھر حمید صاحب کی شاعری پر تنقید لکھی ہے - حمید صاحب کی زبان واقعی نہایت صاف اور صحیح ہے - اشعار فن کے لحاظ سے بے عیب ہیں - لیکن ان میں کیف و اثر اور جدت و ندرت کی بہت کمی ہے - عموماً مضامین بالکل سادہ ہیں - چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

طور پر لطف بیدکا نہ ہوا — آج تک صورت آشنا نہ ہوا

تیرے بیمار سے اچھے ہیں — کوئی منت کش دوا نہ ہوا

جلوہ گر جب تیغ لے کر سامنے قاتل ہوا — نازکی چلّا کے بولی تو بھی اس قابل ہوا

مٹ گیا چمن والو حیف بے نشاں اپنا — تھا اسی فضا میں تو کل تک آشیاں اپنا

قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ یہ ہے :- خواجہ حمید الدین صاحب ۹ - امین الدولہ پارک لکھنؤ -

"**دی سٹار**" انگریزی زبان کا ایک ہفتہ وار علمی، ادبی اور سیاسی اسلامی اخبار ہے جو مولوی عزیز احمد صاحب کی ادارت میں الہ آباد سے نکلنا شروع ہوا ہے - اسلامیات پر اس میں بعض نہایت مفید اور پر معلومات مضامین شائع ہوئے ہیں - قومی معاملات پر آزادانہ رائے رکھتا ہے - ہمارے خیال میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں یہ اخبار بہت بڑا حصہ لے گا - حجم ۲۰ صفحات اور سالانہ قیمت چھ روپے بارہ آنے ہے -

"**کامیابی**" - یہ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی کا ماہوار رسالہ ہے - اس وقت تک اس کے چھ پرچے شائع ہو چکے ہیں - اس میں اچھے اچھے ادیبوں کے قلم سے تجارتی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو علم و عمل کی تلقین کی جاتی ہے اور انہیں ترقی و کامیابی کے راستے بتائے جاتے ہیں - لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے - رنگین تصویریں اور بلاک کے ذریعہ سے چھاپا گیا ہے - حجم ۴۸ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے -

مخزن الحساب و الجبرا - یہ حساب و الجبرا کی ایک جامع کتاب ہے جس میں ورنیکولر مڈل ایس وی کلاس اور نارمل سکولوں کے نصاب کے مطابق ایک ہزار دو سو نہایت اہم امتحانی سوالات درج کئے ہیں - مشکل سوالات کے حل اور حل کے متعلق ہدایات بھی لکھی گئی ہیں - اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک ورنیکولر فائنل امتحانات کے پرچے بھی دئیے ہیں جن سے کتاب اور زیادہ کارآمد ہوگئی ہے - مخزن الحساب یقیناً حساب کی تمام مروجہ کتابوں کا نچوڑ ہے - اور جو طلبا اسے زیرِ مشق رکھیں گے ضرور کامیاب ہونگے - حجم ۲۵۶ صفحات - قیمت ایک روپیہ -

کتب خانہ اشاعۃ العلوم [illegible] سے طلب فرمائیے -

آپ کی بیگمات کیلئے لاجواب تحفہ

کشیدہ کاری کی اصلی مشین

یہ وہی بے نظیر مشین ہے جسکی نسبت اخبار تہذیب نسواں میں ایک محترم خاتون اپنے مضمون کے دوران میں فرماتی ہیں کہ "سچ تو یہ ہے کہ اشتہار کی تعریف و توصیف بے جا نہیں واقعی یہ ننھی سی چیز اپنی بساط سے زیادہ کارآمد ہے جو بہنیں اس کے صحیح استعمال سے بخوبی واقف ہیں ضرور مجھ سے متفق ہونگی کہ آرائشی اشیا ایسی خوبصورت کاڑھی جاتی ہیں کہ کمرہ ملاقات گویا ایک ننھا سا سدا بہار باغیچہ بن جاتا ہے جہاں باد سموم کا خوف نہ خزاں کا اندیشہ ـــ پردے، میزپوش، گدیاں، فوٹو فریم، سلیپر وغیرہ کے لئے یہ کاریگری نہایت موزوں ہے مگر احتیاط سے زیر استعمال رکھیں تو سالہا سال تک یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں۔ بچوں کے کلوک اور فراک پر بھی خصوصاً گرم لباس پر ایک ایک چھوٹا سا پھول خوشنما معلوم ہوگا اور پرندے تو عموماً بہت خوبصورت کاڑھے جاتے ہیں۔"

ان الفاظ پر ہمارا کچھ اضافہ کرنا بے سود ہوگا آپ ایک مشین معہ سامان منگا کر دیکھئے دنوں میں آپ کا گھر پر رونق ہو جائے گا۔ مخمل سوتی اور دوسرے مناسب کپڑوں پر نہایت عمدہ بیل بوٹے نکالنے کے لئے ہماری مشین نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے جو گھنٹوں کا کام منٹوں میں سرانجام دیتی ہے اُس کا ابھرا ہوا کام فی الحقیقت بڑا دلفریب ہوتا ہے یہ مشین آپ کی بچیوں کے لئے ایک نہایت اچھی سہیلی ثابت ہوگی جو انہیں دنوں میں ایسی ہنرمند بنادے گی کہ لوگ حیران ہونگے۔

قیمت مشین و سامان متعلقہ حسب ذیل ہے

مشین درجہ اول جو بے حد مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے مخملی بکس میں بند ہے چار روپے آٹھ آنے درجہ دوم تین روپے یہ مشین بھی اچھی خاصی ہے۔ کپڑا تاننے کا فریم مع ٹلکین قسم اعلیٰ ایک روپیہ آٹھ آنے ریشم کی گچھیاں ایک روپیہ (عہ) فی درجن۔ کپڑے پر چھپے ہوئے نقشے آٹھ آنے فی عدد سب چیزوں کا اکٹھا محصول ڈاک ۸/

اس مکمل سٹ کو سنبھال کر رکھنے کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا پالش شدہ نیار کروایا ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے

ہر مشین کے ہمراہ کام کا نمونہ اور مفصل ترکیب استعمال اردو اور انگریزی میں بھیجی جاتی ہے نقلی مشینیں بازار میں بہت آگئی ہیں اصلی مشین کے لئے آپ صرف ہمارا پتہ یاد رکھیں ہماری فرم کی نسبت محترمہ جناب بنت ممتاز الحق صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس بھوپال فرماتی ہیں "تصدیق کی جاتی ہے کہ ایس احمد صاحب کے یہاں کی کشیدہ کاری کی مشین کارآمد اور پائیدار ہے ہر ایک بہن اس سے مستفید ہو۔ ریشم وغیرہ بھی اس کارخانہ سے اچھا دستیاب ہوا" (اخبار کا حوالہ دینے سے پیکنگ کا خرچ نہیں لگے گا۔

زرنگار مخملی جوتیاں

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر وضعدار سنہرا کام بنا ہوا ہے۔ نفیس مزاج اصحاب اور بیگمات کے لئے تیار کروائی گئی ہیں پہننے میں آرام دہ اور ہلکی۔ دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور داموں کے لحاظ سے گویا مفت ہیں۔ گھروں میں پہننے سلیپروں کا عمدہ بدل ثابت ہونگی۔ کہیں آنے جانے کے وقت پہننے آپ کی زینت دوبالا کریں گی۔ قیمت زنانہ سائز مخمل پر سچے سنہرے کام والی دو روپے چار آنے فی جوڑہ۔ مردانہ سائز مخمل یا چمڑہ پر سنہرا کام دو روپے دس آنے فی جوڑہ سیاؤں کا خاکہ فرمائش کے ساتھ آنا چاہئے (فرمائش میں رسالہ کا حوالہ دینے سے پیکنگ مفت)

ملنے کا پتہ:۔ ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

145

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

مرقع چغتائی اور نقادانِ فن

سٹوڈیو لنڈن :- چغتائی کی تصویریں نظمیں ہیں جو سازِ موسیقی سے آزاد۔ رنگ اور خطوط سے آراستہ شاعری جذبات سے گداز کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ جو کچھ اس وقت تک ان کے متعلق کیا جا چکا ہے وہ اس سے زیادہ روشنی ڈالتی ہیں +

سنڈے ٹائمز } چغتائی اس سے قبل یورپ میں دورِ جدید کی مصوری کا اولین پیش رو اور ایشیائی دورِ احیا کا فصیح ترین مظہر قرار دیا جا چکا ہے +

برٹش ایمپائر ریویو لنڈن } ویمبلے کی نمائش لنڈن میں ایشیائی مصوری میں جدید ترین دورِ احیا کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر سے بہترین نمائندگی کی ہے۔ وہ اپنی تصاویر میں جمالیاتی حسن خطوں اور رنگوں میں نئی نئی ترتیب سے وضع کرتا ہے۔ جو ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے +

موڈرن انڈین آرٹسٹ } چغتائی کی کامیابی کا راز اسکی تصاویر کے سحر میں پنہاں ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ مصور کا تخیل براہِ راست خطوں اور رنگوں میں ملبوس ہو کر بغیر کسی ظاہری کوشش کے ہمارے محسوسات کو بلند کرتا ہے۔ اسکی رباعیات عمر خیام کی بنائی ہوئی تصویریں رباعیات عمر خیام کی ان تصویروں سے جو اس وقت تک پیش کی جا چکی ہیں بلند ترین ہیں مع مغربی مصور ڈیولیک کی تصویروں کے جسکی رباعیات کی تصویروں کو دنیائے عالم کی شہرت حاصل ہے +

سٹیٹسمین امریکہ } چغتائی اور روسی مصور نکلاسک کی تصویریں فن کی خصوصیات اور اسکی خوبیوں کی ترجمان ہیں۔ مگر دونوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ روسی مصور کا کام ایک لکڑہارے کا کام ہے اور چغتائی کی تصاویر ہاتھی دانت کے شاہکار ہیں۔ چغتائی اپنے فن کا بہترین استاد ہے۔ اسکی تصاویر تمثیلی نہیں بلکہ تخیلی ہیں کیونکہ ان کا ہر ایک پہلو مادیت کی آلودگی سے بالکل پاک ہے۔ اسکی تمام تصاویر بجائے خود تکمیل کا نمونہ ہیں۔ انگریزی مصور برن جونز کے مانند اسکی تصاویر پر ایک وجدانی کیفیت اور سکوت آگین فضا طاری ہے۔ اسکی تصاویر کی طرف متوجہ ہونے سے اس فن کے سحر سے مسحور ہو جانا پڑتا ہے کیونکہ اسکے شاہکاروں پر ایک خاص فقدان اور الوہیت طاری ہے۔ اس مشرقی کے سامنے مغربی مصور خام اور بھدے معلوم دینے لگتے ہیں۔ اس کے ایشیائی تخیلات نے ہمارے مطمحِ نظر کو بدل دیا ہے +

مانچسٹر گارڈین لنڈن } چغتائی بنگال سکول کے مصوروں سے الگ اور بالکل مختلف ہے۔ اس میں بنگالی مصوروں کی نسبت رنگوں کا کمال، خیال کی شعریت اور احساسِ حیات بہت زیادہ ہے +

ڈاکٹر جیمز کزنز ہالینڈ } چغتائی کا تعلق ایک ایسے ارمان بھرے گروہ سے ہے جو کبھی کاروانِ حیات سے دل بھر کر مطمئن نہیں ہوتے۔ چغتائی انگریزی شاعر کیٹس کی طرح ہے جس نے مادیت سے بچ کر ایک یونانی دنیا میں پناہ لی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ چغتائی یہ پناہ اپنے آپ میں حاصل کرتا ہے۔ وہ ہمارے درمیان ایک نیا پیغام لے کر آیا ہے۔ ایسا پیغام کہ ہم اس سے ایک غیر فانی سرور حاصل کریں +

وینکاٹاچیلم مدراس } مرقع چغتائی حسن آراستگی اور فنون اور جمالیات کا بہترین مظہر ہے۔ ہمیں یہ تصور نہیں آ سکتا تھا کہ ہم ہندوستان میں ایسی شاندار کتاب کبھی حاصل کر سکیں گے +

ٹائمز آف انڈیا } مرقع چغتائی قدیم اور جدید فنِ طباعت میں ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل ہندوستان نے کسی زبان میں بھی ایسی شاندار کتاب شائع نہیں کی +

مدراس میل } مرقع چغتائی جدید ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ آج تک کسی جدید ہندوستانی مصور کی کتاب اس شان اور معیار سے کبھی طبع نہیں ہوئی +